ایدھی


عبد السّتار

سوانح حیات

کُھلی کتاب

مؤلفہ

تہمینہ درانی



کُھلی کتاب
ایدھی
عبد الستار
سوانح حیات
مؤلفہ
تہمینہ درانی



ابتدا ہی سے یہ بات محسوس ہونے لگی کہ خیرات کے معنی تبدیل ہو رہے ہیں اور بہبود کے نظریئے سے ان کا تعلق ٹوٹ رہا ہے۔ لوگوں کی فلاح کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ سامنے آئی کہ...... بعض لوگ، انسانیت سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ہر چہرے پر ایک ہی ردعمل اور تاثر دکھائی دیا...... کراہت۔ یہ انحراف، پانی کے دھارے کو موڑ دینے کے مترادف تھا۔

ساتھی کارکنوں کو بھی جب اسی کیفیت سے دوچار دیکھا تو شکر ادا کیا کہ...... خدا نے مجھ ناچیز بندے کو کراہت کے احساس سے دور رہنے کا حوصلہ عطا فرمایا ہے۔ عام طور پر رضا کار تیزی سے ہاتھ صاف کرتے اور انہیں بار بار سونگھتے جیسے بدبو، ان کے وجود میں داخل ہو چکی ہو۔ پھر وہ غسل کرنے گھروں کو چل دیتے، اپنے کپڑے جھاڑتے اور انہیں جراثیم سے پاک کرتے۔ بعض اوقات اپنا لباس پھینکتے ہوئے کہتے...... ''تعفن ان میں مستقل طور پر سما چکا ہے۔'' اس طرزِ عمل کے ساتھ کہیں بھی جا کر کام کرنا ممکن نہ تھا۔ دکھوں کا علاج اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ہم ذاتی احساسات سے بلند ہو کر نہ سوچیں...... کراہت، ہمارے راستے کی پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

سماجی خدمت کا آغاز میں نے میٹھادر سے کیا اور سمندر سے ایسی سیاہ اور گلی سڑی لاشیں نکالیں جو صرف ایک بار چھو لینے سے ہی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ انہیں دریاؤں، کنوؤں، سڑکوں، جائے حادثات اور ہسپتالوں سے اٹھایا...... مین ہولوں، گٹروں اور پلوں کے نیچے سے لاشیں اٹھائیں...... ریل گاڑیوں کی بوگیوں، پٹڑیوں اور گندی نالیوں سے بھی میتیں نکال کر لایا...... جنہیں ان کے لواحقین تک فراموش کر بیٹھے تھے اور انتظامیہ بھی انہیں پھینک کر بری الذمہ ہو چکی تھی۔ گردشِ حالات سے مرنے والوں کی متعفن لاشوں کو بھی اسی احساس ذمہ داری اور احترام سے غسل دیا جیسا میری مرحومہ ماں کو دیا گیا تھا...... اپنے گھر میں لا کر انہیں کافور لگایا، کفن پہنائے اور قبریں کھود کر دفنا دیا''۔

ایدھی

عبد الستار

سوانح حیات

کُھلی کتاب

مؤلفہ

تہمینہ درانی

اشاعت .... اول

تاریخ اشاعت .... 23 مارچ 1998ء

اشاعت .... 10 ستمبر 2006

تاریخ ....

اہتمام .... ایدھی فاؤنڈیشن پاکستان

مولفہ .... تہمینہ درانی

صفحات 328

کتاب خریدنے کے خواہش مند اسے درج ذیل پتوں سے حاصل کر سکتے ہیں، فروخت اور رائلٹی سے حاصل ہونے والی رقم ایدھی فاؤنڈیشن کے لئے عطیہ ہو گی اور فلاحی خدمات پر خرچ کی جائے گی۔

ایدھی فاؤنڈیشن ہیڈ آفس: صرافہ بازار، بولٹن مارکیٹ، میٹھادر۔ کراچی

انتساب

دکھی انسانیت اور بے لوث خدمت کرنے والوں کے نام

عبدالستار ایدھی

انسان سے محبت کریں

LOVE HUMAN BEING

Abdul Sattar Edhi

پیش لفظ

اپنے تمام ہموطنوں کو پاکستان کے پچاس سال مکمل ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور "گولڈن جوبلی" کے اس پر مسرت موقع پر اپنی پچاس سالہ سماجی خدمات کے تذکرے کو انتہائی انکساری سے بطور تحفہ نذر کرتا ہوں۔

قومی زبان اردو میں میری سوانح حیات پر مبنی یہ کتاب میری اب تک کی زندگی اور کام کے حوالے سے ایک مکمل دستاویز ہے۔ یہ ایک چلتے پھرتے فقیر کے ان تمام لمحات کی واضح تصویر ہے جنہیں میں نے کبھی کسی سے نہیں چھپایا۔ لوگ طویل عرصہ سے مجھے دکھی انسانیت کی فلاح کی خاطر سڑکوں' گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگتے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے دیئے گئے عطیات کو انہی کی بہبود کے کاموں پر جس طرح صرف کیا' وہ بھی سب پر عیاں ہے۔

نصف صدی پر محیط ان خدمات کی وضاحت ضروری نہیں تاہم پاکستان کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کو اپنے ہمراہ لے کر چلنے کی تمنا کا اظہار' ایک کتابی صورت میں کیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے پکارتا رہا ہوں کہ سماجی خدمت کے اس کام میں سب لوگ میری معاونت کریں تاکہ پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی فلاحی ریاست کا روپ مل سکے۔ خاص طور پر نوجوان طبقے سے میری زیادہ توقعات وابستہ ہیں کہ وہ میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے میدان عمل میں آئیں گے اور گروہی تقسیم سے آلودہ ہوئے بغیر' صرف خدا کی خوشنودی کے لئے سماجی مشن کی تکمیل میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ بس یہی چاہتا ہوں کہ غربت کے اندھیرے دور ہوں اور نہ صرف جیتے جی اجالے دیکھوں' بلکہ میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی لوگ' سماجی خدمت کے لئے میری جلائی ہوئی اس مشعل کو روشن رکھیں۔

اس سے قبل' میری زندگی اور کام کے حوالے سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن ان سے میرے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش رکھنے والوں کی تشنگی دور نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں گذشتہ سال' انگریزی زبان میں میری سوانح حیات " A Mirror To The Blind" کے نام سے چھپ کر قبول خاص و عام حاصل کر چکی ہے لیکن' ہر جانب سے یہ اصرار بڑھتا چلا گیا کہ میری سوانح حیات اور سماجی خدمات سے متعلق ایک مکمل کتاب' آسان قومی زبان اردو میں بھی جلد شائع ہو کر عام آدمی کی دسترس میں آجائے۔ چنانچہ' آج

ان سے کیا گیا وعدہ پورا ہو رہا ہے۔ یہ کتاب ہر پہلو سے میری زندگی اور کام پر محیط ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنے دل کی باتیں' آسان زبان میں بیان کر دوں۔

میری زندگی' ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ جب کبھی کچھ کہنے کا موقع آیا' لگی لپٹی رکھے بغیر سچ کہہ دیا۔ اگرچہ اس طرح زندگی میں ایسے مرحلے بھی آئے کہ سچ کہنے کی پاداش میں زخم بھی ملے اور راہوں میں کانٹے بھی بکھیرے گئے پر اپنا راستہ کبھی نہ بدلا۔ اپنے کام سے کام رکھااور عاجزی کو ہمیشہ شعار بنایا۔ پیدا کرنے والے سے پہلی اور آخری التجا یہی رہی کہ وہ مجھے غرور و تکبر سے بچائے۔ سیاسی آلودگی سے بھی اسی لئے دور بھاگتا رہا کہ غریبوں سے قریب تر رہ سکوں۔ دنیا بھر کے دکھی' بیمار' لاوارث' معذور اور مسکین انسان ہر وقت امداد کے لئے پکارتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ بروقت ان کی خدمت میں پہنچیں۔ یہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے جس کا تذکرہ کتابی صورت میں اب آپ کے سامنے ہے۔

اس کٹھن کام میں میرے ساتھی ڈاکٹر ارشد اویس قاضی نے لمحہ بہ لمحہ' بھرپور ساتھ دیا ہے اور میری دعاؤں کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

میں اگرچہ گجراتی زبان میں لکھنا پڑھنا جانتا ہوں لیکن انگریزی و اردو میں لکھنے کے لئے تمام حالات و واقعات 40 آڈیو کیسٹوں میں بیان کر کے ریکارڈ کرائے جنہیں تہمینہ درانی نے ترتیب دے کر انگریزی میں منتقل کیا اور بعد ازاں اردو کے قالب میں ڈھالا گیا' جبکہ مسودے پر نظر ثانی کا بیشتر کام میرے بیٹے فیصل ایدھی نے کیا ہے۔

اس کتاب کے تمام قارئین سے یہی استدعا ہے کہ دکھی انسانیت کی خدمت کے اس کام میں میرے ہمراہ چلیں تاکہ فلاح کی منزل جلد ہمارا مقدر بن جائے۔

عبدالستار ایدھی
(میٹھادر۔ کراچی' پاکستان)
14 اگست 1998ء

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(l)

باب اول

چھوٹی سی تربت

وہ ایک انوکھا آغاز تھا۔ دن کی ابتدا ٹیلیفون کی ہنگامی گھنٹیوں سے ہوئی مگر اب ..... ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کے شور نے ہر آواز کو دبا دیا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں کھچاؤ محسوس ہوا اور بے چینی سے میرا وجود تناؤ کا شکار ہوگیا۔ میں نے اپنی حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھ لی اور ہیلی کاپٹر کے اڑنے کا انتظار کرنے لگا۔

سال 1992ء اور جولائی کی 9 ویں تاریخ۔۔۔ صبح کے تین بجے راولپنڈی سے رواں دواں ایک مسافر ریل گاڑی گھوٹکی کے ریلوے سٹیشن پر جڑانوالہ سے آنے والی ایک مال بردار ٹرین سے ٹکرا گئی۔ قریب قریب سو بدنصیب افراد کے مرنے اور زخمی ہونے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ ایدھی ہیڈکوارٹرز کا عملہ نیند سے بیدار ہوکر حرکت میں آچکا تھا۔ ان کے کام کی رفتار' وقت کی ضرورت سے کہیں تیز تھی۔

مصائب کی یلغار کے باوجود اپنے حواس قائم رکھنا میری عادت ہے۔ لہٰذا کسی بھی دکھ اور مصیبت میں اپنے آپ کو دھکیلنے کے لئے مجھے کوئی زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ میں اس طرح کام کرتا ہوں جیسے ایک مردہ' انسانی درد کو مزید سمجھ کر پھر سے زندہ ہوا ہے۔ اس وقت مجھے نہ سردی کا احساس ہوتا ہے' نہ ہی گرمی' نہ خوف اور نہ ہی تھکن محسوس ہوتی ہے۔ اپنی ذات سے بیگانہ' کام میں ڈوبا ہوا' خود اپنے وجود اور نام کے احساس سے ناآشنا۔۔۔ پر آج صبح ایسا نہیں تھا۔ کوئی چیز مجھے ان بے ہنگم آوازوں کے شور سے بیگانہ کر رہی تھی۔

ہیڈکوارٹر سے ہدایات دی جا رہی تھیں ..... معلومات حاصل کی جا رہی تھیں ..... وائرلیس پر گڈمڈ باتوں کا کہرام ..... ہر آواز دوسری آواز کو دبا رہی تھی ..... یہ ہنگامہ جو میری زندگی کا معمول ہے' آج مجھے کچھ پریشان کر رہا تھا۔ ہر چیز نئی لگ رہی تھی۔ میرا دل آج کہیں اور تھا۔ میرے اندر کی یہ تبدیلی ہر لمحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں ایک فرق محسوس

کہیں اور تھا۔ میرے اندر کی یہ تبدیلی ہر لمحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں ایک فرق محسوس کر رہا تھا۔ کام کی جلدی کے باوجود میں تیز نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے ...... وہ میرے پاؤں تھے ہی نہیں لیکن ...... میرے دل پر جیسے کوئی انجانا بوجھ آن پڑا تھا ...... مگر کیا ......؟

جو قیامت برپا تھی ...... اس کا سامنا کرنے کے لئے ہر شخص میٹھادر میں چوکس کھڑا تھا۔ میرے تیار ہونے سے پہلے نرسیں' ڈاکٹرز' دوائیاں' ایمبولینس گاڑیاں' تابوت اور دوسرا سامان گھوٹکی کے لئے روانہ کر دیا گیا تھا------ لیکن ...... آج کا دن اور دنوں سے مختلف کیوں تھا؟ اس قدر مختلف کہ میں جب میٹھادر سے ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہوا تو بلقیس نے حیرانی سے پوچھا---

"لگ رہا ہے' آج آپ جانا نہیں چاہ رہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ......؟"

میرے قدم دروازے پر رک گئے۔ بلقیس کا سوال عجیب سا لگا۔ میں نے سوچا کہ اس نے میرے رویئے میں کیا تبدیلی محسوس کی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بیماری نے بھی مجھے کبھی کام کرنے سے نہیں روکا۔ پھر یہ کیا تھا ...... شاید آج میں اپنے آپ میں گم تھا ...... لیکن کیوں؟ یہ نئی تبدیلی مجھ میں کیسے آئی--- کیا انسانی دکھوں کے لئے میرا جذبہ دھندلا گیا تھا؟ کیا میں اپنی زندگی کے واحد مقصد سے بھاگ رہا تھا؟ نہیں' یہ بات نہیں تھی۔ مگر پھر کیا بات تھی ......!

دو گھنٹے کا یہ طویل ہوائی سفر ایک نہ ختم ہونے والا سفر لگ رہا تھا ...... منتشر خیالات کی یلغار ......وقت جیسے تھم سا گیا تھا اور ہیلی کاپٹر میں پہلے سے موجود خاموشی اور بڑھ گئی تھی۔ ہم سکھر کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ میں نیچے حد نظر تک سپاٹ اور بنجر زمین کو دیکھ رہا تھا اور آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اچانک پائلٹ کو وائرلیس پر ایک پیغام موصول ہوا جسے میں نہ سن سکا' پائلٹ نے اونچی آواز میں پوچھا۔ "مولانا! کیا آپ کا نواسہ ہسپتال میں ہے؟" ...... میں کانپ اٹھا۔ اس کی طرف مڑتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "کیوں؟" اس نے بڑے دکھ سے کہا کہ "مولانا' وہ فوت ہو چکا ہے"۔

ہیلی کاپٹر میں موجود لوگوں سمیت میں نے اپنے نواسے کے لئے دعا کی اور ہم سب نے

ایک ساتھ بلند آواز میں "انا للہ و انا الیہ راجعون" کہا۔ ہم گھوٹکی سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھے۔ پائلٹ نے واپس مڑنے کا مشورہ دیا۔ "نہیں نہیں" میں نے کہا۔ "اب بہت دیر ہو چکی۔ ہمیں خاصا کام کرنا ہے۔ بلقیس کو بتائیں کہ وہ اس کی تدفین کا انتظام کرے اور میرا انتظار نہ کرے"۔ کتنے ہی قریبی اور دیرینہ تعلقات ہوں' میں نے سٹاف کو اپنے ذاتی معاملات میں کبھی نہ الجھایا۔ میرے نواسے کے ہسپتال میں داخل ہونے کے بارے میں کسی کو بھی علم نہ تھا ...... غالباً" اسی وجہ سے پائلٹ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

میرے نواسے کی موت کی خبر نے مجھے اتنا صدمہ پہنچایا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ زندگی میں' میں نے بہت حادثے دیکھے' کبھی بھی اندر سے اپنے آپ کو اتنا خالی خالی محسوس نہ کیا۔

میں پچھلی تقریباً نصف صدی سے شب و روز اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ گزرتے ہوئے ہر لمحے نے مجھے مایوس اور زندگی کی نعمتوں سے محروم نچلے طبقے کے قریب کیا۔ اب میں ایک تھکن سی محسوس کر رہا تھا' جیسے مجھے کبھی آرام نصیب نہ ہوا ہو۔ میرا کام' میری زندگی پر حاوی ہو چکا تھا ...... بلال' میرا نواسہ' ایک ایسے وقت میں آیا جب میری زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ میری بیوی نے حتی الامکان کوشش کی کہ وہ کام سے کچھ وقت نکال کر بچوں کو دے سکے لیکن اس کی ممتا کی تسکین کے لئے وہ وقت بھی ناکافی رہا اور ہمارے اپنے بچے' نانی کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

ہماری بائیس سالہ بیٹی کبریٰ اپنے خاوند سے علیحدگی کے بعد گھر آئی تو اس کا دوسرا بیٹا' بلال پیدا ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمارے لئے ہی آیا ہو۔ اس نے میری شخصیت کا وہ حصہ ڈھونڈ لیا جو شاید میں خود بھی کھو چکا تھا۔ میں نے اپنے دل کا ایک حصہ اس کے لئے وقف کر دیا لیکن اسے اکثر یہ یاد بھی دلاتا کہ بیٹا میں یہ لمحے تمہیں عارضی طور پر دے رہا ہوں' ضرورت پڑی تو میں انہیں تم سے واپس لے لوں گا---- لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ اصل میں وہ اپنا وقت مجھے ادھار دے رہا تھا----!

اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے یاد آتے ہیں تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔

وہ میرے ساتھ صبح سویرے ہی اٹھ کھڑا ہوتا' ناشتہ کرتا اور پھر میرے ساتھ مل کر میری باسی روٹی کھاتا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی سوال کرتا---

"نانا۔۔ آپ یہ باسی روٹی کیوں کھاتے ہیں۔ کیا آپ کو تازہ روٹی نہیں ملتی؟"

اور میں ہمیشہ اسے یہ سمجھاتا کہ اس طرح خود کو بھوکوں کی یاد دلاتا ہوں ..... یہی میرا کام ہے۔۔۔"

میں نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے غم کو چھپانے کے لئے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

عیدالاضحیٰ کے چاند کے نظر آتے ہی تمام ایدھی فلاحی مراکز نے ہزاروں ذہنی مریضوں' اپاہجوں اور زندگی کی مسرتوں سے محروم لوگوں کے لئے خوشیوں کا سامان کر رکھا تھا۔ اس حوالے سے خواتین کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ لڑکیاں اپنے ہاتھوں پر مہندی رچا رہی تھیں۔ دوپٹوں پر روپہلا گوٹہ لگ رہا تھا۔ مٹھائیوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ سویاں تیار ہو رہی تھیں اور تحائف کو لپیٹا جا رہا تھا۔ پرمسرت لمحات نے وقتی طور پر محرومی کا احساس ختم کر دیا تھا۔ شہر کے مختلف حصوں سے کھانے کی دیگیں پک۔ کر آ رہی تھیں اور ہر کوئی پرمسرت صبح کے انتظار میں تھا۔ یہ خوشیاں ان محروم لوگوں ؛ی زندگیوں میں بہت چھوٹی اور لمحاتی تھیں لیکن وہ عام لوگوں سے زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔

بلال' "کلفٹن سینٹر برائے خواتین" میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔۔ جانے سے پہلے اس نے بڑے چاؤ کے ساتھ نئے کپڑے مجھے دکھائے اور "اصوم لہجے میں کہا۔۔۔

"نانا" ۔۔ کل میں یہ پہنوں گا ۔۔ اب یہ پہنوں گا ۔۔ پھر وہ پہنوں گا"۔

گویا وہ ایک ہی وقت میں سب کچھ پہن لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔۔

"بلال۔۔! کیا تم جانتے ہو کہ بہت سے لوگوں کے پاس تو پہننے کے لئے کچھ بھی نہیں"۔

میری بات سن ان سنی کر کے وہ بھاگ کر پھر اپنے کپڑوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور بھولپن سے کہنے لگا۔۔۔

"لیکن میرے پاس تو بہت سے ہیں"۔

بلقیس اس کی اس بات پر ہنس کر کہنے لگی۔۔۔

"آج کا دن ہی ایسا ہے کہ وہ آپ کی کچھ نہیں سنے گا"۔

عید کی صبح میں اپنے دفتر میں تھا جب میں نے سنا کہ کبریٰ نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں ایمبولینس طلب کی ہے۔ ہسپتال جانے کی بجائے وہ سیدھی میٹھادر آئی۔ کبریٰ واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے بے حد بدحواس تھی' بلال کی حالت ہی ایسی تھی کہ بوکھلاہٹ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ....

وہ بری طرح جل چکا تھا ....!

کوئی لفظ بھی بلال کے کرب کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں اظہار کی اس بے بسی کے باوجود اپنی روح کی گہرائیوں میں اس کے جسم کی تپش محسوس کر رہا تھا۔ وہ درد اور جلن کی شدت سے اپنی ماں کے بے بس بازوؤں میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کوئی مداوا' کوئی مسیحا اور جینے کی ہر آس۔۔۔ سب کچھ ایک خواب نظر آ رہا تھا۔ بلقیس جب تک اپنی امی کے گھر سے واپس آئیں' کبریٰ ہسپتال جا چکی تھی ۔۔ میں دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہ جا سکا ۔۔ میں نے بلقیس سے معذرت کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اگرچہ میری آنکھیں ہر قسم کے گھاؤ کو دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں لیکن میں بلال کے جھلسے ہوئے بدن پر پھاہا رکھنے کا دلخراش منظر نہ دیکھ سکوں گا۔

اب ہم گھوٹکی کی اس فضا میں سفر کر رہے تھے جس کی اتھاہ میں دو ریل گاڑیوں کے دلدوز تصادم سے زندگی آگ' دھوئیں اور خون میں لت پت ہو گئی تھی۔ ہم اس جانکاہ سانحہ کے عین بیچ جب نیچے اترے تو ایسے لگا جیسے سامنے ایک مقتل ہو۔ ایمبولینس گاڑیاں' ہولناک سائرن' زخمیوں اور لاشوں کو اٹھائے جانے کے لئے سٹریچر بردار کارندے ادھر ادھر سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ انتظامیہ کے لوگ' پولیس' ڈاکٹر اور دائیں بائیں بے ترتیب قطاروں میں خاموش کھڑے ہوئے ساکت لوگ ۔۔ عملی طور پر کچھ کرنے کی بجائے سکے بکے۔۔۔۔ حادثے میں شکار ہونے والے لوگوں کو بے معنی پرسا دے رہے تھے۔ ایک ہنگامہ تھا ۔۔ شور اور قیامت صغریٰ کا منظر۔۔۔۔!

ہنگامی حالت میں ایک ہی شخص کو ساری صورت حال کا نگران ہونا چاہیے کیونکہ بہت سارے لوگ افراتفری میں بحران پیدا کرنے کا باعث ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں امدادی کاموں کو جلدازجلد منطقی نتائج تک اسی طرح پہنچایا ہے۔ دائیں بائیں بکھری ہوئی لاشوں اور لہو کی باڑھ سے گزرتے ہوئے میں نے اپنی آستینیں اوپر کر لیں اور

پائجامہ گھٹنوں تک چڑھا لیا۔ اپنے پیاروں سے بچھڑنے والی آوازوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔۔۔

"ایدھی صاحب! میرا بچہ کدھر گیا؟ اگر آپ نے میرے باپ کو ہسپتال نہ پہنچایا تو وہ مر جائے گا۔ ایدھی صاحب' خدا کا شکر ہے' آپ آگئے ہیں۔ پولیس کہتی ہے' میرا بچہ مرگیا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے ۔۔۔ وہ زندہ ہے۔۔۔۔۔۔" آوازیں ہی آوازیں۔ "میرے بچے کہاں گئے ۔۔ میری ماں کہاں ہے ۔۔۔ میرا بھائی کہاں گیا ۔۔؟ مدد' مدد۔ ایدھی صاحب خدا کے لئے کچھ کریں۔۔۔۔۔" لوگ اپنے لواحقین کے بارے میں مجھ سے ایسے پوچھ رہے تھے جیسے میں اس سانحہ کا ذمہ دار ہوں۔ ایسے عالم میں بھی مجھے بلال کی یاد آ رہی تھی جسے دو ماہ پہلے میں نے ایسی ہی دردناک حالت میں دیکھا تھا اور ہم سب اسی خوف سے دوچار ہوئے تھے ۔۔۔میں نے سوچا ۔۔ بلال کو غسل میت کے بعد ایک چھوٹی سی تربت میں ڈھیروں مٹی کے بوجھ تلے دفنایا جاچکا ہوگا ۔۔۔

میں نے خواب و خیال کی اس جنگاہ میں کام شروع کر دیا۔ مرنے والوں کی متروکہ اشیاء کو یکجا کیا۔ گھڑیاں' کپڑے' رخت سفر' شناختی کارڈ۔۔۔ میں نے حادثے کی جگہ پر بن جانے والے نئے نئے تربت نما ڈھیروں سے' لاشوں کے پرخچے اجتماعی بے نام قبروں میں دفنانے کے انتظامات شروع کر دیئے اور زخمیوں کو نزدیک کے ہسپتالوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا ۔۔ شدید زخمی مسافروں کو طبی امداد کے لئے بذریعہ ایئر ایمبولینس کراچی بھجوانے کی ہدایات دیں۔ سکھر ہسپتال کے نزدیک مختلف نوعیت کے خیمے لگا دیئے گئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں نے زخمی عورتوں کے گھاؤ سیئے۔ ان کی مرہم پٹی کی اور جو مرگئی تھیں' انہیں کفنایا گیا۔ ان کا بچا کھچا سامان میتوں کے ساتھ رکھ دیا گیا تاکہ وہ ان کے لواحقین تک پہنچ سکے۔ ڈیوٹی پر موجود نرس لوگوں کے نقصانات کی شدت دیکھ کر بدحواس ہو چکی تھی ۔۔۔ میں نے دیکھا کہ ایک گھبرایا ہوا نوجوان اس نرس کے پاس آیا اور پوچھا کہ میں نے اپنا باپ تو پالیا ہے لیکن میری ماں کون ہے؟ نرس یہ سن کر گھبرا گئی اور اس نے اس نوجوان کے ساتھ خود بھی رونا شروع کر دیا۔ میں نے نرس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا ۔۔۔

"بی بی تم انتظامیہ کی ایک رکن ہو۔ تم بھی گھبرا گئیں تو کام کون کرے گا؟ اپنے آپ کو سنبھالو اور ضبط سے کام لو"۔

۔۔۔ صرف یہی وقت تھا جب بلقیس میری مدد کو موجود نہ تھی ۔۔ میں اس کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ وہی تھی جو میرے دکھ سکھ میں شریک تھی لیکن آج وہ ہمیشہ کی طرح میری معاون نہیں تھی۔۔۔۔۔ بلقیس کا دل میرے اور بلال' دونوں کے لئے دھڑکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس روز گھر سے چلتے وقت میرے پاؤں کیوں لڑکھڑائے تھے۔ بلقیس قلبی طور پر میرے بھی اتنے ہی قریب تھی جتنی اپنے نواسے بلال کے ۔۔۔ وہ بلال سے چھپن چھپائی اور پکڑن پکڑائی کھیلتی تو میں بے حد لطف اندوز ہوتا۔ کبھی وہ اسے جل دینے کے لئے بستر میں ۔۔۔ کبھی میز کے نیچے اور کبھی دروازے کے پیچھے چھپ جاتی اور جب پکڑی جاتی تو پھر پورے کمرے میں بلقیس آگے اور بلال پیچھے ۔۔۔ وہ طرح طرح کے نام لے کر اور بہانے بنا' بنا کر اسے کھانا کھلاتی۔

"لو منہ کھولو۔ یہ کبریٰ کے لئے۔۔۔۔ یہ قطب کے لئے۔۔۔ اور اب یہ لقمہ فیصل کے لئے کھاؤ۔۔ اچھا اب ایک اور الماس کے لئے"۔

اور جب میں اسے چھیڑتے ہوئے کہتا۔۔۔

"تم یہ سب کچھ کرتے ہوئے بچہ لگ رہی ہو۔"

تو بلقیس جواب دیتی ۔۔۔

"ہاں۔۔۔۔۔ میں بھی تو ایک ماں ہوں۔ کیا میں اپنے بچے کے ساتھ بچہ نہیں بن سکتی؟"

بعض اوقات وہ سانس بھر کر شکوہ کرتی۔۔۔

"مجھے آج تک یہی تو ایک کھلونا ملا ہے۔۔۔"

جب وہ اس کا معصوم سا ہاتھ پکڑے اپنے گھر سے لے کر ہمارے میٹھادر کے دفتر تک تنگ راستوں پر اسے چلا کر لاتی تو یہ منظر دیکھ کر میرے سارے دکھ دور ہو جاتے اور میرا دل خوشی سے کھل اٹھتا۔ اپنی نانی کی طرح بلال بھی مسکرانے اور خوش رہنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ ہی لیتا۔

گھوٹکی' لوہے کی پنسڑی کے گردونواح میں ایک مقتل نظر آتا تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر خون کے عطیات کی اپیلیں کی جا رہی تھیں۔ حادثے کی اطلاع پانے کے بعد لوگ اپنے اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کی میتیں تلاش کر رہے تھے۔ اس سارے کام کے لئے ایدھی

سینٹرز کی 75 گاڑیاں مامور تھیں۔

میں نے دیکھا کہ اس کربناک حالت میں بھی ایک زوال پذیر معاشرہ اپنا منفی کردار ادا کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک نوجوان نے ایک لاش کو لینے کا دعویٰ کیا۔ گویا وہ اپنے طور پر میت پہچان چکا تھا۔ اس نے مالی اعانت کے لئے درخواست فارم پر کیا۔ حکام سے رقم بٹوری اور ایدھی ایمبولینس اسے اور میت کو لے کر نزدیکی گاؤں کو چل دی لیکن گاؤں والوں نے میت کی شناخت سے انکار کر دیا کیونکہ اس کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا ـــ نوجوان یہ دیکھ کر چپکے سے کھسک گیا اور گاڑی میت کو لے کر گھوٹکی واپس آگئی۔

مجھے یاد آ رہا تھا ـــ آج سے دو ماہ قبل بلقیس اور کبریٰ کو سول ہسپتال میں ایسی ہی حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا جب ڈیوٹی پر مامور ایک نرس نے بلال کی سنگین حالت دیکھنے کے باوجود بڑے دھڑلے سے کہہ دیا کہ سپیشلسٹ ڈاکٹر عید کی چھٹیوں کے باعث تین روز تک یہاں نہیں ہوں گے۔ دوائیوں اور دیگر طبی سامان سے متعلق الماری مقفل ہے جس میں مرہم پٹی کا سامان دھرا ہے۔ چابیاں نہیں ہیں لہٰذا مریض کو جناح ہسپتال لے جائیں۔ افراتفری اور مایوسی کے اس عالم میں بلال کو جناح ہسپتال کے ہنگامی وارڈ میں داخل کرا دیا گیا اور کبریٰ کو ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی لیکن بلال کی درد اور جلن بھری چیخوں اور کچی جلد پر مرہم کی سوزش نے کبریٰ کو قریب قریب بے بس کر دیا اور وہ ناچار بلقیس کے بازوؤں میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔ جب چھت کے پنکھے کی ہوا اس کے جلے ہوئے جسم کو چھوتی تو بھی ـــ اور جب ہوا بند ہو جاتی ـــ بلال کو اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کے وجود سے رستے ہوئے پیپ بھرے پانی کے باعث متعدد بار بھیگی چادریں تبدیل کرنا پڑیں۔ بلقیس اور کبریٰ کو آخرکار بتایا گیا کہ وہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں بچے کو لے جائیں کیونکہ کوئی سپیشلسٹ عید سے پہلے نہیں آئے گا۔ بلقیس نے ان کی اس سردمہری پر احتجاج کیا لیکن بے سود ــــ "ہم کیا کر سکتے ہیں" ـــ کا کورا جواب بلقیس اور کبریٰ کو ایک پرائیویٹ ہسپتال تک لے گیا جہاں انہیں دوبارہ کہا گیا کہ سپیشلسٹ تو عید کے بعد ہی آ سکے گا۔ ہم نے تمام راستے بند دیکھ کر بیس ہزار روپے ہسپتال میں جمع کرا دیئے۔ تب کہیں جا کے بلال کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا جہاں اسے قدرے سکون ملا ـــ اور وہ سو گیا۔

گھوٹکی سانحہ میں ایک ہی خاندان کے 9 افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔ جب میتیں کوٹری

کے لئے روانہ کی جا رہی تھیں تو میں غم و الم کی اس گہرائی کو اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ میرا دل ان لوگوں کے لئے نڈھال تھا جو ان بے سدھ لاشوں کا استقبال کریں گے۔ بہت ساری میتوں کا کوئی دعویدار فوری طور پر سامنے نہ آسکا لہٰذا انہیں بطور امانت دفن کر دیا گیا تاکہ بعدازاں کسی ممکنہ شناخت پر متعلقین انہیں اپنے آبائی قبرستانوں میں لے جا کر دفنا سکیں اور کچھ لاشیں مردہ خانوں میں رکھ دی گئیں۔ جو لوگ حادثے میں زندہ بچ گئے تھے' ان میں سے اکثر ملک کے دور دراز اور پسماندہ علاقوں سے روزگار کی تلاش میں نکلے تھے' اپنے گھر والوں کی نظر میں وہ کئی دنوں' ہفتوں اور مہینوں تک زندہ تصور کئے جا سکتے تھے ـــ انہیں تسلی تشفی اور امدادی رقوم دے کر گھروں کے لئے رخصت کر دیا گیا۔ باقی لوگ مسافر گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو گئے۔

میرے خیالات نے بلال کی طرف پھر پلٹا کھایا جہاں عید کے بعد کسی ماہر ڈاکٹر نے آنا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق بلال کے زخموں کی حالت کسی حد تک تشویشناک تھی ـــ روزانہ کی مرہم پٹی نے بلال کی کچی جلد کو پھاڑ دیا تھا جبکہ کبریٰ مسلسل اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ وہ اپنے رب کی شکرگزار تھی کہ بلال اتنے بڑے سانحہ کے باوجود ابھی تک زندہ ہے ـــ اس نے اپنے بچے سے محرومی کے تصور کو اپنے دل سے نکال دیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے بلال کو دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن کس طرح بند ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔ مجھے اس بات کا تجربہ ہے کہ ایسی حالت میں دنیا کا بہترین ہسپتال بھی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بلال کا جسم اتنی گہرائی تک جھلس گیا تھا کہ اس کی رگوں میں خون تک جم چکا تھا۔ تشنج اور جسم میں جراثیم کے زہر کا پھیل جانا ناگزیر تھا۔

انسانی زندگی کی تباہی کا باعث بننے والی قاتل ریل گاڑیاں اب خود پارہ پارہ میتوں کی طرح دور دور تک بکھری پڑی تھیں جن سے بودار اور سیاہ دھواں انسانی خون کی مانند گردونواح میں پھیل چکا تھا۔ سانحہ کے بارے میں کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ تخریب کاری ہے۔ کچھ نے الزام لگایا کہ ریلوے عملہ کی غفلت اس حادثہ کا سبب بنی۔ ایک خیال یہ تھا کہ ڈرائیور کو اس ٹریک پر چلتے رہنے کا گرین سگنل دیا گیا جس پر مال گاڑی کو آنا تھا۔ اگرچہ ڈرائیور نے اس المناک تصادم سے بچنے کے لئے ایمرجنسی بریک لگانے کی کوشش کی

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی ..... پھر ایک زوردار دھماکے نے سارے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔

اب گھوٹکی کا ماحول انسانی گوشت کی عفونت اور سڑاند سے بوجھل ہوچکا تھا۔ مرنے والے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں تاہم لوگ پھر بھی رسمی حربوں سے انھیں دفنانے میں تاخیر کرا دیتے ہیں حالانکہ اسلامی فقہ میتوں کو جلدازجلد سپرد خاک کرنے کی تلقین کرتی ہے' لیکن لوگ عموماً اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں۔

سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ زمین پر بپا ہونے والی قیامت صغریٰ کا نظارہ کرتا ..... سارا دن ہمارے سروں پر چمکتا رہا۔ حتیٰ کہ جب غروب ہوا تو بھی گھوٹکی کی فضا میں آبلہ خیز گرمی سے دم گھٹ رہا تھا۔ دن گزر چکا تھا۔ میتیں اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچائی جاچکی تھیں۔ کام ختم ہو چکا تھا۔ تھکان سے رگوں میں منجمد اور خشک ہونے والے خون کے باعث میرے پاؤں اکڑ گئے تھے۔ میں اب ایک دلسوز سانحہ کے بعد مرتب ہونے والے ہولناک نتائج کی کیفیت سے دوچار تھا' تنہا' غم زدہ اور اداس------- میں ایک مقام پر خاموش کھڑا ہوگیا۔

اچانک ایک بوڑھے غم زدہ شخص نے مجھے چیخ کر پکارا-----

"ادھی بابا..... میرا ایک ہی بچہ تھا جو مجھ سے چھن گیا ..... میں تباہ ہوگیا ہوں ..... کوئی نہیں جو میری مدد کرے۔ میں تنہا ہوں"۔

ادھورے اور ناقص الاعضاء بچے کی طرح وہ ایسے لگتا تھا کہ اس کا سر اس کی ٹانگوں میں پھنس کر رہ گیا ہو۔ اس کا جسم بے تحاشا چیخوں کے باعث کانپ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کا شریک غم ہوں۔ میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا-----

"بابا! میں تمہارے دکھ کو جانتا ہوں--- سب لوگ تمہارے دکھ سے واقف ہیں۔ موت سے پہلے' غم سے نجات ممکن نہیں ..... اسے بہر حال سہنا ہی ہو گا۔

صدر مملکت' وزیراعظم' منتخب عوامی نمائندوں اور سرکاری اداروں نے اس سانحہ پر ہمدردانہ بیانات جاری کئے اور امدادی رقوم کا اعلان کیا۔ پاکستان ریلوے کے جنرل مینجر کو اس واقعہ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے معطل کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا عظیم اور ناقابل تلافی نقصان تھا جسے تنہا' بے گناہ اور معصوم لوگوں کو ہی برداشت کرنا تھا۔ میں یہ سوچ کر اچانک

مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑا۔ ہم نے اپنی حفاظتی پیٹیاں باندھ لیں اور جہاز کی اڑان کا انتظار کرنے لگے۔ میں ان تمام لوگوں کی طرح اپنے گھر کی طرف محوپرواز تھا جو حادثے والے روز میرے شریک کار تھے ..... میرے لئے مشکل تھا کہ نظروں سے اوجھل ہونے والے پیارے نواسے کی جدائی کا دکھ برداشت کرلوں .....میں نے خود پر جبر کرکے اپنی ماں کی موت کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی لیکن اب بلال کی موت نے ان تمام دکھوں کو یکجا کر دیا جن کا اب مجھے سامنا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے ..... اندر ہی اندر' میں ابلتے آنسوؤں کو پی رہا تھا۔

ہسپتال میں دو ماہ کے اذیت ناک قیام کے آخری دنوں میں بلال نے بہتر ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ٹانگوں اور سینے پر توانا جلد چڑھنے لگی تھی لیکن اس کے پیٹ اور ران کا درمیانی حصہ ابھی کچا تھا۔ بلال نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر رکھا تھا۔ کھانے پینے کے معاملے میں وہ بہت پرجوش تھا۔ اس نے اپنی بیماری کے دوران کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ اسے بھوک نہیں لگتی۔ منگواتا سب کچھ تھا ..... کھاتا کچھ نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ میری عدم موجودگی میں مجھے بہت یاد کرتا تھا' لیکن میری طویل غیرحاضری کا کبھی شکوہ بھی نہیں کیا۔

میری مصروفیات کو دیکھتے ہوئے وہ سوچتا ہوگا---

"نانا اب لوگوں کی دیکھ بھال کر رہے ہوں گے ..... اور اب وہ سڑک پر کھڑے ہوکر امدادی کاموں کے لئے لوگوں سے خیرات مانگ رہے ہوں گے-----"

جب کبھی کوئی اسے پیسے دیتا تو وہ بڑی بے تابی اور شوق کے ساتھ گنا کرتا۔ میں جب اسے کچھ روپے دیتا تو سمجھاتا ---

"بیٹا---- یہ پیسے ہمارے نہیں ہیں بلکہ غریبوں کو دینے کے لئے ہیں---"

یہ سن کر وہ کسی بھکاری کی مدد کے لئے بھاگ کھڑا ہوتا۔ حاجت مند کی دکھ بھری بات سنتا اور سب کچھ اسے دے کر پھر میرے پاس اور پیسے لینے کے لئے آدھمکتا۔ میں پوچھتا

"بلال بیٹے! کیا تم نے مانگنے والے فقیر کی کہانی سن کر اسے سچ جان لیا تھا؟"

بلال جواب دیتا ---

"نانا! ابھی تو اس غریب کو اور بھی پیسوں کی ضرورت ہے"۔

میں وقت نکال کر ہسپتال میں اسے ملنے جاتا اور جب جدا ہونے کا وقت آتا تو وہ مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیتا ـــ اس وقت اپنے جذبات پر قابو پانے میں مجھے بڑی مشکل پیش آتی ـــ میں کبھی اپنے آپ کو اس کی چارپائی کے قریب لے جاتا اور پھر انہی قدموں گھبرا کر واپس بھی آجاتا ـــ میں اسے پیار کرتا اور زندہ رہنے کا حوصلہ دینا چاہتا تھا۔ اسے اپنے بازوؤں میں لینے کے لئے میں ہر وقت بے تاب رہتا ـــ نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا، لیکن مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک معصوم چراغ، تند و تیز آندھی کے سامنے، اکیلا ہے۔ یہ چراغ کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے ـــ یہ سوچ کر میں بے بسی کے عالم میں، دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لیتا۔

ایک دن جب میں ہسپتال میں بلال کے بستر کے قریب کھڑا واپسی کے ارادے سے اسے الوداع کہہ رہا تھا تو اچانک بلال کی دردناک چیخوں نے میرے قدم روک لئے۔

"زرل نے مجھے جلا دیا ـــ وہ مجھے مسلسل جلاتی رہی"۔

میں نے اسے تسلی دی۔ حتیٰ کہ کبریٰ نے بھی کہا ـــ

"خدا اسے معاف کرے ـــ وہ ذہنی مریضہ ہے۔ تم بھی اسے معاف کر دو"۔

زرل ایک پریشاں حال جوان عورت تھی جسے ہم نے ایدھی ہوم میں بحالی کے نظریئے سے کام کاج پر لگا رکھا تھا۔ کبریٰ نے کئی مرتبہ بلقیس سے ذکر کیا۔ "زرل ست اور کام چور ہے۔ وہ میلے، غلیظ کپڑے چارپائی کے نیچے چھپا دیتی ہے اور جو کام بھی اسے سونپا جاتا ہے اسے جان بوجھ کر ٹال دیتی ہے۔ وہ ہر وقت لگائی بجھائی اور سازشوں میں مصروف رہتی ہے ـــ" زرل ادارے کے انتظامی امور میں خلل ڈالتی اور ادارے میں نظم و ضبط کے حوالے سے اٹھائے جانے والے ہر قدم پر اعتراض کرتی تھی۔

عید کی صبح زرل نے بلال کو نہلانے کی پیشکش کی۔ وہ اسے غسل خانے میں لے گئی اور دروازہ بند کر کے اچانک اس پر گرم پانی انڈیل دیا۔ بلال نے اس آفت ناگہانی سے بچ نکلنا چاہا لیکن زرل نے ابلتا پانی اس پر پھینک دیا۔ بلال کی آہ و بکا کے باوجود زرل مسلسل کھولتا پانی اس کے بدن پر انڈیلتی رہی۔ اس سے پہلے کہ کبریٰ، بلال کی دلدوز چیخیں سن کر کوئی مداوا کرتی، زرل اپنا کام کر چکی تھی ـــ جب زرل سے اس حرکت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا ـــ

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ پانی اس قدر گرم ہے ......"

میں زرل کی اس احمقانہ وضاحت یا اس کی نیت کے فتور کو نہ بھانپ سکا ـــ ا ر چار و ناچار زرل کو ایک وحشت زدہ مریضہ جان کر ایدھی کے بفر زون سینٹر میں بغرض علاج بھیج دیا۔

بلقیس اپنے گھر میں تھی جب اسے بلال کے بارے میں اطلاع ملی۔ اس نے ہسپتال جا کر دیکھا کہ بلال ایک ایسے کمرے میں تھا جس کے پردے گرا دیئے گئے تھے اور جسے عام داخلے کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ کبریٰ یہ دیکھ کر نیم پاگل ہو گئی کہ ڈاکٹر، بلال کے ڈوبے ہوئے دل کو دوبارہ متحرک کرنے کے لئے پمپ کر رہے تھے۔ وہ اگرچہ نڈھال تھی لیکن پھر بھی اس نے بلال کی زندگی کے لئے دعا جاری رکھی۔

بلال چار برس کا تھا کہ زندگی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

گھونکی سے کراچی پہنچتے ہی میں نے اپنا تھیلا سنبھالا اور اپنے خاموش ہمسفر ساتھیوں سے جدا ہو کر ایئرپورٹ سے سیدھا قبرستان پہنچا جہاں بلال ــــ میرا مرحوم نواسہ اب ایک ایسے مقام پر تھا جو میری پہنچ سے باہر تھا۔ میں مٹی کے ایک چھوٹے سے ڈھیر کو دیکھ کر واپس پلٹا اور اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے محسوس کیا کہ آخر کار یہ صبر آزما دور ختم ہوا ـــ بلال بھی ایک اذیت سے نجات پا چکا تھا۔ اب وہ آزاد تھا...... وہاں جہاں، شکوے شکایت کا کوئی اختیار نہیں ـــ

میں اور بلقیس غم سے نڈھال، چپ چاپ، گھر میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ لوگ تعزیت کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے ـــ ہم اکیلے رہ گئے اور فرط غم سے بلال کے چھوڑے ہوئے کپڑوں میں منہ چھپا کر بے تحاشا روتے رہے ـــ بلال کے کھلونوں کو سینے سے لگایا، پیار کیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بوٹ دیکھ کر ہماری فریادیں نکل گئیں ـــ ہمیں ایسے لگا جیسے بلال ابھی آئے گا اور انہیں پہن کر چلنا شروع کر دے گا۔

اسی دوران کبریٰ کمرے میں آئی ـــ وہ غم سے نڈھال تھی ـــ میں اسے بازوؤں میں لینے کے لئے اٹھا ـــ اس کی حالت، انتہائی مایوس کن تھی۔

اس مشن کی خاطر آج نواسہ بھی قربان ہو چکا ـــ بلقیس کئی دنوں تک اس کے غم میں رو سکتی تھی لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ ہمیں بلال کے غم کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔

یہ ایسی یاد نہیں جسے ہم دونوں مل کر برقرار رکھ سکیں۔ اسے یاد رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم اس غم کو تمام دکھی اور محروم بچوں کے غم میں شامل کر دیں۔

بلقیس جانتی تھی کہ ہم بلال کا ذکر دوبارہ نہ کر سکیں گے لیکن دل نے ذہن کو کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے اگرچہ اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن کئی دنوں' ہفتوں اور مہینوں تک اس کے خیالوں نے دن رات مجھے گھیرے رکھا۔ جب بھی فراغت کا کوئی لمحہ میسر آتا' میں اپنے میٹھادر دفتر کے باہر چوراہے کے قریب' سبز میناروں والی مسجد کے بالمقابل ایک بینچ پر بیٹھ جاتا جہاں بازار کے شور و غل میں ہر تنہا آواز دب جاتی --- میں چاروں اطراف گلیوں میں سے لوگوں کی پرہجوم آمدورفت کو دیکھتا --- اچانک ٹریفک کے بہاؤ میں سے نکلتا ہوا کوئی شخص مجھ سے علیک سلیک کرنے آجاتا --- لیکن ان تمام مناظر سے دور کہیں اپنے نواسے بلال کی یادوں میں گم سم رہتا ...!

بلقیس نے بلال کی تصویر کو میری میز کے شیشے تلے سجا دیا تھا۔ میں جب بھی کبھی پریشان ہوا یا بخار میں مبتلا --- اس نے میرے خوابوں کے دریچوں سے مجھے جھانک کر ضرور دیکھا جہاں اس کے معصوم اور بھولے بھالے سوالات اور بڑے بڑے خیالات مجھے اپنے بچپنے کے اس دَور کی جانب کھینچ لے جاتے جب میں سوچتا تھا کہ میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا .... بلال بھی یہی کچھ سوچتا تھا ------ وہ بھی متجسس اور کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا تھا --- بلال کے چھوڑے ہوئے ننھے منے بوٹ' مجھے بانٹوا میں اپنے بچپن کی یاد دلاتے لیکن .... زندگی نے اسے مہلت ہی نہ دی ....!

"چھوٹی سی تربت"



نانا اور نانی کا لاڈلا بلال' دائمی جدائی سے پہلے



عہد شباب کا ایک عکس



میٹھا در میں قائم ایدھی ڈسپنسری کا بیرونی منظر

باب دوم

سوکھی روٹی

میرے والدین کا تعلق کھیتی باڑی کرنے والے غریب کسانوں سے تھا جو دریا کنارے آباد مختلف قبیلوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر دست و گریباں رہتے۔ تین سو برس پہلے ٹھٹھہ میں ایک مذہبی پیشوا نے ہمارے آباؤ اجداد کو مسلمان کر کے ان کا نام "مومن" رکھا تھا جس کا مطلب پکا عقیدہ رکھنے والا صاحب ایمان ہے۔ بعد میں یہ نام بگڑ کر "میمن" ہو گیا۔ حضور نبی اکرمؐ اور حضرت بی بی خدیجہؓ کی تجارت میں مثالی شراکت اور شاندار روایت کے پیش نظر قبیلے کے ایک دانا بزرگ نے میرے خاندان والوں کو کاروبار کرنے کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت کی کہ لوگوں میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ احساس بھی برقرار رہنا چاہیے۔

میمن لوگ سندھ میں ہالہ سے چلے اور ایک روایت کی رو سے، صحرائے تھر اور دوسری کے مطابق رن آف کچھ کے راستے سفر کرتے ہوئے گجرات کاٹھیاوار (بھارت) میں آکر آباد ہوئے۔ وہ جہاں جہاں بھی ٹھہرے، آنے والے دور میں وہ مقام ان کی شناخت کا حوالہ بن گیا۔ جیسے دراول، دھوراجی اور کتیانہ میمن ..... چونکہ شروع سے ہی ہمارا آبائی تعلق بستی بانٹوا سے تھا لہٰذا ہم "بانٹوا میمن" کہلائے۔ نسلی طور پر ہمارا تعلق ایدھی خاندان سے تھا۔ کئی سال پہلے ایدھی محلّہ، نام کا ایک گاؤں تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ معدوم ہو گیا۔ گجراتی زبان میں ایدھی کا مطلب سست اور کاہل ہے لیکن عملی طور پر ایدھی قبیلے کے لوگ انتہائی محنت کش، مشقت سے جی نہ چرانے والے اور پیدائشی طور پر انسان دوست تھے۔ یہ لوگ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کسی بھی جھگڑے فساد میں الجھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

میرے دادا حاجی رحمت اللہ کو ضرورت سے زیادہ پیسہ کمانے کا شوق نہ تھا۔ وہ قناعت پسند تھے اور جو ملتا، اسے صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیتے۔ انہوں نے اپنا طرز زندگی نچلے طبقے کے لوگوں جیسا اختیار کر رکھا تھا۔ خاندان برادری کا کوئی رکن مالی طور پر دیوالیہ ہو جاتا تو اس کی امداد کی جاتی یا پھر دو گروپوں کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا تو میرے دادا ثالث بن کر تمام جھگڑے ختم کرا دیتے۔

میرے والد' عبدالشکور ایدھی نے بھی ورثے میں ایسی ہی عادات پائی تھیں اور انہوں نے بھی میرے دادا کے پیشے کو اختیار کرتے ہوئے بمبئی میں کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے آبائی کام کو جاری رکھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر جب اس وقت کے دو معروف تاجروں حبیب رحمت اللہ اور حاجی داؤد پاریکھ نے حبیب بنک کی بنیاد رکھی تو والد سے رابطہ قائم کیا گیا' جنہوں نے دوستی کی بناء پر حبیب بنک میں نئے کھاتے کھلوانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔

بڑے بڑے تجارتی اداروں داوا لمیٹڈ' آراک لمیٹڈ اور آدم لمیٹڈ نے میمن برادری کے بہت سارے لوگوں کو چیدہ چیدہ عہدوں پر لگا دیا تھا' جن میں انتظامی پوسٹیں' اکاؤنٹس اور کمیشن ایجنٹس جیسے مناصب شامل تھے۔ دیگر آسامیوں میں مقامی لوگوں کو کھپا دیا جاتا۔ جوان میمن لڑکوں کو دو تین برس تک کی ٹریننگ دی جاتی تاکہ آگے جاکر وہ دانا اور سیانے کاروباری بن سکیں۔ اکثر اوقات ان کی مالی اعانت بھی کی جاتی تاکہ انہیں اپنے کسی ذاتی کاروبار کو شروع کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

میری والدہ' جن کا نام غربا تھا' کی شادی سے قبل میرے والد کی پہلی دو بیویاں وفات پاچکی تھیں۔ پہلی سے ایک بیٹا اور دوسری کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ان دنوں' میمن خاندان میں شادیوں کے لئے مناسب لڑکیوں کی کمی تھی جن کے حصول کے لئے وافر دولت اور سونا درکار ہوا کرتا لہٰذا چاروناچار لوگوں کو شادی بیاہ کے لئے بنگال' کرناٹک اور مالابار تک رجوع کرنا پڑتا ..... شادی کے موقع پر میری والدہ کو دس تولے سونا بطور تحفہ دیا گیا۔ اس زمانے میں' کسی مطلقہ یا بیوہ سے شادی کرنا رسوائی والی بات نہ تھی بلکہ اس قسم کی شادی کو اسلامی اصول کے مطابق کارثواب سمجھا جاتا تھا ..... میرے سوتیلے بہن اور بھائی کو میری خالہ نے پروان چڑھایا جبکہ ہماری پرورش ہماری ماں نے ہی کی۔

گجرات کاٹھیاوار میں جوناگڑھ کے قریب بانٹوا نام کا ایک قصبہ تھا' جس کے گھر کھلے اور گلیاں کشادہ تھیں۔ قریب قریب پچیس ہزار نفوس پر مشتمل اس گاؤں میں ایک چوتھائی میمن لوگ تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب عمومی طور پر سادہ زندگی پسند کی جاتی تھی۔ لہٰذا بانٹوا کے امیر' کبیر کاروباری بھی مشترکہ خاندانی سسٹم کی روایت پر عمل کرتے ہوئے مل جل کر

رہتے ..... ایک ہی کمرے میں پورا پورا خاندان سما جاتا----- کچھ لوگ تنگ گلیوں کی اطراف میں اکٹھے رہتے اور باقی آس پاس کے ٹیلوں پر آباد تھے۔

ہم ایک علاقے "دھوبی باڑہ" میں رہتے تھے جو قدیم دھوبی آبادکاروں سے منسوب تھا ..... یہیں میرے والد کا ایک ذاتی مکان تھا جہاں ہماری رہائش تھی۔دادی کی وفات کے بعد والد نے دوسرے محلے میں رہائش اختیار کی ..... جو کمرہ میسر آیا اس کا ایک برآمدہ تھا جسے لوہے کی جالی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چھت کے بغیر ایک غسل خانہ ہمارے اور دو دوسرے گھروں کے مشترکہ استعمال میں تھا۔ میرے سوتیلے بھائی کام کاج کے لئے بمبئی چلے گئے تو گھر میں میرے علاوہ ننھا بھائی عزیز اور بہن زبیدہ رہ گئے۔ رات آتی تو ہم فرش پر سیدھے ایک قطار میں روئی کے گدے بچھا کر سو جاتے۔ صبح سویرے میری والدہ مجھے طاق پر رکھے ہوئے برتنوں کو نیچے اتار لانے کے لئے الماری پر چڑھا دیتیں۔ وہ ہمارے لئے دال روٹی کا بندوبست کرتیں' جو ہم خوشی خوشی کھا لیتے۔ والدہ شام ڈھلے' دن بھر کے استعمال شدہ برتنوں کو دھو' چمکا دیتیں اور میں انہیں دوبارہ الماری پر رکھ دیتا۔ میں نے اس دوران بھانپ لیا کہ والدہ ایک برتن کو کسی کام میں لائے بغیر الماری پر رہنے دیتیں ..... جس میں روزانہ کے خرچ سے بچ رہنے والے پیسے ڈال دیئے جاتے ..... گھر میں اور کوئی اس الماری پر چڑھنے والا نہ تھا-----

حقیقت یہ ہے کہ عام تعلیم سے کسی رغبت کے بغیر میں بانٹوا کے تنگ و تاریک گلی کوچوں میں' طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرتے جوان ہوا۔ مجھے جس مدرسہ میں داخل کرایا گیا وہاں کے مقاصد سے مجھے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی البتہ میری شرارتوں اور اوٹ پٹانگ حرکتوں سے توجہ ہٹانے کے لئے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت مجھے ہر جماعت کا "مانیٹر" لگا دیا جاتا۔ میں جن لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا' وہ سارے میرے زیراثر تھے۔ کبھی ہم پتھروں کا ایک ڈھیر لگاتے' کافی دور جاکر بجلی کی سی رفتار کے ساتھ سرپٹ بھاگتے' شور مچاتے' ٹھوکریں مارتے اور پتھروں کی اس دیوار کو زمیں بوس کر دیتے جسے ہم نے خود بنایا ہوتا۔ بعض اوقات ہم منڈی تک فروٹ لے جانے والی گاڑیوں کا انتظار کرتے اور محض تفنن طبع کے لئے پیچھے سے خربوزے اور دوسرے موسمی پھل اڑا کر' رفوچکر ہو جاتے ..... اور کہیں مل بیٹھ کر خوب خوب دعوت اڑاتے ..... یہ سب کچھ شکم پری کے لئے نہیں

بلکہ ..... محض تفریح کے لئے ہوا کرتا ..... یہ بچپن کی اٹھکیلیاں تھیں۔ ہم کبھی کبھی درختوں پر چڑھ جاتے اور لوگوں کو ڈرانے کے لئے جنگلی جانوروں کی خوفناک آوازیں نکالتے۔ دن کا بیشتر وقت، کھیتوں میں دوڑتے اور گرد آلود کچے راستوں پر اچھلتے کودتے گزر جاتا تھا۔

میری ماں شریف، سمجھدار اور خاموش خاتون تھیں۔ اگرچہ ایسے مواقع بہت ہی کم آئے کہ میرے والدین کے درمیان اختلاف رائے کی کوئی صورت پیدا ہوئی ہو، اس کے باوجود ماں اکثر اداس رہتیں ..... شاید اس کیفیت کا تعلق ان دو بچوں کی جدائی سے ہو جنہیں پالنے پوسنے کے لئے خالہ کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ والد کبھی کبھار جھنجلاہٹ کے ساتھ اپنا سر جھٹک کر کہتے .....

"کسی بیوہ سے شادی بھی عجب مصیبت ہے ..... اس نے پہلے ہی بہت سارے بکھیڑے پال رکھے ہوتے ہیں"۔

میمن برادری کے افراد سال کے دس مہینے بمبئی، رنگون، حیدر آباد اور کولمبو میں مختلف اشیاء کا کاروبار کرتے تھے ..... والد بھی اسی دھندے کے باعث زیادہ تر گھر سے دور رہتے۔ وہ جب باہر ہوتے تو ہمیں گری پستہ، کاجو اور ادرک تھیلوں میں، بھر بھر روانہ کرتے لیکن ماں اپنے اور میرے حصے کا سارا پھل فروٹ ان نادار لوگوں میں تقسیم کر دیتیں جو ہم سے زیادہ ضرورت مند ہوتے۔ یہ وہ عادت تھی جو ماں نے بچپنے ہی میں میرے اندر رچا بسا دی تھی۔ وہ ہر روز سکول جانے سے پہلے مجھے دو پیسے دیتیں لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ میں ان میں سے ایک پیسہ لازماً کسی دوسرے حاجت مند کو دے دوں۔ وہ سمجھاتیں کہ کسی کو کچھ دینے سے پہلے یقین کر لیا کرو کہ تم سے خیرات لینے والا واقعی حق دار بھی ہے کہ نہیں .....

میں جوں ہی سکول سے واپس آ کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا، ماں مجھ سے فوراً پوچھتیں:

"تم نے پیسوں کا کیا کیا؟"

میری اکھڑی اکھڑی وضاحت سنتے ہی وہ کہتیں .....

"خودغرض لوگ اپنے سوا کسی کو بھی کچھ دینا نہیں جانتے ....."

میں والدہ کے غم و غصہ سے بچنے کے لئے تیز تیز کھانا کھاتا۔ مارا ماری میں برتن صاف کرتا اور جس عجلت کے ساتھ کام ختم کر کے جان چھڑانے کی کوشش کرتا، والدہ بھی اسی شدت کے ساتھ کہتیں .....

"دیکھو بیٹا، غریبوں کو ستانا اچھی بات نہیں ..... ان کی ہر ممکن مدد کیا کرو ..... اوپر والے کو راضی رکھنے کا یہی ایک راستہ ہے ....."

ماں کے چہرے پر رنج کے آثار اور لہجے میں تندی و تیزی مجھے ہمیشہ شرمسار کر دیتی۔ جب میں اپنے کئے کی تلافی اور ان کی شکایتوں کا ازالہ کر دیتا تو ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آجاتی۔ حق تو یہ ہے کہ ماں نے میری اچھی پرورش کے لئے، حد سے زیادہ جان ماری کرتے ہوئے بچپن میں میری جو سرزنش کی تھی، اس نے مجھے اپنے آپ پر جبر کرنا سکھا دیا تھا ..... اور یہ سبق بھی دیا تھا کہ کسی چیز سے محرومی اس لالچ سے بہتر ہے جس کے بیج بونے سے پرشکوہ درخت تو اگیں ..... لیکن بے ثمر رہیں۔

نادار اور حاجت مند لوگوں میں پیسوں کی تقسیم، اگرچہ ماضی کا ایک حصہ تھا لیکن تربیت کے باعث میں بے حد حساس ہوگیا تھا ..... جس نے آگے چل کر اس قابل بنا دیا کہ حقیقی ضرورت مندوں اور پیشہ ور گداگروں کے درمیان فرق کو جان سکوں۔ بانٹوا ایک خوشحال قصبہ تھا اور اس کے آس پاس غریب بستیاں آباد تھیں۔ میں ان بستیوں میں جاکر وہاں کے غریبوں، ناداروں اور حاجت مندوں کی مشکلات معلوم کرتا اور واپس آکر ماں کو ان حالات سے آگاہ کرتا جو مجھے کھانے پینے کی چیزیں اور ادویات دے کر الٹے پاؤں، واپس بھیج دیتیں۔

بستی کے اکثر مرد کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتے لہٰذا ماں زیادہ تر وقت ان گھروں کی پریشانیوں کو کم کرنے کیلئے اپنے آپ کو مصروف رکھتیں۔ وہ بچوں کی پیدائش کے وقت خواتین کو حوصلہ اور مشورہ دیتیں کہ وہ اپنی گھریلو مصروفیات کے علاوہ بھی کوئی کام کریں، تاکہ خودکفیل ہوسکیں۔ ہمیں کبھی محرومی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ والد پچاس ساٹھ روپے ماہانہ دے دیا کرتے، جس سے گزر بسر آسانی سے ہو جاتی۔ اس کے باوجود والدہ، دکان سے روئی کے بنڈل اٹھا لانے کو کہتیں جنہیں ہم معاوضے پر صاف کر دیتے۔ بھوسہ اور چھلکا تو ہم اپنے پاس چولہا جلا لینے کو رکھتے۔ باقی جو دھنی ہوئی صاف شدہ روئی ہوتی، اسے میں ایک بڑے بنڈل کی صورت اپنی پیٹھ پر اٹھائے بازار کے بیچوں بیچ "راستہ دو، راستہ دو" کی آواز لگاتا، دکاندار کو اس کا مال دیتا اور کام کی مزدوری لے کر واپس گھر آجاتا۔ ماں محنت کی توقیر پر پختہ ایمان رکھتی تھیں۔

والدہ، رمضان کے مقدس مہینے میں قبیلے کی دوسری میمن خواتین کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تیار کرتیں، جنہیں میں بے کس و ناچار رشتہ داروں اور ناداروں کو ان کے چھوٹے چھوٹے گھروں کی شکستہ کھڑکیوں کے ذریعے پہنچا آتا۔ اس تگ و دو کے دوران ایک سرگوشی کے انداز میں، ماں کی آواز میری رہنمائی کرتی۔

"ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اسے اصل خیرات اس وقت کہا جاسکتا ہے جب دائیں ہاتھ کا پتہ بائیں ہاتھ کو بھی نہ چلے اور جس کی امداد کی جا رہی ہے اس کی عزت نفس بھی قائم رہے"۔

میں یہ سن کر، تقسیم کی جانے والی اشیاء کو، ضرورت مندوں تک کم از کم وقت میں پہنچانے کے لئے برق رفتاری کے ساتھ گلی کوچے عبور کرتا۔

عید، بقر عید کے موقعوں پر کچھ گھروں میں تو گھی کے چراغ جلتے، زرق برق لباس پہنے جاتے اور لوگ خوشیوں سے دوہرے تہرے ہو کر یہ تہوار مناتے۔ لیکن بانٹوا بستی اور اس کے آس پاس پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ایک عجیب تہی دامنی اور بے سرو سامانی کا منظر نظر آتا۔ اداس اور سہمے ہوئے بچے، بے بس والدین ------ ماں ان دکھی لوگوں کو کیسے بھول جاتیں .... وہ عید والے روز، صبح صبح، ان کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق لفافوں میں پیسے رکھ کر مجھے ہدایت کرتیں کہ ہمیشہ کی طرح پہلے جیسی تیزی کے ساتھ کام کو سرانجام دوں۔

ہمارے گھر کے نزدیک ایک کھاتے پیتے امیر کاروباری شخص نے ڈسپنسری کھول رکھی تھی۔ جب بھی وہاں سے گزرتا، ڈسپنسری کے قریب رہنے والی بزرگ خواتین مجھے دیکھ کر پیار سے آواز دیتیں:

"او ستاریا! کچھ ہمارا کام بھی کر..... نیکی کے اس کام میں ہمارا حصہ بھی ڈال .... کھانے پینے کی چیزیں نادار لوگوں میں تقسیم کر دے"۔

میں پلک جھپکنے میں یہ سارا کام نمٹا دیتا۔ جب گھر کو واپس لوٹنے لگتا، گاؤں کے مرد اور عورتیں بڑے پیار اور چاؤ کے ساتھ مجھے پکڑ کر گلے لگاتے۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے اور میں ان کی دعائیں لیتا واپس آجاتا۔

ماں کی ہدایت پر، اکثر اوقات بانٹوا کے گلی کوچوں میں کسی معذور یا اپاہج کی اعانت کے

لئے گھومتا رہتا۔ اس دوران اگر حاجت روائی کے لئے، کوئی محتاج مجھے مل جاتا تو میں دوڑتا ہوا گھر جانے کے لئے چھوٹے سے چھوٹا راستہ اختیار کرتا.... سامنے آنے والی بیل گاڑیوں اور بازار میں لگائے گئے ٹھیلوں سے ٹکراتا اور لوگوں کو "آگے سے ہٹو" کی آواز میں خبردار کرتے ہوئے گھر سے ضروری سامان لے کر ضرورت مند کے حوالے کر آتا۔ شروع شروع میں تو لوگ میرے اس ہنگامہ خیز شور شرابے کے باعث بازار میں سے ایک طرف ہو جاتے رہے لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ میں صرف راستہ لینے کے لئے یہ واویلا مچاتا ہوں تو وہ ازراہ مذاق مجھے دبوچ لیتے۔ میں خود ہی ان کے چنگل سے نکل بھاگتا۔

میری مہربان اور نرم دل ماں، ان کاموں کی وجہ سے اکثر بھول جاتیں کہ میں ایک مدرسے میں پڑھتا بھی ہوں اور میری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ وہ مطمئن تھیں کہ میں ان کی مرضی و منشاء کے مطابق، غریبوں کے لئے دوڑ دھوپ میں کسی قسم کا جھول نہیں آنے دیتا۔ والدہ نے زندگی کے ابتدائی دنوں میں میرے لئے سماجی خدمت کے کاموں کا جو چناؤ کیا، شاید اسی نے، میرے دل میں انسان دوستی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ وہ وقت جو فلاحی مصروفیات سے بچ رہتا، میں اسے اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں گزارتا۔ ہم سب نے اپنی ایک چھوٹی سی سرکس ٹیم بنا رکھی تھی۔ طرح طرح کے کھیل تماشوں اور اپنے فن کی نمائش کے لئے ہم دوسرے بچوں سے، ایک یا دو پیسے لیتے۔ غریبوں کیلئے تماشا مفت تھا---- مجھے ہر لمحہ اس بات کا احساس رہتا کہ ہماری اوٹ پٹانگ اور ناقص کارکردگی کی بناء پر دیکھنے والوں کے پیسے ضائع نہ ہوں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہم متوازی درختوں پر باندھی گئی رسیوں پر ہچکولے کھاتے چلتے، قلابازیاں لگاتے، کشتی کے مقابلے کرتے اور مزاحیہ خاکے پیش کرکے لوگوں کو خوب خوب ہنساتے۔

مجھے بانٹوا کے------ کھیتوں اور تنگ گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلنا بھی اچھا لگتا تھا لیکن کوئی کھیل بھی میرے تیز دوڑنے کے شوق کا متبادل نہ ہوسکا۔ جب کبھی تیز بھاگنے کا مقابلہ ہوتا تو اس سے پہلے کہ میرے مدمقابل دوڑنے کے لئے پر تول رہے ہوتے، میں فاتحانہ انداز میں آخری لکیر کو بھی چھو چکا ہوتا۔ میں اتنی سرعت کے ساتھ دوڑ لگاتا کہ ساتھیوں نے مایوس ہو کر، ان مقابلوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ میں جب بھی کبھی انہیں ریس لگانے کے لئے کہتا تو وہ سب مل کر میری تجویز کو رد کر دیتے اور میں ان کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے

ان کی مرضی کے مطابق کسی دوسرے کھیل میں شامل ہو جاتا۔ ہم کبھی کبھار امیر لوگوں کے باغات میں گھس کر بیر اور پھل توڑ کر بھاگ آتے اور جب پکڑے جاتے تو باغ کا مالک ہماری گردنیں دبوچ کر کہتا۔۔۔

"شیطانو! آئندہ اگر تم لوگوں نے یہ حرکت کی تو میں تم سب کو کنویں میں الٹا لٹکا دوں گا"۔

۔۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہم شرارتوں سے باز آئے۔

اس دوران صرف ایک ہی مرتبہ میں نے کسی سے جھگڑا کیا۔۔۔ وہ بھی اس وقت جب سکول کے چند سینئر طلباء' ایک بے بس ذہنی معذور کو مل کر ستا رہے تھے۔۔۔ وہ خوف کے مارے' اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر گر رہا تھا۔۔۔ ایک لڑکے نے اس کے بے حد قریب جاکر شیر کی آواز میں چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ وہ بچنے کی کوشش کرتا تو لڑکے اس پر بگڑے ہوئے بھیانک چہروں کے ساتھ خوفناک جانوروں جیسا روپ دھار کر شور مچاتے۔۔۔ وہ بے بسی کے اس عالم میں کسی باڑ میں گھرے ہوئے جانور کی طرح ادھر ادھر دوڑتا۔ میں بے حد رنجیدہ اور غصے کے عالم میں اس مظلوم پردیسی کو اذیت پہنچانے والے ایک لڑکے کے پاس پہنچا اور اکڑ کر اس سے کہا کہ۔۔۔ وہ اس مظلوم پر مزید ستم نہ کرے۔۔۔ یہی میری ماں نے مجھے سکھایا تھا۔

سارے لڑکے میری جانب متوجہ ہوگئے۔ میرا چھوٹا سا وجود ان سب کو اپنے پہلے شکار جیسا لگا۔ میں ان کے پاس یہ فیصلہ کرکے گیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو' اس ستم رسیدہ انسان کو ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلوا کر ہی پیچھے ہٹوں گا لہٰذا میں نے تنہا' پوری قوت سے ان سب لڑکوں کے ساتھ جنگ کی۔۔۔ اس تصادم میں مجھے تو جیسے بھی زخم آئے۔۔۔ وہ ان جنونی لڑکوں کے چنگل سے آزاد ہوگیا۔

گھر پہنچا تو والدہ نے میرے جسم پر آنے والے زخموں اور خراشوں کو دھوکر بڑی شفقت سے دوا لگائی اور کہا۔۔۔

"شاباش بیٹا! آج تم نے ایک ایسے انسان کو زبان دی ہے جسے خوف کے باعث نہ جانے کب سے چپ سی لگی تھی۔۔۔ اسے ستانے والے ابھی بچے ہیں۔ بڑے ہو کر انہیں خود ہی سمجھ آ جائے گی۔" میں نے اپنی ماں کے ان خیالات کو پلے باندھ لیا اور ایسے لوگوں

کی حالت پر ترس اور ہمدردی کے احساسات لے کر جوان ہوا جو خستہ ذہنی حالت کے باعث اپنی شناخت سے بھی محروم ہو چکے تھے۔

والد کام کاج سے فارغ ہو کر جب بھی گھر لوٹتے تو ہر پندرہ دن بعد آتے ہی میرے سر کے سارے بال صاف کر دیتے۔ میری ہیت دیکھ کر برادری کے لوگوں نے میرا نام "روڈی" رکھ دیا۔ شاید اس لئے۔۔۔ کہ میرا سر گول اور چپٹا تھا۔۔۔! والد تمباکو اور اس سے تیار ہونے والی ہر نشہ آور علت کے مخالف تھے۔ چائے اور پان کے استعمال پر پابندی بھی اسی حوالے سے تھی۔ ایک مرتبہ جب والد گھر آئے تو تعلیم سے میری عدم دلچسپی اور بیشتر وقت گھر سے باہر رہنے پر بہت فکرمند ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ستار اب راجکوٹ کے بورڈنگ سکول میں پڑھے گا۔ یوں تو یہ ایک اچھا فیصلہ تھا لیکن ماں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ ان کی دلیل تھی کہ ستار گھر پر نہیں ہوگا تو اتنے ڈھیر سارے میرے کام کون کرے گا۔ والد نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ میری بھی جان میں جان آئی۔

میرے اکثر ساتھی نمازی تھے۔ "اللہ اکبر' اللہ اکبر" کی آواز آتی' ہم سارے دھندے چھوڑ کر مسجد پہنچ جاتے۔ وضو کرتے' نماز پڑھتے اور پھر دوسری اذان کے انتظار میں ادھر ادھر کھیلتے رہتے۔۔۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا۔

میں نے قرآن پاک کو اس کی بنیادی زبان عربی میں ترجمے کے بغیر پڑھنے کی ابتدا کی۔ والد علمائے حق کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن۔۔۔ بعض کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ مذہبی احکامات کے بارے میں سخت گیر ہوتے ہیں اور تاویلات میں الجھائے رکھتے ہیں۔۔۔ اس طرح لوگوں میں عذاب الٰہی سے ڈرا کر خوف و ہراس تو پیدا کر دیتے ہیں لیکن بندگی اور بندہ نوازی کے درمیان اس حسین و جمیل واسطے کا ذکر نہیں کرتے جس کے طفیل یہ دنیا ابھی تک اپنی تمامتر گہماگہمی کے ساتھ قائم ہے۔

میں جب گیارہ برس کا ہوا تو صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو چکا تھا۔ بچپن کا ابتدائی دور کسی پریشانی کے بغیر بہت پرسکون گزرا۔۔۔ ایک روز جب مدرسے کی گھنٹی بجی اور میں گھر جانے کے لئے کاپیاں کتابیں سمیٹ رہا تھا۔۔۔ میں نے اچانک عجیب بے اطمینانی محسوس کی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو سامنے میرا ایک استاد کھڑا' مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اس کی

پیشانی سے پسینہ بہہ رہا ہے --- میں نے گھبرا کر اپنا منہ ایک طرف کرلیا اور اپنی توجہ بے ارادہ ادھر ادھر مرکوز کرلی۔ میں یہ بات نہ سمجھ سکا کہ وہ مجھے ایسی نگاہوں سے کیوں گھور رہا ہے جس سے اس کا چہرہ اپنے ہی اندر کی کسی وحشت کے باعث مسخ ہو رہا ہے ---- اس کی عیار دہکتی آنکھوں کو میں نے اپنے وجود پر پھیلتے محسوس کیا ---- میں اس صورت حال کا تادیر سامنا نہ کرسکا اور بے محابا گھر کو بھاگ کھڑا ہوا ---- یہ واقعہ چونکہ بے معنی اور مبہم سا تھا لہٰذا میں نے ماں کو بتانا مناسب نہ سمجھا---

چند ہفتوں بعد ہم سب نے کلاس میں مل جل کر' بیک آواز گجراتی زبان کے ایک سبق کو پڑھنا شروع کر دیا۔ شور و غل کے تسلسل اور شدید گرمی کے عالم میں میرا نام لے کر مجھے پکارا گیا-----

"عبدالستار"۔

میں یہ سن کر کسی انجانے خوف سے نیم جاں ہوگیا۔ استاد نے جس انداز میں طلب کیا تھا' اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں پس و پیش سے کام لوں۔ میں نے گومگو کی کیفیت میں اوپر دیکھا تو استاد اب آواز کی بجائے اشاروں سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں اس کے قریب جانے سے خوفزدہ تھا لیکن کیا کرتا ---- وہ میرا استاد تھا ---- حیران و پریشان حالت میں کلاس سے باہر اس کے پیچھے چلا ---- جب اس نے مجھے مڑ کر دیکھا اور مسکرایا تو مجھے گذشتہ روز والی اس کی وحشت انگیز صورت دوبارہ نظر آتی محسوس ہوئی ---- میرا دل ڈوبنے لگا ---- اور میں ایک انجانے خوف کے باعث پناہ کی تلاش میں اپنے گھر کی جانب سرپٹ بھاگنے لگا۔ راستے میں گرتا پڑتا اور اکھڑتی سنبھلتی سانسوں کے سہارے گھر کی دہلیز پر جاگرا۔ میں نے بھیگی قمیص اتاری اور پسینے میں شرابور چہرہ صاف کیا۔ پھولی ہوئی سانسوں نے ذرا دم لیا تو اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں داخل ہوگیا۔ چارپائی پر استاد کا بدنما اور بھیانک چہرہ ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ چھوٹے اور معصوم بچے ایک بڑے شخص کے سامنے کس قدر کمزور اور بے بس ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ چوتھی جماعت کے مرحلے پر ہی ---- تعلیم کو خیرباد کہہ دوں-----!

گیارہ سال کی عمر میں کپڑے کے تاجر حاجی عبداللہ کی دکان پر مجھے نوکری مل گئی۔ حاجی

صاحب مجھے پانچ روپے ماہانہ دیا کرتے تھے جس میں سے چار روپے میں ماں کو دے دیتا اور باقی ایک روپیہ الماری کے اوپر رکھی ہانڈی میں جمع کر دیا کرتا۔ میرے علاوہ چار اور لڑکے بھی اسی دکان پر کام کرتے تھے۔ میں یہاں خوش تھا اور خوب جی لگا کر کام کرتا۔ ملازموں پر کڑی نظر رکھنے کے لئے دکان کا مالک سیٹھ' دروازے کے ساتھ چھوٹی سی میز کے پیچھے تکیہ لگا کر بیٹھ جاتا۔ ہم ہر روز دکان میں جھاڑو دیتے۔ جھاڑ پونچھ کرتے اور پھر سیٹھ کی عین نظروں کے سامنے دکان کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں مودبانہ بیٹھ جاتے۔ دکان کا کوئی ملازم اخبار پڑھتا' نہ سرگوشیاں کرتا اور نہ ہی ایک دوسرے سے مذاق --- تمام دکانداروں اور کاروباری لوگوں کا یہی معمول تھا ---- اب میں پوری محنت اور لگن کے ساتھ سرگرم عمل تھا ---- اس کارگزاری کے صلے میں سیٹھ نے مجھے اپنے بچے کو سکول سے لانے اور دن بھر کی چائے کے اہتمام و حساب پر مامور کر دیا اور مجھے بطور انعام کچھ زیادہ پیسے ملنا شروع ہوگئے ---- یوں میری ماہانہ بچت میں اضافہ ہوگیا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں ہی مجھے بچت سے لگاؤ اور فضول خرچی سے بے حد نفرت تھی۔

میمن خواتین پردے کی پابند تھیں۔ باہر نکلتیں تو اپنے پورے جسم کو ٹوپی نما سفید یا کالے برقعے سے ڈھانپ لیتیں۔ انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے برقعے کی جالی میں سے دیکھنے کی اجازت تھی اور صرف بچے ہی ان سے ہمکلام ہوسکتے تھے ---- کپڑے' برتن اور مارکیٹ میں میسر' نئے سے نئے سامان کو اسی طرح کوچہ در کوچہ فروخت کیا جاتا۔ کوئی خاتون خانہ' سامان دیکھنے اور بھاؤ بنانے کے لئے ہمیں طلب کرتی تو سر پر اٹھائی بوجھل گٹھڑی دھڑام سے نیچے پھینک کر کھول دیتے۔ جاپانی پاپلین' مراکش کی جارجٹ اور چین کی سلک' تھان کی صورت میں دیکھتے ہی خواتین خریداری کے لئے بے قرار ہو جاتیں' خوب خوب بحث کرتیں اور نرخ طے ہو جاتا تو ہم کپڑا ان کے حوالے کرتے اور قیمت وصول کرنے کے بعد دوبارہ گٹھڑیاں اٹھائے' آوازیں لگاتے گلیوں میں کھو جاتے۔

سیٹھ نے میرے کام کو دیکھتے ہوئے مجھے امین مقرر کر دیا تھا----- ایک مرتبہ دکان کے لڑکوں نے گلے میں سے کچھ رقم چوری کرلی۔ میں نے اس کی اطلاع سیٹھ کو دی --- لڑکوں سے بازپرس ہوئی تو ان میں سے ایک نے اپنے جرم میں مجھے بھی دھر لیا اور سیٹھ کو کمال ڈھٹائی کے ساتھ کہا ....

"اس چوری میں ستار بھی ہمارے ساتھ تھا"۔

سیٹھ، لڑکوں کی اس الزام تراشی پر بہت سیخ پا ہوا اور کہا —

"ستار کا نام لگا کر تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ حاجی شکور کا بیٹا چوری نہیں کر سکتا"۔

اس واقعہ کے بعد سیٹھ نے مجھے مزید فرائض سونپ دیئے۔

ماں کو ورثے میں ایک تجارتی ادارے کے کچھ حصص ملے تھے جن کا منافع لینے کے لئے میں ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ منافع کے عوض وہ سونا خرید لیا کرتی تھیں۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ بمبئی کی ایک مل کے حصص برائے فروخت ہیں — میں الماری کے اوپر رکھی ہانڈی میں سے وہ رقم لینے گھر کی جانب دوڑ پڑا جو میں نے ریزہ ریزہ جمع کی تھی۔ میں نے دس دس روپے کے تین حصص خریدے اور گھر جا کر چپکے سے متعلقہ کاغذات، ہانڈی میں رکھ دیئے۔

ایک دوپہر، ہم فٹ بال میچ دیکھنے جا رہے تھے۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک اجنبی، ٹھٹھرے پریشاں دکھائی دیا — ایسا لگا کہ یہ شخص پیشہ ور گداگر نہیں ہے — وہ زخمی تھا اور بخار کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس مسافر کی حالت دیکھ کر اپنے ساتھی سے کہا —

"تم چلو۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا"۔

واپس گھر پہنچتے ہی ماں کو ساری بات بتائی — انہوں نے مجھے روئی کا گدا، کمبل، دوائیاں، کپڑے اور کچھ کھانے پینے کی اشیا دیں، جنہیں لے کر میں اجنبی کے پاس پہنچا اور اس کے گہرے زخموں کو صاف کیا، مرہم پٹی کی — میں سوچتا رہا کہ راہ میں پڑے اس بے وسیلہ شخص کو اتنے سارے زخم کہاں سے لگے —؟ میں نے روٹی اس کے سامنے رکھی تو وہ — روٹی کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور — اس سے باتیں کرتا جاتا —! پھر ہم اسے مسجد میں لے گئے۔

وہ عجیب و غریب شخص سب میں منفرد تھا۔ اس کے ہر وقت کھلے آسمان کو دیکھتے اور دور خلاء میں گھورتے رہنے کی عادت نے اسے اور بھی پراسرار بنا دیا تھا۔ اسی نے مجھے دینی اسرار و رموز سکھائے اور خیرات کے معنی بھی سمجھائے۔

وہ بہت کھلے دل کا مالک تھا۔ فضول خرچی کی مذمت کرتا اور جہیز کی رسم کو انسان پر ایک اضافی بوجھ کے مترادف جانتا — وہ کہتا — "مسلمان روایتی جہیز کی رسومات کو اپنا کر جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس سے معاشرے میں ابتری پھیلتی ہے۔"

یہ باتیں — وہ صرف مجھ سے کرتا تھا۔

اس کی نیکی، اس کے صاف اور شفاف چہرے سے نمایاں تھی۔ میں اسے روٹی لا کر دیتا جسے وہ کئی دنوں تک اپنے پاس رکھتا اور اس میں سے تھوڑی تھوڑی کر کے ہر روز صبح پانی کے ساتھ کھاتا رہتا۔ وہ مجھے ہمیشہ مزید کھانا لانے سے منع کرتا۔ اس کی شخصیت اتنی متاثر کن تھی کہ میں اپنے دوستوں کو بھول گیا — اماں بھی مجھے بہت کم یاد آتیں — میں زیادہ تر وقت اس شخص کے ساتھ مسجد میں گزارتا۔ ہماری ملاقات کو اب اکیس دن ہو چلے تھے — ایک روز میں پوپھٹتے ہی اسے ملنے مسجد میں گیا لیکن اسے نہ پا کر پریشان ہو گیا۔ مسجد کے سارے کمرے کونے کونے تلاش کئے، باہر جا کر دیکھا، ملحقہ گھروں کے دروازوں پر بھی دستک دی اور پوچھا — کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ میں مسجد کے صدر دروازے پر دوپہر تک بیٹھا، ہر آنے جانے والے سے پوچھتا رہا کہ بھائی! ایک مجذوب شخص یہاں بیٹھا کرتا تھا، تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟—— نزدیکی کنویں میں بھی جھانک کر دیکھا، تالاب کے عقب میں بھی گیا، بازار میں بھی تلاش کرتا رہا — کھیتوں کھلیانوں میں بھی ڈھونڈا اور قصبے کی بڑی سڑک کے چوک میں آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ کر دور تک اسے دیکھا کہ شاید وہ کہیں بیٹھا ہوا نظر آ جائے — اسی دوڑ دھوپ میں سورج ڈوب گیا — اس نے مجھے کئی ماہ تک پاگل بنائے رکھا — میری زندگی کا پہلا استاد مجھ سے کھو گیا تھا۔

بہن زبیدہ کی شادی، ہمارے خالہ زاد بھائی سے طے پائی تھی، جب وہ دونوں نابالغ تھے۔ میرے والدین کو ہمیشہ دولت کی نمائش سے نفرت رہی — ماں نے زبیدہ کو دیئے جانے والے برائے نام جہیز پر اعتراض کرنے والی ایک خاتون سے کہا —

"جہیز میں کمی کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہمیں اپنی بیٹی سے پیار نہیں۔ ہمیں بیٹی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی سادگی — ہماری یہ دونوں محبتیں جہیز میں بھی شامل ہیں۔"

زبیدہ کی شادی کے موقع پر مسجد میں ایک سادہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جہاں نکاح پڑھا گیا اور برادری کے ریکارڈ رجسٹر میں درج کرا دیا گیا۔ گھر کے سامنے ایک خیمے کے نیچے

خاندان کے تقریباً" پندرہ افراد کو ضیافت دی گئی اور یوں ہماری بہن زبیدہ دلہن کی حیثیت سے بنگلور جاکر ایک نئے خاندان میں شامل ہوگئی ــــ اس کا خاوند ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ ہم سب نے تو زبیدہ کی رخصتی برداشت کرلی تھی پر ماں' اس کی جدائی پر بے حد اداس تھی۔

ماں نے دکان کی ملازمت چھڑا کر مجھے ایک انگریزی سکول کی پہلی جماعت میں داخل کرا دیا------ تاہم مجھے تعلیم سے کوئی خاص رغبت نہ تھی ــــ پہلی سے دوسری جماعت میں ترقی پانے کے بعد تیرہ سال کی عمر میں عام روایتی تعلیم سے فارغ ہوگیا...... اب ایک نیا جنون ہم سب کے سروں میں یہ سمایا کہ سینما جاکر فلم "پکار" دیکھی جائے۔ آج بھی یاد آتا ہے کہ میں نے بڑے سلیقے سے غسل کیا' سفید پاجامے پر سرخ قمیض پہنی' اپنے گنجے سر پر تیل لگایا اور دوستوں کو لے کر بذریعہ بس بڑی توقعات کے ساتھ احمد آباد ــــ جاپہنچا۔ اس سے پہلے ہم سب میں سے کوئی بھی بانٹوا چھوڑ کر باہر نہیں گیا تھا' ہم اپنے گرد و نواح کے مناظر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ سب نے اپنے اپنے ٹکٹ لئے اور ایک ایسے اندھیرے ہال میں داخل ہوگئے جہاں ہماری آنکھیں ایک بڑے پردۂ سیمیں پر مرکوز ہوگئیں۔ پنکھوں کی وجہ سے پورے ہال میں پسینے کی بو پھیل رہی تھی۔ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ میری آنکھیں اندھیرے میں بھٹکنے اور سلولائیڈ سکرین سے نجات کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگیں ــــ فلم کی کہانی اور اداکاروں پر کوئی توجہ نہ دے سکا۔ محسوس کیا کہ باقی دوست گم سم' ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ آخرکار قصہ تمام ہوا ــــ چاہا کہ جو کچھ میں نے فلم میں دیکھا تھا اس پر کوئی تبصرہ کرسکوں لیکن میرے ذہن نے ساتھ نہ دیا۔

بانٹوا کے دوستوں نے اب فلمی ہیرو جیسا روپ دھار لیا تھا۔ وہ گلیوں' بازاروں میں عجیب و غریب سٹائل کے ساتھ اکڑتے' چلتے۔ بالوں میں دلفریب شکنیں بنائے ــــ کمال ناز و ادا کے ساتھ جیبوں میں ہاتھ ڈالے' سرشام چوراہوں پر کھڑے ہو جاتے۔ فلم کے جو مکالمے انہوں نے یاد کر رکھے ہوتے' انہیں خوب مزے لے کر دوہراتے ــــ ادھر میرا یہ حال تھا کہ جو کچھ بھی دیکھ کر آیا تھا' وہ گڈمڈ ہوچکا تھا اور سارا تانا بانا ٹوٹ پھوٹ کر دماغ میں بے ترتیب ہوچکا تھا ــــ فلم کی یادیں دھیرے دھیرے محو ہوتی چلی گئیں۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں آئندہ کیا بنوں گا ــــ! سوچ کے اس انداز نے مجھے باقی

معاملات سے لاتعلق کر رکھا تھا...... کسی مناسب اور اچھے فیصلے پر پہنچنے کے لئے میں غسل خانے میں چلا جاتا اور وہاں سکون و اطمینان کے ساتھ مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا۔ آج بھی میرے لئے غسل خانے سے زیادہ موزوں اور بہتر کوئی اور مقام ایسا نہیں جہاں بے خلل تنہائی اور آزادی میسر آسکتی ہو۔ کبھی کبھار تصور میں پوری دنیا کے گلی کوچوں کی سیر کرتا۔ جب دوستوں کو بتاتا تو وہ میرا مذاق اڑاتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگاتے اور کہتے

......

"رونی میاں! تمہیں بیٹھے بٹھائے یہ خیالات کیسے آتے ہیں ــــ شاید تمہیں شیطان گمراہ کر رہا ہے۔"

میں اپنا دفاع کرتے ہوئے جواب دیتا ــــ

"یہ بات میرے اختیار میں نہیں کہ میں خیالات کے بارے میں یہ انتخاب کرسکوں کہ انہیں مجھ پر کب اور کہاں وارد ہونا چاہیے ــــ مجھے سہانے سپنے دیکھنے کا حق تو ہے۔"

اب میں گلی محلوں میں پنسلیں اور ماچسیں بیچتا ــــ بچت ہانڈی میں ڈال دیتا اور ہوائی قلعے تعمیر کرتا ــــ شاید غریبوں کے لئے ہسپتال بن جائے ــــ یا ایک فیکٹری جس میں غریبوں کو ہنرمند بنایا جائے اور انہیں روزگار ملے------ یا پھر معذوروں کے لئے الگ ایک شہر-----!

میمن لوگ روپے پیسے کو گردش میں رکھنے کے قائل تھے۔ مقامی کسان' چاول اور گندم پیدا کرتے' جن کی زیادہ مقدار کاروباری میمن' مارکیٹ سے تھوک کی صورت خرید لیتے اور آگے لے جاکر فروخت کر دیتے۔

دہلی' کانپور اور کلکتہ سے واپسی پر تاجر بتاتے کہ وہاں غریب لڑکیوں کا کس توہین آمیز طریقے سے استحصال کیا جاتا اور امیروں کے نائٹ کلبوں میں رقص کو بھی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا پھر اس بے حیائی کو معاشرتی آداب کا نام دیا جاتا ــــ! یہ سوچ کر میرے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی اور میں نے گجراتی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کو پڑھنا شروع کر دیا جن میں چھپنے والے اصلاحی مضامین نے مجھے بہت متاثر کیا۔

نوعمری میں ہی ملک کے معروف جریدوں "مسلم گجرات گزٹ"۔ "بمبئی سماچار" اور "سینڈلیس میگزین" کے مطالعہ سے میں مارکس اور لینن کے اشتراکی نظریات سے متعارف ہوا

اور سامراجی قوتوں کے خلاف مظلوم قوموں کے غم و غصہ اور محمد علی جناحؒ کی برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کی تحریک کا علم ہوا۔ ترقی پسند اور انقلابی صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بھی پڑھا جنہوں نے سماجی اصلاحات کے لئے آواز بلند کی تھی۔ میں نے واقعہ کربلا بھی پڑھا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نامور صحابیوںؓ کی داستانیں بھی ۔۔۔ مجھے محسوس ہوا کہ انسانی دکھوں کا علاج دنیا کے تمام انقلابیوں کا مشترکہ نصب العین رہا ہے۔ کارل مارکس کی زندگی اور فلسفے پر گجراتی زبان میں لکھی گئی ایک کتاب میں نے احمد آباد سے منگوا کر پڑھی ۔۔۔ میکسم گورکی کی کتاب "ماں" نے بھی مجھے بے حد متاثر کیا۔

چونکہ میں صرف گجراتی زبان میں ہی کتابیں پڑھ سکتا تھا لہٰذا میرا مطالعہ محدود رہا۔ ایک پیراگراف کو میں جب تک تین چار مرتبہ پڑھ نہ لیتا' میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ موضوع کو سمجھنے کے لئے مجھے تھوڑی سی انفارمیشن درکار ہوتی جسے میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق چھوٹی موٹی کتابیں پڑھ کر حاصل کرلیتا۔

خیالات میں گھرا' میں اپنے گھر کے باہر ایک بینچ پر گھنٹوں لیٹ کر آسمان کی جانب دیکھتا رہتا یا پھر غسل خانے میں جاکر اپنے آپ کو مزید تنہا کر دیتا اور سوچتا رہتا ۔۔۔ سماجی تبدیلی کے بارے میں اب میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا ۔۔۔ خان عبدالغفار خان کی سماجی پارٹی "خدائی خدمتگار" کا نام ہی ایسا تھا جو مجھے پسند آیا ۔۔۔ علامہ مشرقی کی "خاکسار تحریک" کا میں اس لئے احترام کرتا تھا کہ اس کے کارکن گھر گھر جاکر لوگوں کے مسائل حل کرتے تھے۔

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ حالات' واقعات کی مثالیں سامنے رکھنے سے میری سوچ میں پہلے سے زیادہ وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ میں کسی بھی موضوع کے بارے میں زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچنے سے گریز کرنے لگا ۔۔۔ مجھے زندگی اور اس سے متعلق مسائل کا عمیق مطالعہ یا لمبی چوڑی تفصیلات جاننے کا شوق کبھی نہیں رہا' پر چھوٹے چھوٹے دردناک واقعات مجھے بے حد متاثر کرتے تھے ۔۔۔ میں نے پڑھا کہ کارل مارکس کے پاس اپنے بیمار بچے کو بچانے اور موت کے بعد اسے دفنانے کے لئے کفن تک نہ تھا۔ اس واقعہ سے مارکس کی سوچ میں جو انقلاب آیا' اس سے مجھ پر شعور کے کچھ اور دروازے کھلے۔۔۔۔۔

کربلا کا المیہ' حق کے خلاف باطل قوتوں کا ایک ایسا جابرانہ اور غیرمنصفانہ فعل تھا جسے قریب قریب سات سو برس تک اہمیت نہ دی گئی۔ والد نے بتایا کہ شیعہ فرقہ کے بچے چھ سات برس کی عمر میں ہی ایسے علوم سے واقف ہو جاتے ہیں جو انہیں ماسوائے خدا کی ذات کے' کسی سے نہ ڈرنے اور ظالم و جابر حکمران کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ والد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مسلمان' کربلا کے سانحہ کی نفی نہیں کرتے لیکن بعض لوگ اپنی جہالت کے باعث اس دائمی حقیقت کے ذکر کو ٹالتے رہتے ہیں۔ آج کے مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی' ظلم اور ناانصافی کے خلاف خاموشی' انہی حقائق سے فرار ہے۔ والد کے یہ الفاظ میرے ذہن میں شجرکاری کا کام دیتے۔

میمن برادری کے بیشتر افراد سنی العقیدہ تھے لیکن میں محرم کی دسویں تاریخ کو پوری غم انگیز کیفیت کے ساتھ کربلا کے شہیدوں کی یاد میں سوگوار رہتا۔ جب عاشور کی رات دل ہلا دینے والے واقعات سنتا تو بے اختیار روتا۔

میرے والد' ایک معتدل مزاج' روشن خیال اور ہروقت سوچ بچار کرنے والے فلاسفر قسم کے آدمی تھے۔ وہ مذہب کے بارے میں قطعی طور پر جنونی نہیں تھے۔ انہوں نے حج کر رکھا تھا اور نماز پنجگانہ بھی باقاعدگی سے ادا کرتے تھے لیکن زیادہ توجہ اپنے خیالات کو پاک و پاکیزہ رکھنے پر دیتے تھے۔ وہ بے داغ زندگی گزارنے کے لئے ایک مثالی ضابطہ اخلاق کے قائل تھے۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیانی وقفے میں چالیس یا پچاس افراد مل بیٹھ کر دور دراز کے سفر سے واپس آنے والوں کی سرگزشت سنتے' برصغیر کے سیاسی حالات پر گفتگو کرتے' دنیا جہان کی کہانیاں اور کاروبار میں پیش آمدہ نت نئی مہمات۔۔۔۔۔۔ گویا اس بیٹھک میں زندگی کے تقریباً" سبھی موضوعات پر بات ہوتی لیکن اس دوران اگر کبھی کوئی فرد مذہبی تعصب کا موضوع چھیڑنے کی کوشش کرتا تو وہ جان بوجھ کر موضوع تبدیل کر دیتے تاکہ لوگ گفتگو کے دوران اپنی کم علمی کے باعث ایک دوسرے سے الجھ نہ پڑیں۔۔۔۔۔

وہ ایک کم گو انسان تھے لیکن جب اور جتنا بولتے' مجھ پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتے۔ جہاں تک رسومات کا تعلق ہے' والدہ بھی کچھ زیادہ مذہبی نہ تھیں۔ انہوں نے کسی قسم کی روایتی تعلیم حاصل نہ کی۔ حتیٰ کہ نماز پڑھنا بھی نہیں جانتی تھیں پر عبادت کا سارا مرحلہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا ذکر کرتے طے کر جاتیں۔ وہ بعض اوقات تسبیح کے دانوں پر "اللہ ہو' اللہ

ہو" کا دم کرتے ہوئے مجھے پھونکیں مارتیں اور پھر میرے کانوں میں سرگوشی کرتیں ....

"بیٹے ... میری ساری دعائیں تیرے لئے ہیں------"

ہم اتنے غریب تو نہ تھے لیکن ہماری بود و باش بے حد سادہ تھی ... مختصر سا گھریلو سامان ہماری ضروریات کے لئے کافی تھا۔ ماں' اپنی بہن سے اس کے بچوں کے پرانے استعمال شدہ کپڑے ہمارے پہننے کے لئے منگوا لیتی تھیں۔ سالہا سال محنت مزدوری کر کے اکثر لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ ان کا معیار زندگی اب پہلے سے بہت بہتر تھا لیکن بڑے بڑے بنگلوں اور گھروں میں رکھا ہوا قیمتی فرنیچر کبھی بھی میرے والدین کے لئے رشک کا باعث نہ بن سکا۔ والد اکثر اس بات پر زور دیتے کہ سادگی سے بڑھ کر افادیت کا حامل کوئی اور طرز زندگی نہیں ہے ... سادگی اپنی مرضی و منشاء سے اپنائی گئی تھی' کسی جبر کے تحت نہیں .... اور ہم اسی میں خوش تھے۔

میمن خواتین بہت سلیقہ مند تھیں۔ وہ اپنے فرش خود صاف کرتیں اور انہیں پالش کر کے چمکائے رکھتیں۔ ماں باقاعدگی سے ہر روز جھاڑو پوچا دیتیں۔ ہم سارے گھر والے فرش پر ہی سوتے' وہیں اٹھتے بیٹھتے اور کھانا کھاتے۔ مجھے بچپن میں کھڑے پاجاموں پر سرخ رنگ کی قمیض پہننا پسند تھا۔ ماں میرے شوق کے مطابق سبز' نیلے اور لال رنگ کے کرتے سی کر دیا کرتی تھیں جنہیں میں بہت سنبھال کر پہنتا۔

انگریز حکومت کے ثقافتی اثرات کے زیر اثر اس دور کے نوجوان اپنے بالوں کی تراش خراش نئے نئے فیشن اور سٹائل کے مطابق کرواتے .... میرے سر پر بال نہ دیکھ کر وہ حیران ہوتے .... والد نے ایک روز میرے بال تراشتے ہوئے سمجھایا کہ سر منڈانا غرور اور خودبینی کو ختم کرنے کا بہترین اور موثر طریقہ ہے۔ اپنی ذات کی نمائش نہ ہو تو توجہ کاروبار پر پوری طرح مرکوز رہتی ہے کیونکہ خودنمائی ہمیشہ اضطراب اور پراگندہ خیالی کو جنم دیتی ہے .... اگر اسے ترک کر دیا جائے تو انسان کو ڈھیر ساری عاجزی اور سچائی میسر آجاتی ہے۔ دوست احباب میری یہ حالت دیکھ کر اور آئندہ زندگی کے بارے میں میرے بڑے بڑے منصوبے سن کر قہقہے لگاتے۔ وہ مجھے "شیخ چلی" کہہ کر پکارنے لگے جو خالی خواب دیکھنے والا ایک بے عمل افسانوی کردار تھا۔ وہ مذاق سے مجھے کہتے ...

"ستار میاں! تمہارے دماغ کا یہ فتور بہت جلدی دم توڑ دے گا اور تم اپنے اصلی مقام پر آجاؤ گے۔ تمہیں چاہیے کہ چھوٹے کام کرو اور سوچ بھی چھوٹی رکھو۔ یہ تمہارے مستقبل کے لئے بہتر ہے"۔

میں یہ باتیں سن کر کبھی دل برداشتہ نہ ہوتا اور مسکرا کر جواب دیتا ...

"ہاں میں اپنی زندگی کا آغاز چھوٹے کاروبار سے تو کر سکتا ہوں لیکن اپنی سوچ کو کمتر نہیں کر سکتا------"

بانٹوا میں انہونے واقعات کم ہی رونما ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ایک سیٹھ پر' پیشہ ور ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تو اس نے کمال جرات مندی اور بہادری کے ساتھ ایک بڑے چھرے کی مدد سے خود کو اور اپنی فیملی کو بچا لیا جس کے نتیجے میں ڈاکو بھاگ گئے۔ اس واقعہ نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں انتہائی مشکل صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر اس شخص کی قوت ارادی کا بے حد احترام کرنے لگا...... ڈاکوؤں کا پس منظر جان کر بھی حیرت زدہ ہو گیا کہ وہ لوگ بقول ان کے ایک بزرگ و معتبر صوفی پیر دستگیر کے معتقد تھے۔ چوری چکاری اور ڈاکہ زنی کے نتیجے میں جو مال متاع ان کے ہاتھ لگتا' اس میں سے آدھا غریبوں اور حاجت مندوں میں خدا اور اپنے مرشد کے نام پر تقسیم کر دیتے۔ والد نے عبادت کے اس ناقص طریقے کے بارے میں بتایا ...

"تم نے دیکھا' بعض لوگ خدا کی ہستی سے متعلق اپنے آپ کو کس طرح دھوکے میں رکھتے ہیں۔ وہ گناہوں کا بھی جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔"

اب میں چودہ برس کا ہو چکا تھا ... ایک روز میں نے اپنا دل ایک لڑکی کے لئے دھڑکتے محسوس کیا ... وہ بے حد شرمیلی تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس کے لئے میرے دل میں انس موجود ہے۔ وہ ہمارے گھر کے اوپر والے کمرے میں رہتی تھی۔ جب سویرے سویرے وہ اپنے نازک پہلو میں گگری اٹھائے نیچے اترتی تو میں نماز کے لئے وضو کر رہا ہوتا۔ وہ نلکے سے پانی بھرتی اور پلک جھپکتے سیڑھیاں چڑھ جاتی۔ کبھی کبھی وہ مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا دیتی ... بعض اوقات میں اس کی واپسی کا انتظار کرتا لیکن ... سیڑھیوں میں ڈوبنے والا وہ چاند پھر کبھی طلوع نہ ہوا اور میں نے بھی چپ سادھ کر صبح دیدار کے سارے منظروں سے آنکھیں پھیر لیں۔ میرے عشق خانہ خراب کی یہ لمحاتی سرگرمیاں اچانک اس وقت دم توڑ گئیں جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہونے والی

ہے-----!

کھلے آسمان کے نیچے ایک چھجے پر لیٹ کر حیران و ششدر، میں سوچتا رہتا کہ مجھے دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے اور میں کس لئے زندہ ہوں ..... اس ذہنی کشمکش کے دوران دروازے تک آکر ماں پوچھتیں-----

"بیٹا ... کیوں جاگ رہے ہو----- تم رات بھر کیا سوچتے رہتے ہو!!"۔

ماں کے اس سوال کا میرے پاس کوئی معقول جواب نہ ہوتا۔

بعض اوقات میرے دوست احباب کبھی ختم نہ ہونے والی بحثوں میں الجھ جاتے۔ یہ سلسلہ طلوع آفتاب سے کچھ دیر پہلے تک جاری رہتا۔

بانٹوا کبھی کبھار زیادہ بارشوں کی وجہ سے سیلاب زدہ رہتا۔ یہ قصبہ اگرچہ اونچی سطح مرتفع پر واقع تھا اور اس قدرتی نعمت کے باعث تباہی سے محفوظ رہتا تاہم ندی نالوں اور پشتوں کے قریب کچے گھروں میں رہنے والوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا اور سیلاب ان کے لئے بہت سارے مصائب لے کر آتا۔ میں ان کے اس ابتلا پر ہمیشہ دکھی ہوتا۔ ایک دفعہ جب شادی کی مسرتوں میں ہنستے کھیلتے لوگوں سے بھری ہوئی ایک مسافر بس حادثے کا شکار ہوگئی اور اس میں سوار بہت سے لوگ مرگئے تو میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ لاشوں اور ان کے اٹھتے جنازوں کو دیکھا۔ اس المیے کو برداشت کرنا میرے بس میں نہ تھا----- فلاں کیسے اور کیوں مرگیا----- قبر کے اندھیرے میں اس کے ساتھ کیا ہوگا-----!! ان سوالات کا میرے پاس کوئی معقول اور تسلی بخش جواب نہ تھا۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب قریب قریب ایک صدی تک ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد برطانوی سامراج دم توڑ رہا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کے نام سے ایک نیا سیاسی اور جغرافیائی خطہ معرض وجود میں آنے کو تھا۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ عظیم رہنما محمد علی جناحؒ بانٹوا کے مسلمانوں سے ایک خطاب کرچکے تھے جس میں ہم سب نے پاکستان کے حق میں بڑے پرجوش اور فلک شگاف نعرے لگائے اور پارٹی فنڈ میں پینتیس ہزار روپے قائداعظمؒ کو پیش کئے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے چار آنے دے کر مسلم لیگ کی بنیادی رکنیت حاصل کی۔

جناح صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندوستان میں رہ جانے کا ہمارا فیصلہ بھارت

کے لئے مفید اور پاکستان کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا کیونکہ اس طرح پاکستان، میمن برادری کے انتہائی تجربہ کار کاروباری طبقے سے محروم ہو جائے گا۔ ممتاز سیاسی رہنما یوسف ہارون جو خود بھی نسلی طور پر ایک کچھی میمن تھے، انہوں نے بھی کاٹھیاوار کے مختلف قصبات میں بڑی بڑی ریلیوں اور جلسے جلوسوں میں میمن برادری کو یقین دلایا کہ ان کے لئے پاکستان جانا ہر لحاظ سے بہتر رہے گا۔ چنانچہ میمن لوگوں نے محمد علی جناحؒ کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے ہندوستان چھوڑنے اور پاکستان جاکر آباد ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ بعدازاں ایک متعصب ہندو سیاستدان، ولبھ بھائی پٹیل کے اکسانے پر ہندوؤں نے بانٹوا کو اپنی بربریت کا نشانہ بھی بنایا۔ مسلمانوں پر حملے اور انہیں خوفزدہ کرکے یہ جتلایا جا رہا تھا کہ بھارت میں ان کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی۔ خونریزی اور تشدد کے مزید واقعات کے نتیجے میں امن پسند میمن برادری نے نئے وطن کی جانب ہجرت کا جو حتمی فیصلہ کیا تھا، میرے والد بھی اس میں شامل تھے۔ ان کا کہنا تھا ....

"ہمیں پاکستان چلے جانا چاہیے کیونکہ آزادی کے بعد ہم ہندوستان میں ایک خودمختار قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکیں گے ...." انہیں جو بھی ملتا، اسے سمجھاتے ... "ہمیں پاکستان میں باعزت زندگی گزارنے کے بہت سے مواقع ملیں گے اور ہم پر رام راج کی جگہ اسلام کے منصفانہ قوانین کی حکمرانی ہوگی۔"

لوگ یہ باتیں سن کر بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان میں ایک محفوظ مستقبل کے لئے ... ہجرت پر آمادہ ہوگئے۔

کبھی کبھار یار دوست تاریخ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ....

"ہندوستان کے بادشاہوں نے کبھی بنیادی اصلاحات پر توجہ نہیں دی۔ وہ اس بھروسے پر اپنے آباؤاجداد کے عظیم الشان مقبرے بناتے رہے کہ جب وہ خود دنیا سے اٹھ جائیں تو پسماندگان ان کے لئے بھی ایسے ہی روضے اور درگاہیں بناسکیں۔ انہوں نے بڑی بڑی جامع مساجد تعمیر کیں اور مورخین کو خطیر رقمیں دے کر ان سے اپنی تعریف میں ایسی تاریخیں لکھوائیں جن میں اس زمانے کے لوگوں کا ذکر بھی تھا تو برائے نام .... مسخ شدہ حقائق سے لبریز ان دستاویزات کو تاریخ کا نام دیا گیا، لیکن آنے والی نسلوں کو ان اوٹ پٹانگ قصے کہانیوں سے کچھ نہ ملا۔"

تاہم مجھے دوستوں کی بعض باتوں سے اختلاف تھا .....

میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر کی تاریخ میں شیر شاہ سوری ہی وہ تنہا حکمران تھا جس نے کلکتہ سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ (جی ٹی روڈ) بناکر عوامی بھلائی کا ایک تاریخ ساز کام کیا۔

چھ ستمبر 1947ء کے دن ہم اس ریل گاڑی کے منتظر تھے جس نے ہمیں ''اوچھ پورٹ'' کے مہاجر کیمپ تک لے جانا تھا۔ میرے بہنوئی' بھارت کے شہر بنگلور میں ہی رہ گئے تھے اور بہن زبیدہ ہمارے ساتھ پاکستان آنے کے لئے چل پڑی تھی۔ بھارتی حکومت کو جب اتنے بڑے کاروباری گروپ کے بھارت چھوڑنے کا احساس ہوا تو ایک انڈین اسسٹنٹ کمشنر کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ ہمیں پاکستان جانے کے ممکنہ نتائج سے ڈرا کر بھارت میں ہی رہنے پر آمادہ کرے لیکن والد اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے ..... انہوں نے ہر شخص کو پاکستان کی جانب اپنا سفر جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

میمن برادری کے تقریباً'' چار ہزار افراد اوچھ جانے کے لئے مسافر گاڑی پر سوار ہوئے ..... ہم نے پانچ روز تک سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کیا اور کشتیوں میں بیٹھ کر بحیرہ عرب کی اٹھلاتی لہروں کے ساتھ ساتھ منزل مراد ..... کراچی کو چل پڑے۔ سمندری سفر دو دن میں طے ہوا۔ کراچی کی بندرگاہ پہنچے تو مچھیروں کی تحویل میں بے سدھ پڑی ڈھیروں مچھلیوں کی بو سے ہمارا دم گھٹنے لگا۔ ماں نے عزیز کو بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور زبیدہ میرے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں تھی ..... ہم آنے والے حالات کی غیر یقینی سے بہت خوفزدہ تھے۔ اپنے نئے وطن کی سرزمین پر' ہم ایک ولولہ انگیز احساس کو ساتھ لئے اترے ..... مجھے اس دوران اگر کسی چیز کا افسوس تھا تو وہ بانٹوا میں ..... گھر کی الماری کے اوپر ہانڈی میں رکھے ان کمپنی حصص تھے جنہیں میں عجلت میں وہیں چھوڑ آیا تھا ..... وہ جتنے بھی تھے' اب میرے کسی کام کے نہ تھے .....!

''سوکھی روٹی''



ایدھی لنگر پر ..... ایدھی فاؤنڈیشن میں مقیم بچوں کو روٹیاں پکانے کا ڈھنگ بتاتے ہوئے



ذہنی معذور بچوں کے ساتھ، فرصت کے چند لمحات

باب سوئم

دو پیسے کی سلطنت

پاکستان ...... ایک نئی تمکنت کے ساتھ معرض وجود میں آچکا تھا ...... قوم اپنی نئی پہچان کے لئے پرامید تھی----- ایک ایسی امید جو کسی بھی کام کے آغاز میں ہوتی ہے ...... ہماری گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ ملیر کے علاقے میں ایک خستہ حال عمارت ہمارا مقدر ٹھہری ...... یہ عمارت ایک نوتعمیر شدہ مندر کے ساتھ تھی ...... بانٹوا کے قدیم گھروں اور ناپختہ گلی کوچوں کا اس عمارت کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے' میں پریشان سا ہوگیا۔ ابھی تک بانٹوا کی یاد' وہاں کے بڑے کھیت اور کھلی ہوائیں' ذہنوں پر چھائی ہوئی تھیں۔

وہ عمارت' بہت جلد ہی کسی پناہ گزین کیمپ کا سماں پیش کرنے لگی ...... بڑے سائز کے ٹین کے صندوق' پوٹلیاں' چھوٹے بڑے برتن' چادروں میں لپٹے بندھے ...... جگہ جگہ پڑے تھے۔ کھانے کے ڈبے ...... روتے بلکتے بچے ...... اور پریشان حال عورتیں------ برآمدوں میں بے ترتیب پڑے تھے۔ والدہ نے اسی کمرے کا چھوٹا کونہ' کھانا پکانے کے لئے چن لیا اور چولہا جلایا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ گھر...... چولہا جلنے سے ہی بنتا ہے۔

یہ وہ وقت ...... تھا جب متروکہ املاک پر قبضہ کرنے کی دوڑ ہر طرف شروع ہوچکی تھی۔ پاکستان سے جاتے وقت' جو املاک خالی تھیں ...... کچھ لوگ ان پر قبضہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو پچھاڑ رہے تھے۔ والد اس قسم کے غیرقانونی قبضے کے شدید مخالف تھے۔ دوستوں نے انہیں ہر ممکن طریقے سے اس لوٹ کھسوٹ پر اکسانے کی کوشش کی پر' ان کا ایک ہی جواب تھا ...... "ہمیں محنت و مشقت کرکے ایک قوم کو سنوارنا اور پروان چڑھانا ہے۔ کیا ہم یہاں لٹیرے بن کر آئے ہیں ......؟" وہ لوگوں کی ان حرکتوں کو دیکھ کر بڑے مایوس ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد' والد نے جوڑیا بازار کے ساتھ چھاپہ گلی میں' ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے لیا۔ نئی رہائش' شہر کی عدالت کے قریب واقع تھی اور اس کے ساتھ ہی بدنام زمانہ نیپئر روڈ تھا' جہاں سے چھوٹے بڑے کئی راستے' دوسرے بازاروں کی طرف نکلتے تھے۔

پاکستان کی پہلی ٹیکسٹائل مل' ولیکا خاندان کے اشتراک سے بنی۔ جن لوگوں کے پاس سرمایہ کم اور تجربہ زیادہ تھا' انہیں کافی چھوٹ دی جانے لگی۔ میں نے بھی اس اسکیم کے

بارے میں سوچا مگر والد نے مشورہ دیا ـــ "کاروبار کو ابتدا سے سمجھو اور محنت کر کے نیچے سے اوپر تک پہنچو کیونکہ ایک دفعہ اوپر پہنچ کر تم کبھی بھی سیکھنے کے لئے نیچے نہ اتر سکو گے"۔ والد نے گھر کے نزدیک ہی ایک دکان پر ملازمت اختیار کرلی۔ میں ان کا ہاتھ بٹاتا ـــ مگر زیادہ وقت گلیوں کی خاک چھانتا اور حسرت سے کراچی اور بانٹوا کا موازنہ کرتا رہتا۔

میمن برادری کی محنت کے نتائج جلد ہی سامنے آنے لگے۔ اب شہر میں ہر طرف کاروباری رونق تھی۔ اشیاء کی کمی کے باوجود دکانیں کھل گئیں اور کپڑوں کے بازار سج گئے۔ کریانے' حلوائی اور قصابوں کی دکانیں آباد ہوگئیں۔ فٹ پاتھوں پر کھوکھے اور ٹھیلے والوں سے میلہ سج گیا ـــ پرانے کپڑے اور گھریلو اچار کی مختلف قسمیں فروخت ہونے لگیں ـــ برف' شربت اور مصالحے دار پھل بکنے لگے۔ ٹھیلے والے' کسی گلی کی نکڑ میں رکتے اور مکھیوں کی یلغار میں اپنا کام جاری رکھتے۔ ایک ہاتھ سے برف کا گولہ یا شربت بناتے تو دوسرے سے مکھیوں کو اڑانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ اب بکنے والی ہر چیز' بازار میں عام دستیاب ہونے لگی---

جہاں ہم رہتے تھے وہاں ہر طرح کے لوگ تھے۔ سرحد سے پٹھان' حیدر آباد دکن اور اترپردیش کا اردو دان طبقہ' مشرقی پنجاب سے پنجابی اور مشرقی بنگال سے بنگالی' سبھی یہاں موجود تھے ـــ طرح طرح کی ثقافتیں یکجا ہو گئی تھیں .... دن بھر' میں ایک تھڑے پر بیٹھا بھانت بھانت بولیاں سنتا اور اس انوکھے میل جول کو حیرت سے تکتا ـــ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک پٹھان' خوں خوار چیتے کی طرح' ایک دوسرے شخص پر جھپٹا اور ـــ پلک جھپکتے ہی اس کا خنجر' مدمقابل کے سینے میں پیوست ہوچکا تھا .... کچھ دیر پہلے جہاں' ایک جیتا جاگتا انسان کھڑا تھا' اب وہاں خون میں لتھڑی بے جان لاش' زمین پر پڑی تھی۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ میں بھی جائے وقوعہ پر پہنچا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پٹھان نے جس شخص کو موت کے گھاٹ اتارا' وہ ایک سکھ تھا۔

ایک ہیبت ناک جرم کا ارتکاب' میں نے پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ایک انسانی جان اس قدر ارزاں کیوں ہے کہ اسے تعصب کی بناء پر بلاوجہ ختم کر دیا جائے ....! کم از کم میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ ہماری اصل جنگ تو غربت سے ہے۔ ہمیں آزادی اور انصاف کے حصول کے لئے لڑنا

چاہیے----

بچپن کا خواب' اس وقت پورا ہوا جب والد نے مجھے کام کرنے کے لئے کچھ پیسے دیئے۔ پرانے ساتھی مجھ پر ہنستے .... وہ مجھے پنسلیں' ماچس کی ڈبیاں اور تولئے تھوک بازار سے خریدتے' دیکھتے۔ میں نے خوشی خوشی ایک تھالی سجائی' بازوؤں پر تولئے لٹکائے اور سامان بیچنے نکل پڑا۔ بازار کا سب سے زیادہ معروف علاقہ' میں نے کاروبار کے لئے منتخب کیا ـــ بہت جلد ہی مجھے بھاگ بھاگ کر مال فروخت کرنے کی مشق ہوگئی۔ جو لوگ جلدی میں ہوتے' وہ مجھے دھکا دے کر نکل جاتے۔ کچھ لوگ رکتے' چیزیں اٹھاتے' انہیں پرکھتے ـــ ماچس کی ڈبی کھولتے' تیلی دیکھتے' پھر واپس بند کر کے رکھ دیتے اور کہتے .... "اچھی نہیں ہے"۔ کچھ گاہک پنسل اٹھاتے' انگلیوں کے درمیان گھماتے' اوپر کر کے کمپنی کا نام پڑھتے اور واپس رکھتے ہوئے کہتے .... "بالکل بیکار"۔ لوگ کمال بے نیازی سے یہ احساس کئے بغیر چلے جاتے کہ انہوں نے کس بے دردی سے' کسی غریب کا وقت برباد کیا ہے۔ میں مایوس ہوئے بغیر دوسرے گاہک کی تلاش میں چل پڑتا۔

میں اپنے کام سے بہت مطمئن اور خوش تھا۔ محنت سے کمائے ہوئے پیسوں کی سرشاری نے مجھے بازار کے کھانے کی عادت ڈالدی .... والدہ اس بات پر ناراض ہوتیں اور کہتیں .... "کمانے والوں کے بھی گھر ہوتے ہیں' جہاں وہ رات کے کھانے پر ضرور آتے ہیں ...." اس نصیحت کو سننے کے بعد میں نے اپنی آزاد طبیعت پر قابو پالیا اور گھر کا کھانا کھانے لگا۔ ماں بہت کمزور ہوچکی تھیں .... میں حتی الامکان' ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ گھر میں جھاڑو لگاتا' برتن باہر نلکے پر دھوتا۔ ترکاری کاٹتا اور کھانا بھی پکا دیتا ....

آخرکار' میں نے بچت سے' پان کا ایک چھوٹا سا ٹھیلا کرائے پر لے لیا۔ پان کے پتے خریدنے کے لئے مجھے روزانہ سبزی منڈی جانا ہوتا ـــ جس میں صبح کا بیشتر وقت صرف ہو جاتا۔ تازہ پھلوں کی خوشبو' گلے سڑے پرانے پھلوں کی بساند کے نیچے دب جاتی۔ پاؤں' کچلی ہوئی سبزیوں کے گودے پر پھسلتے۔ تیزی سے کام نمٹانے کی تمام کوشش بیکار ثابت ہوتی۔ بھاؤ تاؤ اور رعایت کی غرض سے کوئی اکھڑ اور بدتمیز شخص اپنے آس پاس پورا مجمع اکٹھا کرلیتا۔ گذشتہ روز خریدے گئے گھٹیا مال کے عوض' رقم کی واپسی پر جھگڑا ہوتا۔ سودا لینے کے لئے دھکم پیل ہوتی--- اس سارے ہنگامے کے دوران میں' پانوں کا ایک چھوٹا سا

بنڈل حاصل کرنے کے لئے بے چینی سے انتظار کرتا ..... اور تھک ہار کر ادنیٰ کوالٹی کا سودا لینے پر مجبور ہوجاتا۔

پان کے ٹھیلے پر' میں نے کم سے کم وقت میں بہترین سودا' باندھ کر بیچنے کے فن میں مہارت حاصل کرلی۔ سفید گیلے کپڑے کو کھول کر کمال تیزی سے پان کا پتہ نکالتا' کتھا لگاتا--- اور ساتھ ہی چونے کی ایک لکیر سی کھینچ دیتا۔ ایک چٹکی سونف--- ہلکی سی مقدار میں چکتی ہوئی گلابی خوشبودار چینی اور تھوڑے سے چاندی کے ورق والے الائچی دانے' گلے کو جادو کے اثر سے صاف رکھنے والی ملیٹھی اور باریک کٹی سپاری--- جسے برصغیر کے لوگ بے تکان چباتے رہتے ہیں--- یہ سب ڈالنے کے بعد' میں بڑی نزاکت سے پان کو لپیٹتا اور آرپار ایک لونگ پرو کر گاہک کو دے دیتا ..... ایک منٹ میں تین' تین پان تیار کرلینے کی اس مہارت کے علاوہ اس کام میں کچھ خاص نہیں دھرا تھا۔ گاہکوں کی بے معنی اور فضول گفتگو سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ گڈ مڈ باتوں کا یہ سلسلہ اس وقت ختم ہو جاتا جب وہ کلے کی ایک جانب پان ٹھونس کر اپنی راہ لیتے۔

ان دنوں' صبح اٹھنے پر میرا معمول یہ تھا کہ میں گوالوں سے دودھ لیتا اور لوگوں کے گھروں تک پہنچاتا۔ ایسے میں میری اضطراری کوشش ہوتی کہ راستے کے مناظر اور واقعات کو اپنے ذہن میں جذب کرتا جاؤں اور ان سے سبق سیکھتا جاؤں۔ شوخ اور بھڑکیلے رنگ' اب بھی مجھے بہت بھاتے اور کام کرنے کی قوت بڑھاتے۔ ایک روز اپنی پسندیدہ' سبز رنگ کی قمیض پہنے دوستوں کے اصرار پر سینما گھر جا پہنچا۔ احمد آباد میں دیکھی ہوئی پہلی فلم "پکار" سے مختلف فلم ..... "جھروکہ" کا موضوع برصغیر ہند و پاک کا بٹوارہ تھا۔ تاریک ہال میں سینکڑوں لوگ خاموش اور بے سدھ بیٹھے' مسحور ہوئے جاتے تھے--- وقت کے اس زیاں پر میں بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا ..... جی اتنا اچاٹ ہوا کہ میں نے سینما جانا ہی چھوڑ دیا۔

گھر سے دور' محض تجربے کی خاطر' میں نے بھاول نگر میں کپڑا بیچنے والے ایک تاجر کی ملازمت اختیار کرلی ..... اس دوران گھر کی یاد بہت ستاتی رہی۔ چھ ماہ بعد گھر لوٹا تو ماں کی صحت بری طرح گر چکی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب گھر والوں کی دیکھ بھال کروں

والد کی طرح میں بھی کمیشن ایجنٹ بن گیا۔ والدین کو پیسے دینے کے بعد' باقی بچت اپنے پاس رکھ لیتا۔ چھوٹے بھائی عزیز کی دلچسپی تعلیم حاصل کرنے کی جانب تھی۔ وہ مستقبل میں کسی میدان میں مہارت حاصل کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔ اس کے خواب' مجھ سے مختلف تھے۔ والد دیر سے گھر لوٹتے ..... کبھی کبھار شام اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتے' ایک پتلی سی دری فٹ پاتھ پر بچھا دی جاتی' سب ٹیک لگائے' چائے پیتے اور نئے کاروباری امکانات کے بارے میں سوچتے ..... میں بھی شمولیت کے مواقع ڈھونڈتا' تاکہ بزرگوں سے استفادہ کرسکوں۔

1948ء میں ایک اشتہار کے ذریعے معلوم ہوا کہ میٹھادر میں پہلی مخیر تنظیم کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ بانٹوا کے بزرگ میمن' کمیٹی کے ممبران تھے۔ تنظیم کا نام "بانٹوا میمن ڈسپنسری" رکھا گیا۔ میں نے اپنے دل میں عجیب ہلچل محسوس کی اور فورا" خود کو رضاکارانہ خدمت کے لئے پیش کر دیا۔ وہ آٹھ ممبران' جو کارکنوں کی تلاش میں تھے' میں ان سب میں چھوٹا تھا۔ سینئر ممبروں کو محض کمیٹی کے اجلاس میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ جب برادری کے لوگوں نے والد سے پوچھا ..... "حاجی شکور' اس خیر کے کام میں تمہارا کیا حصہ ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا ..... "میرا حصہ کسی بھی کام یا پیسے سے کہیں زیادہ ہے"۔ پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے جوش سے بولے ..... "میں نے ایک جیتا جاگتا انسان عطیے میں دیا ہے ..... اس کا خیال رکھنا۔"

ان دنوں والد' ایک نئے کاروبار میں ہاتھ ڈال رہے تھے۔ سلسلہ کچھ یوں تھا کہ چھوٹے تاجر' سندھ چاول کارپوریشن کو چاول بیچا کرتے اور اس کے بدلے میں انہیں حکومت کی جانب سے' اگلی تاریخوں میں بھنائے جانے والے ڈرافٹ ملتے۔ چھوٹے تاجروں کو فوری طور پر پیسے کی ضرورت رہتی' والد اپنی جانب سے پیسہ فراہم کرکے کم قیمت پر یہ ڈرافٹ خرید لیتے۔ والد کی طرح مجھے بھی پیسہ بنانے میں ایک عجیب سی مسرت ہوتی ..... اس جذبے کے پیچھے' جستجو یہ تھی کہ سرمایہ کاری کے مزید بار آور طریقے کیا ہوسکتے ہیں ..... بہت جلد میں شیئر سرٹیفکیٹ کی مدد سے ایک چھوٹا سا ذریعہ آمدنی بنانے میں کامیاب ہوگیا جس کے باعث فکر معاش کے لئے کم اور ڈسپنسری کے کام کے لئے زیادہ وقت میسر آگیا۔

صبح کے وقت کپڑے کی دکان پر میرا کام جاری تھا۔ بازار بند ہو جاتے تو میں ڈسپنسری

آجاتا۔ والدہ مسلسل بیمار تھیں مگر میرے بارے میں ہمیشہ کی طرح فکرمند رہتیں۔ جونہی گھر میں قدم رکھتا' وہ مسلسل پوچھتی رہتیں ــــ "تم نے کھانا کھایا کہ نہیں؟" بار بار وضاحت کے باوجود کہ میں نے کھانا کھالیا ہے' وہ کھانا گرم کرکے لے آتیں اور مجھے دوبارہ کھانا پڑتا۔

ــــ یہ بات مجھے گوارا نہ تھی کہ ڈسپنسری' صرف برادری کی فلاح تک محدود رہے۔ میمن برادری کو ایک مشترکہ پروگرام طے کرنا چاہیے تھا ــــ تمام بااختیار لوگ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم ہوگئے اور اپنے ہی اراکین کو بلاشرکت غیرے فائدہ پہنچانے میں سرگرداں نظر آنے لگے۔ اس قسم کے کار بہبود میں بے شمار نقائص تھے۔

میمن برادری سے تعلق نہ رکھنے والوں کو' مفت ادویات حاصل کرنے میں طویل اور صبرآزما مراحل سے گزرنا پڑتا۔ یہ بات مجھے گوارا نہ تھی۔ اسی وجہ سے ساتھی مجھے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایک دن میں نے طے کرلیا کہ ان غیرمنصفانہ ضابطوں کو توڑ دوں گا۔ اس فیصلے نے تمام حلقوں میں شورش بپا کردی ــــ کسی ردعمل کی پروا کیے بغیر ذات' قبیلے سے بالاتر' میں نے تمام ضرورت مندوں کو ادویات فراہم کرنا شروع کردیں۔ جلد ہی میری شکایت' کمیٹی کے بزرگ ممبران سے کردی گئی کہ میں قوانین کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ' تبھی بات کرتا ہوں جب مجھ سے بات کی جائے اور وہ بھی مختصر اور کام کی ــــ بے کار بحث مباحثوں اور تو تکار تو دور کی بات ہے' میرے پاس تو الفاظ کا ذخیرہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے کمیٹی کو ایک بنیادی اصول سمجھانے کی کوشش کی ــــ " جب آپ حاجت مندوں کے درمیان امتیاز برتنا شروع کردیں تو پھر فلاحی کام اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ کسی بیمار شخص کو دوا دینے سے انکار' خواہ وہ کوئی بھی ہو' اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارا سلوک امتیازی ہے۔ اگر اس کارخیر میں ہمارے یہی اطوار رہے تو پھر خود کو' ہمیں اپنے گھروں تک محدود کرلینا چاہیے"۔ ان خیالات نے سننے والوں میں غصے اور ہیجان کی ایک لہر دوڑا دی۔ میں نہ صرف اپنی حد سے تجاوز کرگیا تھا بلکہ ایک ایسی گستاخی کا مرتکب ہوا تھا جس کا سامنا میمن برادری کے بزرگوں کو کم ہی کرنا پڑتا ہے۔

کمیٹی کی اگلی میٹنگ میں چیخ اٹھا ــــ "آخر اس طرح اکٹھے ہوتے رہنے کا مقصد کیا ہے؟

کام تبھی مکمل ہوتا ہے جب اسے کیا جائے ــــ محض باتیں کرنے سے نہیں"۔ اس کے جواب میں کمیٹی والوں نے اپنے مخصوص حربوں سے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کی جس میں ان کے بڑوں نے بھی' ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ڈسپنسری کی بنیاد رکھنے میں میری تمام محنت اور کوششوں کو نظرانداز کردیا گیا اور آفس سیکرٹری نے درخواستوں پر دستخط کرنے کا اختیار بھی واپس لے لیا۔

دوسری جانب ڈسپنسری کے ملازم' بلامعاوضہ ایکس رے کرنے کے لئے چھوٹی موٹی رشوت لے رہے تھے ــــ رضاکار' ضرورت مندوں کو مفت سلائی کی مشینیں اور انڈے فراہم کرنے کے لئے کھلے عام "ٹوکن منی" وصول کرتے تھے۔ سٹاف کے لوگ محض چند گھنٹے ڈیوٹی کے بعد چلے جاتے۔ ادھر میں تھا کہ رات گئے تک کام کے لئے باہر بیٹھا رہتا۔

ایک مرتبہ ڈسپنسری کے سرپرست سیٹھوں نے فلاحی تقریب کا اہتمام کیا۔ ارباب اختیار اپنی اپنی کہہ چکے' تب اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر میں نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی ــــ میری بے معنی اور کمزور حرکت نے' چھوٹتے ہی ایک شدید ردعمل پیدا کیا ــــ سارے مجمع نے مجھے برا بھلا کہا' ایک ایجنٹ تو مجھ پر خوب برسا اور بے دریغ دھاڑا ــــ "تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ بیٹھ جا' ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔" کسی نے مضحکہ اڑایا ــــ کسی نے گالی دی ــــ اب میں کھل کر سامنے آچکا تھا ــــ

سامنے وہ لوگ بیٹھے تھے جن کے بارے میں قائد اعظمؒ نے کہا تھا کہ ان کا وجود پاکستان کی معیشت اور ترقی کے لئے انتہائی اہم اور فیصلہ کن ہے۔ میں نے ایک لمبا سانس لیا ــــ فلاحی کام کے بارے میں ان کے خیالات کی شدید مذمت کی ــــ "بیواؤں اور یتیموں کے سامنے چند ٹکڑے پھینک کر انہیں مفلوج کردیا جاتا ہے تاکہ یہ لوگ ہمیشہ مقروض اور غلام رہیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حالات کے شکار یہ لوگ ہر مہینے' رینگتے ہوئے آپ کے قدموں میں آگریں؟ سلائی مشینیں اور پرانے کپڑے بانٹنے کے لئے تقریبات منعقد ہوتی ہیں' جلسے کروائے جاتے ہیں' جن پر بے دریغ پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ یہ محض خودنمائی اور اپنی ذات کی تشہیر ہے ــــ تاکہ پریس اور اخباروں کے ذریعے لوگ' آپ کو جان سکیں۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ ہر جانب سے جوتوں' کرسیوں اور ڈنڈوں کی بارش شروع ہوگئی۔ سب لوگ مجھے سٹیج سے اتر جانے کا کہہ رہے تھے ــــ پلیٹ فارم سے نیچے' اپنے نوجوان دوستوں کی

جانب دیکھا لیکن وہ سب نظریں چرا رہے تھے۔ میں حیران تو ضرور تھا ۔۔۔ پر میرا ذہن بے عزتی کے احساس سے، قطعی بے نیاز تھا۔ مجھے باہر نکال دیا گیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی گئی کہ آئندہ کبھی ڈسپنسری میں نظر نہ آؤں۔

باہر نکلا تو خوف میں مبتلا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ میری زندگی جہنم بنا سکتے ہیں اور میرے مستقبل میں رکاوٹ کھڑی کر سکتے ہیں۔ اب میں جس راستے سے گزرتا، میمن بچے مجھ پر آوازیں کستے، بزرگ میرے سلام کا جواب تک نہ دیتے ۔۔۔۔

والد نے نصیحت کی ۔۔۔۔ "انہیں نظرانداز کر دو اور اپنی مہم جاری رکھو۔" انہوں نے ایک اور مشورہ دیا ۔۔۔ "ایمان دار لوگوں کو کسی کا مرہون منت نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی شراکت کے کاروبار میں پڑنا چاہیے۔" ان پند و نصائح کو میں نے پلے باندھ لیا۔ اب میرا رویہ تبدیل ہو چکا تھا ۔۔۔ لوگ بھی حیران و ششدر تھے۔

1950ء میں کچھ لوگ میرے پاس ایک عجیب درخواست لے کر آئے۔ ان لوگوں کا ایک بہت ہی پرانا نوکر جس نے ان کی پچاس سال تک خدمت کی تھی، اب قریب المرگ تھا اور اپنے آبائی وطن بہار (انڈیا) واپس جانا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے ہوائی جہاز (برٹش ایئرویز) کے دو ٹکٹ دیئے اور درخواست کی کہ اس بوڑھے نوکر کو بہار تک پہنچا دوں۔ اس کا خاندان، بہار میں کوئلے کی کانوں کے پاس آباد تھا۔ ہوائی سفر کا یہ موقع میرے لئے بہت خوش آئند تھا ۔۔۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ کے مطابق وہ بوڑھا شخص ایک ہفتے تک زندہ رہ سکتا تھا لیکن پرواز کے دوران ہی بے ہوش ہو گیا۔ کلکتہ ایئرپورٹ پر اترتے ہی، میں نے جلدی سے "ریڈ کراس" والوں کا فون نمبر معلوم کیا اور بیمار کو ایمبولینس میں "اسلامیہ ہسپتال" پہنچایا۔ ایمبولینس کو دینے کے لئے میرے پاس پیسے نہ تھے ۔۔۔ میں نے ڈرائیور کو اپنا پاسپورٹ نمبر لکھوایا اور رشتہ داروں کو اس کی حالت سے مطلع کیا۔ علاج کے باوجود ۔۔۔۔ افسوس کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اب میں نے پاکستان واپسی کا سفر شروع کیا۔ کلکتہ سے مشرقی پاکستان تک بذریعہ بس پہنچا جہاں میرا سوتیلا بھائی ایک کمپنی میں کام کرتا تھا۔ بھائی نے ڈھاکہ کی سیر کرانے کے بعد مجھے میمن برادری کی تعمیر کردہ، ایک عالیشان مسجد دکھائی۔ مسجد کی شان و شوکت سے میں متاثر تو ضرور ہوا ۔۔۔ پر بے ساختہ کہا ۔۔۔ "اس قدر غربت کے عالم میں، جب لوگوں کو بنیادی

سہولیات تک میسر نہیں ۔۔۔ اس بات پر بھی زور دینا چاہیے کہ مساجد کے ذریعے لوگوں کی مدد بھی کی جائے۔ لوگ ایسی حالت میں خدا کی رحمت کے حقدار کیونکر ہو سکتے ہیں ۔۔۔[6] بعدازاں میں ہوائی سفر کے ذریعے کراچی پہنچ گیا۔

میمن نوجوان، جنہوں نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا، انہیں یا تو ملازمت سے الگ کر دیا گیا یا کسی بھی میمن کاروبار کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے ۔۔۔ پھر گلیوں محلوں میں، انہیں گالیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ سیٹھ لوگوں کا غصہ اور طیش اب انتہا پر تھا ۔۔۔ اس کے باوجود میں اپنے موقف کی جستجو اور ارادے کی پختگی میں اتنا دور جا چکا تھا کہ اب واپسی ناممکن تھی ۔۔۔۔

1951 کے دوران، جمع پونجی میں سے دو ہزار تین سو روپے کے عوض، میٹھادر کے علاقے میں آٹھ مربع فٹ کی دکان پگڑی پر حاصل کی اور اس میں ڈسپنسری قائم کی۔ تنظیم کا نام "میمن والنٹیر کور" رکھا اور ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبہ بھی رکھ دیا تاکہ آتے جاتے لوگ اپنی ریزگاری اس میں ڈال دیں۔ وقت اور ضرورت کے ساتھ ۔۔۔ میں اس تنظیم میں تبدیلیاں لاتا رہتا۔ میمن نوجوان کثیر تعداد میں میرے ساتھ شامل ہونے لگے ۔۔۔ ڈسپنسری ہر شخص کی ضرورت کو پورا کرتی، دوائیں کمپنی کے نرخوں پر خریدی جاتیں اور مستحقین کو مفت فراہم کی جاتیں۔ چونکہ غریب آدمی کے لئے فیس دینا بہت مشکل تھا، اس لئے ایک ڈاکٹر مستقل رکھ لیا گیا۔ ڈسپنسری کے کام میں ہر طرح کے انسانی مسائل سے سامنا ہوتا۔ ان عورتوں، بچوں کو دیکھ کر میرا دل بہت دکھتا جن کی زندگی، بیماری کے باعث اختتام کے قریب ہوتی۔ لگاتار بچے پیدا کرتے رہنے کے لئے خواتین کو ایک غیر معمولی قوت کی ضرورت رہتی۔ جب عورت گھر کے کام کاج نپٹانے، بچے پیدا کرنے اور انہیں پالنے سے فارغ ہوتی تو اس کی کمر ٹوٹ چکی ہوتی ۔۔۔۔ اس کے بعد وہ اپنے شوہر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک بار پھر ٹوٹنے کے لئے تیار ہو جاتی ۔۔۔ یہ کیا ستم ہے!" لگتا تھا کہ رشتہ ازدواج اب صحت کے لئے ایک خطرہ بن چکا ہے ۔۔۔

ڈسپنسری، ہر روز وقت پر کھلتی۔ مخالف ڈسپنسری سے مقابلے کے خیال سے میں ہمیشہ موجود رہتا۔ سب بازار بند ہو جانے کے بعد بھی ڈسپنسری کے باہر بیٹھا رہتا، پھر وہیں سیمنٹ کے بنچ پر سو جاتا تاکہ رات دیر سے آنے والوں کی بھی مدد کی جا سکے۔ ماں کا شدید اصرار

رہتا کہ میں کھانے اور سونے کے لئے رات کو گھر واپس آ جایا کروں۔ ان کا خیال تھا کہ سیمنٹ کے تھڑے پر سونے سے میری کمر دکھے گی' وہ کہتیں ــــ "اپنے ساتھ ایک دری اور تکیہ ہی لے جاؤ اور دکان میں رکھ چھوڑو" ــــ پر اس کے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی ــــ میں انہیں مطمئن کرنے کے لئے کہتا ــــ "بنچ پر میں بہت آرام سے سوتا ہوں بلکہ زیادہ بہتر نیند آتی ہے"۔ یہ سن کر وہ مجھے حیرت سے تکتیں ــــ

گھر پر ڈسپنسری کا کچھ زیادہ تذکرہ نہ ہوتا ــــ عزیز اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ میرے جنون کا کیا عالم ہے اور میں نے تکلیف اور اذیت کا یہ راستہ کس طرح چنا ہے۔ ہم دونوں مختلف راستوں کے مسافر تھے ــــ پھر بھی مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ مجھے سمجھنے لگ جائے گا اور ماں کی محبت کے جس بندھن نے ہمیں باندھ رکھا ہے' اس کے نتیجے میں ہمارے مابین احترام کا رشتہ بھی' پنپتا چلا جائے گا۔

مشرقی پاکستان کے سفر اور اردگرد کی جارحانہ فضا نے' سیاحت کے شوق کو مزید بھڑکایا۔ یقین تھا کہ کراچی اور بانٹوا سے آگے کی دنیا دیکھنے سے مزید راہیں سمجھ میں آئیں گی ــــ 1956 میں اپنے خواب کی تکمیل کے لئے میں نے مغرب کی طرف سفر کی ٹھانی۔ پہلے خیال آیا' یہ سفر پیدل کروں مگر پھر ایک بس پکڑ لی ــــ راستے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ہم ایران' ترکی' یونان' بلغاریہ اور یوگوسلاویہ سے گزرے۔ امیگریشن کے افسران میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھتے ــــ میرے تھیلے میں جب انہیں کپڑوں کے ایک جوڑے' ایک چادر' کچھ پیسوں اور تھوڑے سے کھانے کے علاوہ کچھ نہ ملتا تو وہ حیرانی سے مجھ پر نظر ڈالتے ــــ سامان واپس تھیلے میں ڈالتے اور جانے دیتے۔ زیادہ تر لوگ مجھے کوئی دربدر غریب مسافر سمجھتے۔ جہاں جاتا' لوگ ترس کھا کر مجھے کھانا یا تھوڑے بہت پیسے دے جاتے جنہیں میں ڈسپنسری کے لئے بچا لیتا ــــ

دوسری جنگ عظیم کے اثرات زائل ہو رہے تھے اور لوگوں میں حالات بہتر بنانے کا جذبہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر میں انسانوں کی ٹریفک کو آتے جاتے دیکھتا۔ لوگ ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے تھے۔ شاید انہیں وقت کی برق رفتاری اور ناپائیداری کا شدید احساس تھا۔ ان کے اس رویے کا تقابل' اپنے ملک کے حالات سے کرتا اور وطن کے لئے کڑھتا جہاں' وقت ایک فالتو اور کبھی نہ ختم ہونے والی چیز ہے۔ وہ

خصوصیات جو ایک قوم کی تعمیر کے لئے ضروری ہوتی ہیں' ان کا ہمارے یہاں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ جس مادر وطن کے قیام کے لئے خون کی ندیاں بہائی گئیں' وہاں اب نہ راستے کا تعین تھا اور نہ ہی میر کارواں کی خبر تھی۔

میں اس گورکھ دھندے کے بارے میں گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ خود غرضی اور موقع پرستی نے ترقی کے تمام فطری راستے مسدود کر دیئے تھے۔ نوٹ چھاپے جا رہے تھے' نئے کاروبار شروع کئے جا رہے تھے' لالچ اور استحصال کا ایک بگولہ تھا جو جنونی انداز سے گھوم رہا تھا ــــ شروع ہی سے زور اس بات پر تھا کہ بڑے افراد اور نامور شخصیات کے بت تراشے جائیں ــــ ایسے لوگوں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی جو ہمہ وقت' طاقت اور اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتی ــــ

یہ ایک کھلا بازار تھا جس میں نہ کوئی ٹیکس تھا اور نہ ہی کوئی قواعد و ضوابط' حکومت نے جب سیلز ٹیکس رائج کیا تو دکانداروں نے ایک روپیہ فی گز کپڑا بیچ کر' بارہ آنے فی گز لکھنا شروع کر دیا۔ محصولات کا نظام ابھی پیدا ہی ہوا تھا کہ اس کی کمر توڑ دی گئی۔ ان لوگوں سے مجھے بہت ہمدردی تھی جو اس نئے دیس کی خوشحالی کے خواب دیکھتے تھے۔ یورپ میں تو سب کچھ مختلف تھا۔ میرا دل پاکستان کے لئے بہت اداس تھا۔ شاید یہاں کے لوگ خود اپنے ہی خلاف کام کر رہے تھے۔ میری نسل کے نصیب میں ایک طرف کمزوری تھی اور دوسری جانب بے بسی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پاکستان کی بنیادوں کو استحکام' محض دو چیزوں سے حاصل ہو سکتا ہے ــــ رہنماؤں کی دور اندیشی اور عوام کی انتھک محنت! اگر ان دونوں پہلوؤں کو نصب العین بنا کر' نہایت سخت کوشی کے ساتھ' ان کے حصول کی کوشش نہ کی گئی تو آنے والی نسلیں' اپنے قدموں کے نیچے پھسلتی ہوئی ریت ہی پائیں گی۔

اٹلی کے شہر روم میں' ریلوے اسٹیشن کے بنچ پر جب میں چادر لپیٹ کر رات گزارنے لگتا تو لوگ ہمدردی میں تھوڑا بہت کھانا یا ریزگاری چھوڑ دیتے۔ ایک صبح سو کر اٹھا تو دیکھتا ہوں کہ میرے جوتے غائب' سخت پریشان ہوا اور سوچا کہ وطن میں ہوتا تو کچھ خاص فرق نہ پڑتا لیکن اٹلی جیسے ترقی یافتہ ملک میں جوتوں کے بغیر چلوں گا تو لوگ مجھے حیرت سے دیکھیں گے اور ــــ مجھے ندامت بھی ہوگی ــــ شکستہ خیالات میں کھویا ــــ دو پاؤنڈ کا ٹکٹ خرید کر کشتی کے ذریعے "ڈوور" پہنچا اور وہاں سے بس کے ذریعے "ہیوسٹن" کی جانب روانہ

ہوگیا۔

سفر کے دوران جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ برطانوی ٹول کا نظام تھا۔ مختلف جگہوں پر ریزگاری کے لئے چھوٹے چھوٹے ڈبے نصب تھے۔ میں ان پہلوؤں میں زیادہ دلچسپی لیتا رہا جنہیں عملی طور پر رائج کیا جاسکتا ہو۔ جب پرانے دوست' صدیق بھائی نے مجھے لندن میں رہ کر کام کرنے کی پیشکش کی تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ..... مجھے وطن کے غریبوں کے لئے بھی کچھ کرنا ہے۔

پیچھے گھر پر یہ حال تھا کہ برادری والوں نے نئے سرے سے یکجا ہوکر' پھر سے سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ عدم موجودگی میں یہ الزام عائد کیا جاچکا تھا کہ میں چور ہوں ..... پہلی ڈسپنسری سے نکال دیئے جانے کی وجہ بھی انہوں نے یہی قرار دی۔ میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے ایک طویل عرصے پر محیط' عزم و ہمت سے کام لینا ہوگا۔

کنجوس سیٹھوں کے خلاف میں نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ وقتاً" فوقتاً" ان کے ایجنٹوں کے استحصال کے مختلف طریقوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتا رہتا جس کے نتیجے میں نوجوان میمن لڑکے' میرے آس پاس اکٹھے ہو رہے تھے۔ میں ان سے کہتا ..... "سیٹھوں کی منڈی غریبوں کی مصیبتوں کو بڑھانے اور ان کی مشکلات کو دائمی شکل دینے سے چمکتی ہے۔ کچھ نسلیں گزر جانے دو پھر یہ امیر خاندان' انہی مشکلات کا سامنا کریں گے۔"

ڈسپنسری کو قائم ہوئے دو سال ہوچلے تھے ..... اس کا نام' جس میں برادری ازم کی جھلک نظر آتی تھی' بدل کر "مدینہ والسیر کور" رکھ دیا اور اسے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ بیرونی ممالک دیکھنے کی تڑپ نے ایک بار پھر مجھے بے چین کیا اور بذریعہ بس ترکی روانہ ہوگیا ..... فرانس سے ترکی تک' ریل کا سفر بھی ایک عجب واقعہ تھا ..... اس دوران ایک ترکی لڑکی ریل میں میری ہمسفر بنی ..... میرے سامنے ایک نازک سی صورت تھی جس کی رنگت بالائی کی سی اور ناک نقشہ نہایت بھلا تھا۔ والد کا خیال تھا کہ ایک دیرپا رشتے کی خاطر یہ سب کوائف اشد ضروری ہوتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار مذاق کرتے ..... "اگر لڑکی کے خدوخال درست نہیں ہوں گے تو تم بہت جلد اس کا تقابل دوسروں سے کرنے لگو گے اور پچھتاؤ گے کہ کہیں غلطی تو نہیں ہو گئی۔ دور کی سوچو' جو عورت جوانی میں خوبصورت ہوگی وہ بڑھاپے

میں بھی بھلی دکھائی دے گی"۔

یہ مسافر لڑکی اور میں' ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے' پھر بھی ہم نے اظہار خیال کی ہرممکن کوشش جاری رکھی۔ سفر ختم ہونے تک' ہماری جان پہچان کی نوبت' ہنسی مذاق تک پہنچ چکی تھی۔ پہلے وہ اپنے تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کامیاب نہ ہونے پر اس نے سارا تھیلا الٹ دیا اور بکھری ہوئی چیزوں میں سے ایک مقناطیس اٹھا لیا۔ اپنی انگلی سے میری آنکھ کی جانب اشارہ کرکے وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ میں بھی جواباً" ہنس دیا۔ ایک اشارہ میرے چہرے کی جانب تھا' سمجھانے کی خاطر اس نے میری ناک کو اپنی انگلی سے چھولیا اور بولی "عرب"۔ میرا چہرہ شرم سے شاید لال ہوگیا ..... اس نے جانچ لیا' اپنی سرخ شال میرے رخسار کے ساتھ رکھ دی۔ یہ سرخی محض چہرے میں دوڑتے ہوئے خون کی جھلک تھی یا پھر محبت کی ایک لہر؟ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی .....! اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم" ..... پھر اپنی جانب اشارہ کرکے کہا "میں" ..... اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں جکڑ کر ہنسنے لگی۔ شاید اس کی مراد شادی سے تھی! ..... اس کھلی دعوت پر میں چونک اٹھا۔ اس سے پہلے مجھے کسی عورت سے ہنسنے بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ آج پہلی بار احساس ہوا کہ میرے دل میں بھی ایک نرم گوشہ موجود ہے۔ یہ اس کی مسکراہٹ تھی جو دل موہ لیتی تھی یا شاید خندہ پیشانی------ اپنی یاداشت کو مزید کرید کر میں نے انگریزی کے کچھ لفظ نکالے اور ساتھ ہی پچھتاتا گیا کہ کاش میں نے بڑوں کے کہنے پر کچھ پڑھ لکھ لیا ہوتا۔ دماغ کی اس چھان پھٹک سے جو چند الفاظ میرے ہاتھ لگے ..... افسوس کہ ان میں سے کوئی کام کا نہیں نکلا۔

اس کے پاس جو چوکلیٹ تھے' ہم مل کے کھاتے رہے۔ اس نے اپنا پتہ دیا اور ملنے کو بھی کہا۔ بچھڑتے وقت میں بہت اداس تھا۔ لیکن یہ بھی خوب سمجھتا تھا کہ کسی بندھن میں بندھ جانے کے لئے محض یہ خوش نظری کافی نہیں۔ زبان' تہذیب اور روایات انتہائی اہم ہیں' جس کے پاس اتنا وقت ہی نہ ہو' وہ کیسے اپنے گھر میں ..... نئے سرے سے سمجھنے' سمجھانے بیٹھ جائے۔

نگری نگری گھومنے کا یہ عارضی جنون' ختم ہوچکا تھا۔ کراچی پہنچا تو ڈسپنسری چلانے کے لئے میرے ذہن میں نئے نئے خیالات تھے۔ دوستوں سے میں نے کہا ..... "تم دیکھنا' ایک

روز میں اسی طرح سڑک کے راستے حج کے لئے بھی جاؤں گا"۔ اس بار انہیں یقین آچکا تھا۔

میٹھادر میں خواتین کی زبوں حالی دیکھتے ہوئے مجھے "میٹرنٹی ہوم" شروع کرنے کا خیال آیا جس کی خاطر ڈسپنسری کے اوپر جگہ حاصل کرلی۔ ایک نرسنگ کورس کا اشتہار بھی دیا۔ بڑے لوگوں کے چمچوں نے میرے خلاف پھر ہتھیار اٹھا لئے۔ اب کی مرتبہ ــــ الزام یہ تھا کہ یہ بدکاری کا ایک اڈہ چلا رہا ہے۔ بے بنیاد الزام تراشی کی اس شرمناک مہم نے میرے عزائم کو مزید پختہ تر کر دیا۔ والد نے سمجھایا ــــ "تمہارا عمل ہی تمہارا سب سے بڑا ہتھیار ہونا چاہیے' یہی چیز انہیں میدان جنگ میں پسپا ہونے پر مجبور کر دے گی۔" بے سروپا مخالفت نے میرے جوش اور قوت کو مزید بڑھا دیا ــــ اب ایک لیڈی ڈاکٹر کی زیرنگرانی میٹرنٹی یونٹ کا آغاز کر دیا گیا۔ ٹریننگ کے لئے درخواستیں دھڑا دھڑ آنے لگیں۔ چونکہ میمن لڑکیوں کو عام طور پر گھر سے باہر مردوں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں تھی' اس لئے نرسنگ کا کام سیکھنے کا یہ موقع یکدم بہت مقبول ہوا۔ شروع میں جو لڑکیاں' ادھر ادھر کی افواہوں کے باعث ہچکچا رہی تھیں ـــ اپنی سہیلیوں اور جان پہچان کی لڑکیوں کو شامل ہوتا دیکھ کر' بے خطر کورس میں شامل ہونے لگیں۔

تین ماہ کے ٹریننگ کورس کے لئے ایک باقاعدہ وظیفہ دیا جاتا' جس کے بدل میں کامیاب نرسوں کے لئے لازمی ہوتا کہ وہ نئی لڑکیوں کو تین ماہ تک پڑھائیں۔ تین ماہ کے بعد انہیں آزادی تھی کہ وہ کہیں بھی ملازمت کر سکتی ہیں۔ اس سے ہمیں بہترین کام مل جاتا اور لڑکیوں کو ایک معاشرتی آزادی میسر آجاتی۔ بچوں کی ولادت کے کیس' دن میں بھی آتے رہتے اور رات میں بھی ــــ محنتی اور ہوشیار لڑکیاں جلد ہی دایہ گیری کا فن سیکھ لیتیں اور بچوں کی پیدائش کے وقت ہاتھ بٹانا شروع کر دیتیں ــــ

دیکھتے' دیکھتے ــــ بوڑھے' نادار اور بیمار بچے ــــ آکر دروازے کے باہر بیٹھنے لگے۔ انہیں عمارت کی کچی چھت کے نیچے پناہ دی جاتی ــــ جو بہت زیادہ بیمار ہوتے انہیں رضاکار' سرکاری ہسپتالوں میں پہنچا آتے ــــ

اب کسی کمیٹی یا بورڈ کا دباؤ نہیں تھا ـــ سارے فیصلوں کا مختار میں خود ہی تھا۔ ان لوگوں کی تلاش میں رہتا جن میں خود سے کام کرنے کی صلاحیت ہوتی اور جہاں سستی'

بیوقوفی' کام چوری اور بہانہ خوری دکھائی دیتی' نکال باہر کرتا۔ کام لینے کے لئے لوگوں پر کڑی نظر اور سخت ہاتھ رکھنا پڑتا۔ یہ وہ کام تھا جس میں کبھی کوتاہی نہیں کی گئی۔ کام کے لئے میرا معیار صرف اچھا نہیں ــــ بہت اعلیٰ تھا ــــ ڈبے سے جو ریزگاری حاصل ہوتی' وہ بہت ناکافی تھی۔ سوچا کہ قربانی کی کھالیں جمع کی جائیں' جس کے لئے اشتہار دیا گیا ـــــ اس طرح لوگوں نے کھالوں کا عطیہ ڈسپنسری تک پہنچانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ہم نے تھوک کے بھاؤ کھالیں بیچنے والے قصابوں سے' کم قیمت پر مال خرید کر مہنگے داموں بیچنے کا کام بھی شروع کر دیا۔

لوگ خدمت کے اس سلسلے کی جانب کھنچتے چلے آرہے تھے جس میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ زکوٰۃ' صدقہ اور خیرات کا سلسلہ بڑھ رہا تھا اور ہم تک پہنچنے والے عطیات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جو لوگ ڈسپنسری میں باقاعدگی سے آتے ــــ اپنی استطاعت کے مطابق پیسوں کے ڈبے میں ضرور' کچھ نہ کچھ ڈال جاتے۔

ادھر میں خیراتی کام سے برادری کی اجارہ داری توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھا اور ادھر ماں روزبروز کمزور اور نحیف ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ پچھلے چار برسوں میں وہ کمزور ہوتے ہوتے اپنے سائے کی مانند ہو چکی تھیں اور ان کا سارا رعب داب اور طمطراق ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہت کم بات کرتیں ــــ بس زیرلب کچھ کہتی رہتیں۔ کبھی ایسے روتیں کہ چپ کرائے نہ بنتی اور کبھی بلاوجہ ہنسنے لگ جاتیں ــــ شاید ان کی اس کیفیت کا باعث' پہلے بچوں سے جدائی ہو ــــ!

والدہ کی بیماری کے دوران ایک اچھوتے پہلو سے میرا سامنا ہوا۔ زیادہ بیمار لوگوں کو ایک سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کی سہولت تقریباً" ناپید تھی۔ پہلی بار والدہ کو ہسپتال لے جانے کے لئے ایمبولینس کا انتظام کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ پورے کراچی شہر میں صرف ایک گاڑی ہے جو "ریڈ کراس" کی ملکیت ہے اور اسے حاصل کرنا آسان نہیں ــــ کئی بار تو میں والدہ کو رکشا میں لے کر گیا۔ رکشا میں ڈالنے کے بعد میں پچھلی سیٹ پر اٹک جاتا اور مضبوطی کے ساتھ انہیں دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیتا ــــ رکشا شور مچاتا' جھٹکے کھاتا ہمیں ہسپتال پہنچاتا۔

ایک روز' ہمسایہ دوڑتا ہوا ڈسپنسری میں آیا اور بتایا کہ سانس اکھڑنے کے باعث' والدہ

گر پڑی ہیں ۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا اور وہ فرش پر بیٹھی برتن دھو رہی تھیں کہ باہر کھیلتے ہوئے چند بچوں نے انہیں گرتے ہوئے دیکھا۔ جب تک میں دوڑتا بھاگتا گھر پہنچا' ان کی سانس اکھڑ چکی تھی اور فالج کے شدید حملے سے' جسم کا بایاں حصہ متاثر ہوچکا تھا۔ والد اور بھائی بھی بے حد پریشان تھے۔ جس عورت نے مجھے جنم دیا' شفقت سے نوازا' اس کی خدمت کرنا میں اپنا اولین فرض سمجھتا تھا' ماں کے لئے یہ سب کچھ غیراہم تھا۔ میں جتنا کہتا کہ ان کا خیال رکھنے میں میرے لئے بے پایاں خوشی اور اطمینان ہے' اتنا ہی وہ بگڑتیں اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں یہی کہتیں ۔ "اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے آزاد کردے' محتاجی کے باعث' تمہیں تکلیف پہنچتی ہے"۔ کبھی پیار سے مناتا' کبھی ڈانٹ بھی دیتا' ایسے وقت میں وہ اپنا دھیان بالکل ہٹا لیتیں اور اپنے ہی خول میں چھپ جاتیں۔ ہر صبح میں انہیں کھانا کھلاتا' ان کے کپڑے بدلتا' دوا دیتا۔ پھر جب تک وہ پرسکون نہ ہو جاتیں' ان کے ساتھ ہی رہتا۔ ماں کی بیماری کے چند ہی ماہ بعد' احساس ہوا کہ روایتی گھردار عورتیں' مردوں کی ذمہ داری ہوا کرتی ہیں ۔ بیمار ہو جائیں تو ذمہ داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ غربت ہو تو یہ صورتحال' ایک بھیانک خواب سے کم نہیں۔ اب میں والدہ کے سرہانے بیٹھا رہتا اور ڈسپنسری کے کام سے' لوگوں کو گھر تک ہی آنا پڑتا۔ والد کے گھر آنے کا وقت ہو جاتا تو ماں' اپنا چہرہ موڑ کر دروازے کی جانب تکتیں' عزیز کے گھر آتے وقت بھی یہی معمول ہوتا۔

میں پرانے وقتوں کے بارے میں ہنسی مذاق کرکے' ماں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ۔ اور باقاعدگی کے ساتھ' منہ ہاتھ دھلاتا۔۔۔ ایک روز میں نے ان سے کہا ۔ "ماں' یاد ہے کہ میں جب بیمار ہوتا تھا تو آپ مجھے نہلایا دھلایا کرتی تھیں۔۔ آج میں بھی وہی کچھ کر رہا ہوں۔۔۔" وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں بالکل چارپائی سے لگ گئیں' اب انہیں غسل خانے تک لے جانا بھی محال ہوچکا تھا۔ حجاب کے کئی ایسے مواقع آئے کہ ان کی دیکھ بھال کرنے' انہیں اٹھانے بٹھانے اور نہلانے میں دقت پیش آئی ۔

ہر لمحہ' مجھے دست بستہ دیکھ کر' ماں کچھ زیادہ بے چارگی اور معصومیت سے دوچار رہنے لگیں۔ وہ اپنے طور پر شرمسار اور اداس تھیں کہ ان کا وجود' بوجھ بن گیا ہے ۔ احساس ہوا کہ اب مجھے' شادی کر ہی لینی چاہیے۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے' سب جانتے تھے کہ میں کسی کاہل عورت کو برداشت نہیں کرسکتا۔ بیوی کی حیثیت میں' ایسی عورت کی

تمنا تھی جو شریک حیات کے علاوہ ۔ کارکن بھی ہو اور' کام سے لگن اور محنت سے انہماک کا اندازہ' میٹھادر کی آزمائش گاہ میں ہوسکے۔۔۔

امینہ' حال ہی میں طلاق حاصل کرنے کے بعد اپنے ایک بچے کو لے کر ہمارے ہاں' کام کر رہی تھی۔۔۔ وہ میٹرنٹی یونٹ میں' جونیئر طالبات کی انچارج تھی۔ اس کے کام میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا رجحان محسوس ہو رہا تھا۔ وہ غریب عورتوں اور بچوں سے خداترسی کے ساتھ پیش آتی۔ وہ ذہین بھی تھی' حاضر جواب بھی' اسے اپنی کارکردگی پر بھروسہ بھی تھا ۔ ناک نقشہ بھی گوارا تھا۔

ایک روز' میں نے اسے دفتر طلب کیا اور سامنے بیٹھ جانے کو کہا ۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شادی جیسے حساس موضوع پر' کچھ کہنے سننے کیلئے شاید مزید وقت درکار تھا ۔ اس دوران' میرا رویہ اس کی جانب عجیب جھکاؤ کا سا تھا ۔ باقی سب لوگ حیران تھے۔

مجھے اپنے آپ سے گلہ تھا کہ میں شادی جیسے ایک عام مسئلے کا ابھی تک جرات مندی کے ساتھ سامنا نہیں کرسکا ہوں۔۔۔ میں نے امینہ کو دوبارہ طلب کیا اور سامنے بیٹھنے کا حکم دیا ۔ اب کی مرتبہ' میں نے بے دھڑک کہہ دیا ۔ "کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟" امینہ' اچانک چونک گئی ۔ صدمہ تھا یا خوشگوار حیرت ۔ جو کچھ بھی تھا اس کے چہرے پر عیاں تھا۔۔۔ وہ صاف جواب دینے کی بجائے گھبراہٹ کے عالم میں ہنس دی اور اپنی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے زیرلب صرف اتنا کہا ۔ "ماں سے پوچھ کر بتاؤں گی" ۔۔۔ جب اس واقعہ کو کافی دن گزر گئے تو خیال آیا کہ اب تک تو' اس نے اپنی ماں سے پوچھ ہی لیا ہوگا؟۔۔۔ گومگو کی اس حالت سے دوچار' اس سے ایک بار پھر ملا ۔ اس نے اوپر دیکھے بغیر' یہ مژدہ سنایا کہ اس کی ماں نہیں مانتی ۔ پھر سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔ "مجھے دینے کے لئے تمہارے پاس کیا ہے؟ ۔ تم مجھے کہاں رکھو گے؟ ۔ تمہاری بیمار ماں بھی تمہارے پاس رہتی ہے اور تم خود ڈسپنسری کے باہر' بنچ پر سوتے ہو۔" ۔ میں جان گیا کہ امینہ' خود ہی انکاری ہے۔۔۔ ماں کا تو فقط بہانہ ہے۔

یہ بات بے حد اطمینان کا باعث تھی کہ عزیز نے لا کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسے ایک لڑکی سے انس بھی ہو چلا تھا۔ والد' شادی کے معاملے میں ہمیشہ آزاد خیال رہے ۔ کہا کرتے تھے کہ وہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس کے فیصلوں میں دوسروں کا عمل دخل

زیادہ ہو۔ شادی کے مسئلے پر والد نے عزیز کے فیصلے کو صاد کرتے ہوئے دعائیں دیں---
ماں اپنی شدید بیماری کے باعث کوئی رائے دینے کے قابل نہ تھیں۔

ہمارے علاقے میں' پہلے داڑھی رکھنے کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ اس وقت سو میں سے دو چار ہی باریش ہوں گے۔ نوجوانی میں ہی داڑھی کے باعث اکثر لوگوں نے مجھے مولانا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے' دل و دماغ سے ان پریشان کن خیالات کو نکال باہر پھینکا کہ محض شادی کے لئے' اپنی شناخت کیوں تبدیل کروں ... سوچا کہ کوئی عورت' میری زندگی میں ہے تو اسے میرے معین کردہ راستوں پر چل کر زندگی گزارنا ہوگی۔

عزیز کی شادی' مسجد میں منعقدہ ایک سادہ تقریب میں ہوئی۔ وہ ایک خوبصورت اور مہربان بیوی کو ماں سے ملوانے لایا ... پھر دونوں ہماری بلڈنگ کے سامنے والے ایک کمرے میں جا مقیم ہوئے۔ اس کے برعکس' گذشتہ دو برسوں میں میرے لئے سات رشتے تجویز ہوئے۔ سبھی نے ایک سا جواب دے کر انکار کر دیا کہ ... میں بہت غریب ہوں یا سخت گیر ... مذہبی خیالات کا آدمی ہوں ... یا پھر بہت کنجوس---- آخری اعتراض بہت زیادہ تھا کہ میں ضروری پڑتال کئے بغیر ایک پیسے کا روادار نہیں--- البتہ ماں کی بیماری پر بغیر کسی چون و چرا کے بے دھڑک پیسہ' روپیہ خرچ کیا۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی شادی کے مسئلہ پر خاموش ہو جانا چاہیے اور موجودہ حالات سے مفاہمت کرلینی چاہیے کیونکہ ہر طرف سے انکار' اس بات کا متقاضی تھا کہ اپنے مقدر پر شاکر رہوں اور ہیجان و اضطراب کو ترک کر دوں۔

ماں' اب کمزور ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھیں اور ان کا وزن اس قدر گھٹ گیا تھا کہ جب میں انہیں نہلانے لگتا تو نقاہت کے باعث سٹول سے گر پڑتیں۔ مجبوراً" ان کے جسم کو گیلے تولیے سے صاف کرنا شروع کر دیا' اسی طرح میں ان کا سر بھی بمشکل تمام دھلاتا ... پھر ان کے بے جان' الجھے ہوئے' ویران بالوں میں کنگھی کرتا اور کمرے کا سارا فرش صاف کرتا ... یہ سارا منظر وہ اپنی بوڑھی آنکھوں کے جھروکے سے دیکھ کر کڑھتی رہتیں' کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ یہ ایک غیر معمولی کام ہے۔

وہ ہر وقت زیر لب اللہ ھو' اللہ ھو ... کا ورد کرتی رہتیں اور بس ...!! میں اپنی ماں کی حالت زار کو دیکھ دیکھ کر اس قدر درماندہ حال تھا کہ ان کے مرنے سے پہلے ہی ان کے ماتم

میں نوحہ کناں تھا ... پھر میری زندگی میں' ایک بدنصیب صبح ایسی بھی آئی کہ ان کی رگ دماغ پھٹ گئی اور پانچ روز تک موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد ... وہ مجھے ہمیشہ کے لئے تنہا کر گئیں۔ جب ہم نے اس معتبر ہستی کو منوں مٹی تلے دفنا دیا تو ماں کے بغیر' گھر جانے کے لئے میرے پاس' حوصلہ نہ تھا۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ سیدھا ڈسپنسری چلا گیا---

ماں' اپنی آخری منزل کو جا چکی تھی--- سو کہانی ختم ... اب' سیلاب غم کو روکنے کی مزید سکت نہ رکھتا تھا--- میں نے' کھڑکیاں اور دروازے اندر سے مقفل کر لئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا---- زندگی کی پوری تاریخ' درد و غم کے روپ میں ڈھل گئی--- چھوٹی چھوٹی ہر بات' خیرات کے پیکٹ اور حصے کا پیسہ نہ ملنے پر پیار بھری ڈانٹ ... اور پھر ان کی دعائیں----- میں ان لمحات کو یاد کرکے رویا جو میں نے ماں کی چارپائی سے لگ کر گزارے تھے ... وہ آنکھوں سے ہمیشہ یہی اشارہ کرتیں کہ مجھے' ان کے پاس ٹھہرنے کی بجائے کام پر چلے جانا چاہیے۔

اپنی ماں کی ہستی اور اس کے تجزیات سے متحرک ہوا تو مجھ میں' پوری دنیا کی کایا پلٹنے کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ ماں نے جانے سے پہلے' میرے دل میں تڑپ پیدا کر دی تھی کہ جس طرح میں نے ان کی خدمت کی ہے---- ویسی ہی خدمت' انسانیت کے لئے بجا لاؤں--- انہوں نے خیرات کے ارفع تصور کے احترام میں شاید مجھے' تمام انسانوں کی خدمت کرتے رہنے کی وصیت کر دی تھی ... اب میرے پاس' لوٹ جانے کے لئے ... کوئی دوسرا راستہ نہ تھا!

"دو پیسے کی سلطنت"



دکھی انسانوں کی فلاح کے لئے، ماضی کی طرح، سڑک کے کنارے بھیک مشن آج بھی جاری ہے



ایک کام کریں ..... نیک کام کریں .....

باب چہارم

غریب آدمی کی وین

کراچی کی ایک بڑی سڑک سے جا ملنے والے ..... کئی چھوٹے چھوٹے راستے تھے ..... میں تنگ اور بے ترتیب گلیوں سے ہوتا ہوا میٹھادر پہنچ گیا۔ گندے اور غلیظ راستے کی اطراف میں بوسیدہ اور بے وضع عمارات' اپنی خستہ حالی کے اعتبار سے ..... ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے مارتے' بکھرے ہوئے کوڑے اور دلدل سے بے پروا اور گندے نالوں سے بچتے بچاتے' نکل رہے تھے۔ میں اپنا سامان نیچے رکھ کر اس پر بیٹھ گیا ..... نئی دنیا میرے سامنے تھی۔

بازار میں زچہ خانے کے اوپر' میں نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ والد تو پہلے ہی جانتے تھے کہ میرے کام کی نوعیت' ایک روز مجھے رہائش تبدیل کرنے پر مجبور کر دے گی ..... جسے وقتی طور پر میری ماں کی علالت نے موخر کر رکھا تھا۔

کمرے کے فرش پر جھاڑو دے کر میں نے اسے اچھی طرح صاف کیا اور کونے میں سادہ سا بستر لگا دیا ..... مختصر سامان میں کچھ برتن' لکڑی سے بنا ہوا ایک چمچ' ایک چھوٹا چولہا' دو پاجامے' تین رنگدار صدریاں' ایک بڑا ٹرانزسٹر اور ایک وہ چھوٹا تخت جس پر ..... ماں کو غسل دیا گیا تھا ..... یہ تھا میرا وہ سب کچھ ..... جس سے مجھے اب نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔

رات کو' میں ڈسپنسری کے دروازے بند کرکے کمرے کی مدھم روشنی میں' بستر پر لیٹ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے سیم زدہ گیلی چھت تھی جہاں سے میلے کچیلے چونے میں لپٹی ہوئی مٹی کی اترن میرے سر پر گر رہی تھی۔ کمرے کے ہر کونے سے اٹھنے والی بساند نے مجھے عاجز کر دیا تھا ..... میں نے اپنے نتھنوں تک کو ڈھانپنا چھوڑ دیا اور ایسی ہی حالت سے دوچار' مستقبل' مقاصد اور مشن کے بارے میں سوچتا رہا ..... کہ اگر بنیادی تبدیلیاں نہ لائی گئیں تو اس عمارت کو زمیں بوس ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا ..... خیال آیا' اس معاشرتی کینسر کا علاج کرنے کے لئے مجھے بدبودار تالابوں کی غلاظت اور گھروں محلوں میں پھیلے ہوئے تعفن کو دور کرنا ہوگا۔ صبح سویرے اٹھا' تو میری نظر سامنے سبز گنبد والی' ایک مسجد پر پڑی جس کے میناروں سے اللہ اکبر ..... کی صدا آ رہی تھی۔ نماز ادا کرنے کے لئے'

نیچے اترا تو یہی خیال میرے ذہن پر حاوی تھا ..... کہ سماجی بہبود کے موجودہ طور طریقوں کو بہرصورت تبدیل کرنا ہوگا۔

اب ڈسپنسری کا چارج میں نے مکمل طور پر سنبھالنے کی ٹھان لی ..... میرے سامنے سنجیدہ اور گھمبیر مسائل تھے ..... یہ وقت صرف معمول کے کام کاج کا نہ تھا بلکہ انسانی ترقی کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کے لئے' دیوانہ وار کام کرنے کی ضرورت تھی ..... ایک طرف تو بے سرو سامانی کی حالت میں سماجی مشن کا آغاز ..... کسی دیوانے کا خواب تھا ..... ادھر لوگوں کا یہ عالم تھا کہ وہ ہاتھوں پر ہاتھ دھرے' مایوس و نامراد ..... کسی غیبی قوت کے منتظر تھے ..... سوچتا تھا کہ ..... یہ جمود کیسے توڑا جائے اور لوگوں کو ان کی صلاحیتیں آزمانے پر کیونکر آمادہ کیا جائے .....؟

کام کرتے ہوئے مہینوں ہو چلے تھے' اگرچہ ڈسپنسری روزبروز مقبولیت حاصل کر رہی تھی' تاہم اس میں جو تبدیلیاں ناگزیر تھیں' انہیں ابھی تک بروئے کار نہ لایا جا سکا تھا۔ ڈسپنسری کی صفائی پر کوئی بھی مامور نہ تھا ..... خودکفالت کے پیش نظر ..... میں یہ کام خود ہی کرتا۔ حالت یہ تھی کہ جس روز میں جھاڑو نہ دیتا' کوئی دوسرا بھی یہ کام نہ کرتا .....

میں نے محسوس کیا کہ ذات پات کو اپنے دھرم کا ضروری حصہ قرار دینے والی ہندو تہذیب نے برصغیر کے مسلمانوں کو بری طرح متاثر کر رکھا تھا حالانکہ اسلام مزدوری و محنت کی توقیر کا درس دیتا ہے ..... اس واضح ہدایت کے باوجود ہم اس کی نفی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم میں سے کم آمدنی والے افراد نے بھی صفائی کے کام پر عیسائی خاکروب لگا رکھے ہیں ..... شاید اس سے' ان کی انا بھی مجروح ہوتی ہو .....! کیا صفائی کا بھی ..... کوئی مذہب ہوتا ہے؟ غلاظت اور گندگی ..... ایک ایسی قدرتی کھاد کا کام دیتی ہے جس کی کوکھ سے شاداب پھول بھی اگتے ہیں .....

یہ سوچ کر میں نے کاندھے پر بیلچہ اٹھایا اور سڑک کے درمیان پڑے گوبر کو ہٹانے چل پڑا۔ جیسے یہ میرا موروثی کام ہو ..... بیلچے سے ساری گندگی ایک بڑی پلاسٹک شیٹ پر ڈالی ..... اس گٹھڑی کو پیٹھ پر لادا اور پرہجوم گلیوں سے ہوتے ہوئے' پھولتی اکھڑتی سانسیں لیتا ..... ایک بڑے گڑھے میں لے جا کر پھینک آیا ..... اگرچہ ایسا کرکے میں نے خود الگ سے گندگی کا ایک ڈھیر لگا دیا تھا ..... اپنے حال میں مست ..... سنجیدہ مسائل سے بے خبر لوگ مجھے دیکھے

بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس سماجی کام میں میری کسی نے کوئی مدد نہیں کی۔ تمام لوگ غلاظت کے اس ڈھیر کے اٹھانے میں بھی اتنے ہی لاتعلق تھے جتنا اس کے لگانے میں — بہرحال مجھ سے 'لگن اور مستعدی کے ساتھ جو بھی بن پڑا' کر دیا —— میں ہر ہفتے عشرے کے بعد لوہے کے ایک ڈنڈے کے آگے جھاڑن باندھ کر نالیوں کو صاف کرتا اور غلاظت سے بھرے ہوئے گٹروں اور گند اچھالنے والے مین ہولوں کو کھول کر رواں کرتا——— میں منتظر رہا کہ شاید کوئی — صفائی کا کام کرتے دیکھ کر مجھے شاباش دے لیکن اپنی دھن میں مگن — مصروف لوگوں نے — مجھے ہلکی سی ایک تھپکی کے قابل بھی نہ سمجھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ 'گندگی کے ڈھیر یا اس کی جگہ صفائی دیکھ کر — دونوں صورتوں میں لاپرواہ تھے۔

میٹھادر کا علاقہ اب میری اعصابی آزمائشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا — اگر بند نالیاں گندے پانی سے بھر جاتیں تو میں سارے کام چھوڑ کر ازخود معاملات درست کرنے میں لگ جاتا۔ خاکروب کی حیثیت سے ہر لمحہ کام کرنے پر آمادہ رہنے لگا تھا۔ لوگ مجھ پر تنقید کرتے کہ میں کوئی سماجی خدمت نہیں کر رہا بلکہ مجھے تو صفائی ستھرائی کا ایک جنون سا ہوگیا ہے۔ میرا جواب یہی ہوتا —

"کیا صفائی اسلامی اصولوں کے عین مطابق نہیں ہے؟ ایک حدیث میں تو صفائی کو نصف ایمان کا درجہ دیا گیا ہے"۔

لیکن معترضین میرا یہ کہہ کر مضحکہ اڑانے کی مشق جاری رکھتے کہ

"حاجی عبدالشکور کا بیٹا کمین ہوگیا ہے۔ پرلے درجے کا خاکروب!"

کراچی میں نئے سرے سے تعمیر ہونے والی عمارات کا ایک جال بچھ رہا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ اپنی ہڈیوں اور سانس کی آزمائش کروں۔ سر پر لکڑی کے وزنی بورڈ' پیٹھ پر سیمنٹ کے توڑے اٹھائے اور ریت بھرے ٹھیلے چلائے — جن پر اینٹوں کے انبار اس لئے لگا دیئے جاتے کہ ان کی ڈھوائی کے لئے ٹھیکیدار پر پیسوں کا اضافی بوجھ نہ پڑے۔ میں جسم کو تھکا دینے والے اس کام کے ساتھ اس سوچ میں بھی غلطاں رہتا کہ اصلاح احوال کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے اس ریت اور سیمنٹ ملے مصالحہ کو کہاں سے لاؤں جس سے کبھی نہ گرنے والی انسانی وقار کی عمارت کھڑی کی جاسکے۔ میں نے ملبے کے ایک ڈھیر پر بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روٹی کے دوچار لقمے توڑے اور پھر آجروں کے خلاف ان کی لمبی

چوڑی شکایات سنتا رہا — محنت کشوں کی زندگیوں میں ایک ان دیکھا خلاء تھا۔

میرے دوست اور واقف کار شروع شروع میں میرے خیالات و بیانات سن کر متحیر ہوتے اور پوچھتے —

"ستار بھائی! تم جو سانے خواب بانٹوا میں دیکھتے تھے' وہ کیا ہوئے؟" —— دوڑ شروع ہوچکی تھی اور میں ابھی تک پہلی لکیر کے نشان پر کھڑا تھا — ساتھیوں میں سے کچھ نے تو سرکاری نوکریاں کرلی تھیں' کچھ پرائیویٹ اداروں میں ملازم ہوگئے تھے۔ باقیوں کے مالی حالات ہی اتنے اچھے تھے کہ انہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' سماجی بہبود کا کام میرے لئے — زندگی کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض دوستوں نے صاحبان ثروت و استطاعت سے مدد لینے کا مشورہ دیا جسے مسترد کرتے ہوئے — میرا جواب تھا — "کسی حالت میں بھی سماجی بہبود کے کلب میں شامل نہیں ہوں گا۔ کسی طرح کی نمود و نمائش' ہرگز نہیں' کبھی نہیں — اسی طرح ادارے کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا جب لوگ اپنے لئے بہبود کے راستے خود ہی چن لیں گے۔ اپنے کام کا آغاز نہ ہی تو اوپر سے' نہ درمیان سے بلکہ قطعی طور پر نچلی سطح سے کرنا ہوگا"۔

اب ڈسپنسری کے اوپر میں نے ایک بینر لٹکا دیا۔ بالکل اسی طرز کا بینر جیسے برطانیہ کے ایک گرجا گھر پر آویزاں دیکھا تھا — جس کے ذریعے لوگوں سے عطیات کی اپیل کی گئی تھی۔ اس بینر پر ڈسپنسری کا اکاؤنٹ نمبر ان دعائیہ الفاظ کے ساتھ درج کر دیا گیا تھا —

"انسانیت کے نام پر جو دے — اس کا بھی بھلا — جو نہ دے — اس کا بھی بھلا"۔

سماجی بہبود کے میدان میں یوں کھل کر آجانے سے سیٹھوں کے حاشیہ برداروں میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے ہر طرف خطرے کی گھنٹی بجاکر الارم کی سی کیفیت پیدا کر دی۔

"تمہاری دی گئی خیرات کو ایدھی اپنی ذات پر خرچ کرتے ہوئے عیش کرے گا — اس کا کام عنقریب ٹھپ ہو جائے گا۔"

میں ان الزامات سے کبھی پریشان نہیں ہوا — کامل یقین تھا کہ — سانچ کو آنچ نہیں — اسی عقیدے کو لئے — پورے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھتا رہا——

میں نے اپنے حاسدوں کو دیکھتے ہوئے ایک فیصلہ تو یہ کیا کہ خیرات دینے والوں میں

اعتماد قائم کرنے اور شکوک و شبہات رفع کرنے کے لئے ۔۔۔ سماجی بہبود کی نفی کرنے والی ہر چیز کو ختم کر دینا چاہیے' اب ۔۔۔ ٹرانزسٹر پر گانا سننا بھی بند کر دیا اور خود کو باور کرایا ۔۔۔

"موسیقی نہ ہی تو تمہارا موضوع ہے اور نہ ہی منزل مراد۔۔۔۔"

مجھے اپنے دادا کی طرح اپنی ذات کے لئے فالتو اور بیکار اشیا سے نفرت تھی۔ سبز اور سرخ رنگ کے کرتوں کو میری ماں نے بڑے چاؤ سے سیا تھا' میں نے انہیں ایک گداگر کے حوالے کر دیا۔ مجھے اس کا ذرہ بھر افسوس نہ ہوا کیونکہ یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں۔ سلیٹی اور ملیشیا رنگ کے لباس پہننا شروع کر دیئے جو بعد میں میری شناخت بن گئے۔ موسموں کی شدت کو اس طرح برداشت کرنے کی عادت ڈال لی کہ پھر کبھی بھی مشکل سے مشکل وقت کا سامنا کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ایک روز اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا کھانا کئی دنوں تک کھاتا رہتا اور یہ بھی نہ سوچتا کہ دیر تک پڑے رہنے سے اس کی کیا حالت ہو چکی ہوگی۔ شاید ۔۔۔ مصنوعی عادات' انسان کو عام زندگی میں حریص و محتاج بنا ڈالتی ہیں اور جب اسے اپنی خواہش کے مطابق کوئی شے دستیاب نہیں ہوتی تو وہ ہمیشہ دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔

دوستوں کے محدود حلقے میں اعلان کیا کہ آج کے بعد میرے باطن و ظاہر میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ وہی کچھ نظر آؤں گا جو اصل میں ہوں۔ تضادات سے بچنے کے لئے اپنی ذات پر کچھ بھی خرچ نہیں کروں گا میرا گھر سب کے لئے کھلا رہے گا۔۔۔۔

1957ء کے دوران ملک بھر میں جان لیوا ۔۔۔ "ہانگ کانگ فلو" کے باعث ہزاروں لوگ بیمار پڑ گئے اور سینکڑوں لقمہ اجل بن گئے۔ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ دستیاب وسائل اور تجربے میں کمی کے باعث مجھے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے لیکن ۔۔۔ میں نے ساحل کی تمنا کئے بغیر کشتی کو دریا میں ڈال دیا۔ ادھار پر لئے گئے خیمے متاثرہ علاقوں میں نصب کر دیئے گئے۔ تنہا ملیر میں جس کی کچھ اتنی زیادہ آبادی نہ تھی' تیرہ امدادی کیمپ لگائے گئے۔ گذشتہ دو برس کے دوران جن رضاکاروں کے نام رجسٹر میں ریکارڈ تھے' ان میں سے کچھ کو فرائض سونپ دیئے گئے۔ کیمپوں پر اچانک بیماری پھیل جانے کے خوف سے حفاظتی ٹیکے' دوائیاں اور ہر کیمپ کے باہر عطیات کے لئے ٹین کے ڈبے بھی رکھوا دیئے گئے۔

انسانوں کے جم غفیر میں سے کچھ بے حد مایوس تھے اور کچھ مطمئن' جنہوں نے اس

متعدی آفت سے بچنے کے لئے پیش بندی اور احتیاط کی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے جن کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور جن کے چہرے بیماری کے ابتدائی حملے کی حدت سے تمتما رہے تھے' انہیں پریشان حال ماؤں نے اٹھا رکھا تھا۔ بچے بخار کی شدت سے بے تحاشا چلا رہے تھے۔ بیچاری مائیں خود بھی کھانستے کھانستے بے حال ہو رہی تھیں۔ بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگ دیواروں کے سائے تلے بیٹھ کر آہ و زاری میں مصروف تھے۔ وہ بستی چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ باہر جاکر مر جائیں گے حالانکہ موذی مرض انہیں اپنی گرفت میں پہلے ہی لے چکی تھی ۔۔۔ علاج میں تاخیر یا قطعی طور پر دوا نہ ملنے کی وجہ سے بہت سارے لوگ ہلاک ہوگئے۔

میٹھادر سے باہر ۔۔۔ یہ پہلا ۔۔۔ بڑا سماجی کام تھا جس سے عوامی سطح پر پہلی مرتبہ ادارے کی شناخت ہوئی اور خراج تحسین پیش کرنے کے لئے لوگ خودبخود اکٹھے ہوگئے۔۔۔ اس ناگہانی آفت کے دوران ہماری کارکردگی کو نزدیک سے دیکھتے ہوئے ایک کاروباری میمن نے ڈسپنسری کے لئے بیس ہزار روپے بطور عطیہ دیئے ۔۔۔ اسی شام کام میں سرعت پیدا کرنے کے لئے ایک پرانی وین خرید لی گئی۔ اگرچہ خستہ حالت میں تھی ۔۔۔ تاہم چلتی تو تھی ۔۔۔ ایک دوست نے گاڑی کے دونوں طرف "غریب آدمی کی وین" ۔۔۔ کے الفاظ لکھوا دیئے جو واقعی حسب حال تھے ۔۔۔ "موبائل وین" آنے سے ہم سب' پہلے سے زیادہ فعال ہوگئے۔ جہاں جہاں بھی ضرورت پڑتی' تیزی کے ساتھ پہنچتے ۔۔۔ جیسے خواب ۔۔۔ شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہو۔! یہ وہ وقت تھا جب سرکاری ہسپتالوں کے پاس کل پانچ ایمبولینس گاڑیاں تھیں جن کی پیشگی بکنگ کرانا پڑتی ۔۔۔ لوگوں نے کسی سانحہ کے رونما ہوتے ہی ہمیں مطلع کرنا شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے پولیس بھی مدد طلب کرتی۔ حتی المقدور کسی کو انکار نہ کیا جاتا۔ اگرچہ بعض اوقات ہمیں جائے حادثہ پر پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ۔۔۔ پھر بھی پہنچتے ضرور۔ ایسی صورت میں جب ایدھی سروس کے سوا کوئی دوسری موجود نہ ہوتی' ہمیں قابل ستائش خدمت کرنے کا موقع مل جاتا' یوں ہم ہر بار سرخرو ہو کر نکلتے۔

کبھی کبھی حال یہ بھی ہوتا کہ میں پھیروں کے دوران ڈسپنسری کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا رہتا۔ زبانی کلامی ادویات کی فہرست بناتا اور خیال ہی خیال میں حاجت مند لوگوں کو ٹیکے لگاتا ۔۔۔ پھر اس سوچ سے اچانک باہر نکل کر عملی کام میں مصروف ہو جاتا۔ زخمیوں

کو ہسپتال پہنچانا، مرنے والوں کی میتوں کو تدفین کے لئے ان کے ورثاء تک پہنچانا، میتیں لے کر متعلقہ تھانوں اور ہسپتالوں تک بھی بھاگنا۔۔۔

ایک مرتبہ، ایسی ہی کیفیت سے دوچار تصور کیا کہ ایدھی ایمبولینس گاڑیوں کے ساتھ ساتھ ایدھی ہیلی کاپٹر بھی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ خراب و خستہ حال ایمبولینس چلاتے ہوئے، اس طرح کا خواب، ہوائی قلعہ تعمیر کرنے کے مترادف تھا۔ مستقبل میں اس کی تعبیر کے لئے، اسے اپنے ذہن کے کسی حصے میں محفوظ کرلیا۔

اب میں ایک ایسے سماجی عذاب کو دیکھ رہا تھا جس نے پورے ملک کو ایک شرمناک نرغے میں لے رکھا تھا اور جس کا مداوا میری ڈسپنسری کے بس کا روگ نہ تھا۔ کراچی شہر کی مجموعی کیفیت یہ تھی کہ ...... زندگی کی لذت سے محروم لوگ، دہکتے سورج کے نیچے، بے سائباں پڑے تھے۔ بے بس ماؤں نے معصوم اور برہنہ پا بچوں کو کانپتے ہاتھوں اور منتوں سماجتوں کے ساتھ گدا مانگنے، پرہجوم سڑکوں پر دھکیل دیا تھا۔ اندھے، اپنے ہاتھوں میں چھڑیاں اٹھائے، ٹریفک کے اژدھام سے بچتے بچاتے، چیتھڑوں میں ملبوس بچوں کو اپنا رہبر بناتے ہوئے حمد و نعت کا ورد کر رہے تھے اور بے دست و پا بچے، سٹریٹ ٹریفک کے بیچوں بیچ، لوگوں کے التفات سے محروم، ادھر ادھر گھسٹ رہے تھے۔ فٹ پاتھوں پر بیٹھے بوڑھے، اپنے سامنے خالی کشکول رکھے، خیرات کے منتظر تھے۔

میں نے سوچا کہ حکومت کو اس صورتحال کا احساس کس طرح دلایا جائے؟ ...... سرکاری حکام ان راستوں پر سے کم ہی گزرتے تھے۔ انہیں دوسروں کی تکلیف کا احساس کیسے ہوتا....!

والد نے پرانے گھر میں رہائش جاری رکھی۔ اپنے کاموں میں مصروف رہتا تھا پر، اس اکیلے کمرے میں اپنے آپ کو بے حد اداس محسوس کرتا تھا جہاں اب مجھ پر واری صدقے ہونے والی اور دعائیں دینے والی ماں بھی نہ تھی۔ والد نے میٹھادر میں خود آکر ملنے کا معمول بنالیا تھا۔ وہ چھاپہ گلی، جوڑیا بازار، نیپئر روڈ اور جونا مارکیٹ کے راستے گزرتے، ملاقات کو آجاتے۔ جب انہیں سیاہ شیروانی میں ملبوس سر پر سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں چھڑی اٹھائے گلی میں سے آتے دیکھتا تو ان کے احترام میں سارے کام چھوڑ کر پہلو میں آ بیٹھتا۔ پرسش احوال کے ساتھ ساتھ وہ میرے کام اور اس میں مزید سرمایہ کاری کے بارے

میں سوال کرتے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور تھوڑی دیر بعد مجھے دعائیں دیتے ایک بار پھر جانے پہچانے راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے۔ والد جب بھی ملتے، ہمیشہ میرے حوصلوں کو پھر سے ترو تازہ کر جاتے۔

عزیز اور زبیدہ ابھی تک سامنے والی بلڈنگ میں ہی رہتے تھے۔ ابا گھر میں تنہا رہتے اس لئے زبیدہ ہی ان کے کام کاج نپٹایا کرتی۔ میں، عزیز کے پاس جاکر کسی کام کے سلسلے میں معاونت طلب کرتا، وہ ہمیشہ سیدھے ماتھے سے کام کر دیتے لیکن انہیں طریق کار سے ہمیشہ اختلاف رہا۔

ڈسپنسری پر ہم لوگوں کو طبی سہولتیں دینے کے قابل ہو چکے تھے۔ درمیانے طبقات نے ہمیں خوراک اور پرانے کپڑے حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لئے بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ آمدنی کا بڑا ذریعہ صدقات کی صورت میں ملنے والی جانوروں کی کھالیں تھیں۔ عام طور پر عطیات غریبوں کی جانب سے ہی آتے جو بڑھتے ہوئے اخراجات کے لئے ناکافی ہوتے۔ مجبوراً" اکثر ذاتی اکاؤنٹ سے رقم نکلوانا پڑتی۔ دوسری جانب ڈسپنسری وین ہمارے کام کے لئے ایک چلتے پھرتے اشتہار کا کام دے رہی تھی، جو بھی اسے دیکھتا، دوسرے کو بتاتا کہ یہ وین کس کی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ اس طرح تنظیم شہر تا شہر روشناس ہو چکی تھی ...... نتیجے کے طور پر، عطیئے میں ایک روز تین لاکھ روپے کی خطیر رقم ملی جس سے ایک پرانی ایکسرے مشین خریدی گئی۔ تھوڑا خرچ کرکے ڈسپنسری کو بھی کشادہ کرلیا گیا۔۔۔ مریضوں کے جزوقتی معائنے کے لئے دو ڈاکٹروں کی خدمات بھی حاصل کرلی گئیں۔

"غریب آدمی کی وین" صوبے کے طول و عرض تک لے گئی اور معاشرتی بربادیوں، دکھوں اور دور دور تک پھیلے ہوئے کرب کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا ...... جہاں جہاں گیا۔۔۔ دور افتادہ صحراؤں، سڑکوں کے کنارے اور کھیتوں میں ایسے ہی دلگداز مناظر نے آن گھیرا۔۔۔ وہی محرومیاں، وہی ذلتیں اور وہی رسوائیاں ۔۔۔ جو میری ماں کے عہد میں بھی تھیں۔۔۔!

ان مناظر نے ہمیں پہلے سے زیادہ متحرک اور فعال کردیا۔

اندر ہی اندر کڑھتا ...... مصیبت کی اس گھڑی میں حکام اور اہلکار کس مقصد کے لئے جمع ہیں؟ وہ کس کی خدمت پر مامور ہیں؟ ... قومی سرمایہ کہاں ہے؟ ... کیا وہ سرکاری گاڑیوں پر خرچ ہو رہا ہے یا اسے عیش و عشرت پر اڑایا جا رہا ہے؟ ... اگر ایسا ہے تو پھر

بے یار و مددگار لوگوں کا کیا بنے گا----!! اندرونی کرب کے باعث ــ احساس تک نہ رہتا کہ صدر کون ہے یا ملک پر کس سیاسی جماعت کی حکمرانی ہے۔ بہرحال' حکومت جس کے پاس بھی ہے' سوچتا کہ کیا وہ ناتمام و ناکارہ ہے۔

حکومت کی جانب سے کسی قسم کی مالی اعانت سے مایوس ہونے میں کچھ ماہ لگے۔ وقت بے حد کم تھا۔ فٹ پاتھوں پر پڑے ہوئے اپاہجوں' مزاروں' درگاہوں میں لیٹے ہوئے ذہنی مریضوں اور سیمنٹ کے بڑے بڑے پائپوں میں پناہ گزین بوڑھوں کو دیکھتے ہوئے' فوری طور پر' زچہ خانے کے عقب میں دو بڑے ہال' تین برآمدے اور چار کمرے کرائے پر لے کر انہیں ٹھکانہ فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

سیٹھ لوگ' ایک بار پھر میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ــ

"دیکھو' اس شخص نے غریبوں کو کس ابتر حالت میں ــ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے ــ یہ تو محض دکھاوا ہے"۔

ان احمقانہ اعتراضات نے مجھے سیخ پا کر دیا--- میں نے الٹا ان کو کوسنا شروع کر دیا جنھوں نے سیٹھ لوگوں کے یہ ریمارکس مجھ تک پہنچائے تھے۔ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا تھا ــ ایک فٹ پاتھ---- کنکریٹ کا ایک پائپ ــ غلیظ ڈھیروں سے خوراک کی ترسیل---- اگر یوں نہیں تو بڑے بڑے سیٹھ ان لوگوں کو اپنے محلات میں لے جائیں اور انہیں وہاں بسالیں۔ اگر یہ لوگ ان مفلسوں' ناداروں اور زندگی کی سہولیات سے محروم' انسانوں کو اپنی امارت میں سے کچھ نہیں دے سکتے تو ان کے ساتھ شریک غم ہونے پر اعتراض کیوں کرتے ہیں ــ؟

شروع میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ خیرات کے بنیادی خدوخال کو پامال کر دیا گیا ہے۔ میرے صبرآزما اور مشکل کام کے نتائج نے فروغ بہبود کے حوالے سے مزید رکاوٹوں کو بے نقاب کر دیا۔ اکثر لوگ تو انسانی زندگی سے بیزار اور متنفر تھے ــ باقی خدا ترس' سماجی کارکن بھی کام کرنے کے بعد ہاتھ جھاڑتے' یوں چل دیتے جیسے بیمار جسموں کی بدبو ان کے دلوں میں داخل ہوگئی ہو ــ حالانکہ انسانی مصائب ختم کرنے کے لئے تو ذہنی احساسات سے بلند ہوکر سوچنے کی ضرورت تھی ــ آگے بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی سنگدلانہ رویہ تھا۔ ہماری صفوں میں گنتی کے چند افراد ہی ہوں گے جنھوں نے بیماروں اور ذہنی مریضوں

کی دیکھ بھال اور بو محسوس کی ہوگی۔ کتنوں نے جلی ہوئی لاشوں کا سامنا یا مردہ انسانی اعضا کو ہاتھوں میں لے کر ان کا لمس محسوس کیا ہوگا----!! آیئے شمار کریں ایسے انسانوں کا جنھوں نے کھیل کود کے دوران اونچی چھتوں سے گر کر مرجانے والے بچوں کے لہولہان اور مسخ چہروں کو دیکھا ہوگا اور کتنی تعداد ہے ان افراد کی جنھوں نے تنگ و تاریک گھروں میں رہنے والے متعدی امراض سے نڈھال' کھانستے اور ایک دوسرے پر تھوک چھینکتے لوگوں پر ایک نظر ڈالی ہوگی۔ یہ ایک ہولناک اور خوفزدہ کرنے والی ایسی دنیا تھی جہاں کوئی شخص رہتا تو کجا' اس میں تنہا گھومنے پھرنے کا حوصلہ بھی نہ رکھتا تھا۔ میرا بھی اس دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔ میرے اعمال کا انحصار تو میرے اس فریضے پر تھا کہ معاشرے میں پائے جانے والے بنیادی نقائص کو دور کرسکوں۔

میں نے ایک بار پھر ہوائی قلعہ بنایا اور انسانی نفسیات کو تبدیل کرنے کی جنوں سامانیوں نے میرے ذہن کو غیرمربوط خیالات کے بوجھ تلے دبوچ لیا ــ وہ کیا طریق کار ہے کہ انسانوں کے موجودہ رویوں میں انقلاب بپا کرکے انہیں اعلیٰ انسانی قدروں سے روشناس کرایا جائے ــ ذاتی مفاد کے لئے سرگرداں رہنے والوں کو باعمل کردار ادا کرنے پر کیسے راغب کروں---! تہی دستی کی اس حالت میں کتنے لوگوں کو آسودگی میسر آسکے گی---؟

رات آتی تو اپنے حصے کی تھوڑی سی نیند کے دوران اس زہر کا تریاق سوچتا رہتا۔ یہ سارا تانا بانا سورج طلوع ہوتے ہی ادھرادھر بکھر جاتا۔ اب میں نے اپنے سرہانے ایک نوٹ بک رکھنا شروع کر دی تاکہ اپنے خواب لکھ لیا کروں۔

انسانی فلاح کا کوئی منصوبہ اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو عبور نہیں کرسکتا اور ہر وہ کام جسے بے ترتیبی سے شروع کیا جائے گا وہ نیچے سے سرکتی ہوئی ریت پر کسی فلک بوس عمارت کی تعمیر کے مترادف ہوگا ــ

اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے میں تمام مشکلات کا جواب مل گیا کیونکہ معبود حقیقی کی بارگاہ میں جھکنے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے سے ایک ایسی کیفیت میرے ہاتھ لگی جس نے انسانوں کے خلاف نفرت و حقارت سے ہمیشہ باز رکھا اور انسان دوستی کے راستوں پر چلتے رہنے کی توفیق عطا فرمائی---- مذہب اور خدمت خلق کے سوتے ایک ساتھ پھوٹتے ہیں۔ میں کوئی مبلغ تو نہ تھا تاہم لوگوں کو بہرطور انسانی خدمت کے راستے پر

لانے کی ضرورت تھی۔ میٹھادر سے اس کام کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ سمندر سے گلی سڑی لاشوں کو نکالا۔ ایسی سیاہ اور پھولی ہوئی لاشیں جو ایک بار چھونے سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ کنوؤں اور سرراہے گڑھوں میں سے---- مردہ لاشوں کو مین ہولوں اور گٹروں میں سے بھی نکال کر لایا جنہیں ان کے لواحقین تک نے فراموش کر دیا تھا۔ حالات زمانہ کے ہاتھوں صفحہ ہستی سے مٹ جانے والی ان لاشوں کو اسی احساس ذمہ داری کے ساتھ غسل دیا جیسا اپنی مرحومہ ماں کو دیا تھا--- میتوں کو کافور لگایا' کفن پہنائے اور دائمی آرامگاہوں میں لے جاکر دفن کر دیا۔

میری اس کارکردگی کو دیکھ کر میٹھادر کے "شرفا" نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اعتراض یہ تھا کہ میں نے اپنے کام سے' سارے علاقے کو متعفن کر دیا ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا ـــ

"تم لوگ تو گندگی اور غلاظت کے عادی ہو چکے ہو ـــ تمہیں ان لاشوں کی سڑاند سے گھن محسوس نہیں کرنی چاہیے----! سوچو ـــ اگلی مرتبہ ان کی جگہ تم یا تمہارے جیسا کوئی بھی ہو سکتا ہے"۔

کراچی کے مضافات کے خشک اور اندھے کنویں میں پڑی لاش کو باہر نکلوانے کے لئے کچھ افراد آئے۔ پتہ چلا کہ وہ اس لاش کے بھائی اور قرابت دار تھے۔ جاکر دیکھا تو کراچی کے موسم گرما کی تمتماتی دوپہروں نے لاش کو جھلس کے رکھ دیا تھا ـــ بدبو نے آس پاس کی فضا بھی متعفن کر دی تھی۔ تجربے نے بتایا کہ لاش ہفتے عشرے سے کنویں میں پڑی ہے۔

اس منظر کو دیکھنے' علاقے کے لوگ اور مرنے والے کے لواحقین کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ خاندان والے اگرچہ مرنے والے کی حالت زار دیکھ کر بے حد رنجیدہ تھے لیکن یہ بھی تھا کہ انہوں نے لاش کی بو سے بچنے کے لئے چادروں سے اپنے ناک ڈھانپ رکھے تھے۔ میں نے گہرائی میں اتر کر لاش کو نکالا اور اس پر جن کیڑے مکوڑوں نے لیپ کر رکھا تھا' انہیں صاف کیا اور جب لاش دفنانے چلا تو ایمبولینس میں رکھے اس جنازے کے پیچھے لوگ بھی چل پڑے۔ دفناتے وقت بھی صرف ایک خدمت گزار قبر کے نزدیک تھا ورنہ خاندان برادری کے لوگ اس وقت آگے بڑھے جب میت کو ڈھیروں مٹی تلے دبایا جانے لگا۔

کام ختم ہو چکا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا ـــ

"تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟-----

میں نے سب کچھ بتا دیا---

خاتون شکرگزار تھی کہ اس کا بیٹا عزت و آبرو کے ساتھ دفن ہو چکا ہے۔ بوڑھی اماں نے مجھے ڈھیر ساری دعائیں دیں-----

"خدا تمہیں اس نیکی کا اجر دے"-----

میں نے اس سے درخواست کی کہ دعا کرو ـــ خدا مجھے اس نفرت و حقارت کو مسخر کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کے باعث لوگ اپنے پیاروں کے چہرے تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے-----!

ڈسپنسری میں اب ٹیلیفون کی سہولت بھی میسر تھی جس نے کام دوچند کر دیا۔ دن بھر واقعات و حادثات کی اطلاعات کا تانتا بندھا رہتا۔ کہاں کا آرام اور کہاں کی نیند ـــ بات کرنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ حادثات میں جو لوگ مرجاتے' سو مرجاتے ـــ ہماری نگاہیں زخموں سے نڈھال اور درد سے کراہتے ہوئے ان زخمیوں کو تلاش کرتیں جنہیں فوری طبی امداد سے بچائے جانے کے امکانات موجود ہوتے۔ کراچی پولیس بھی ٹریفک حادثات کی صورت میں رابطہ کرتی۔ کئی مرتبہ یوں بھی ہوا کہ پوری رات سمندر سے لاشیں نکالنے اور انہیں دفنانے میں گزار دی۔

سمندر بھی ایک اعتبار سے دارالعلوم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے رویئے انسانی مزاج سے ملتے جلتے ہیں۔ حد نظر سے بھی آگے تک وہی وسعت آب و سراب کا سلسلہ' وہی گہرائی----- میں ایسی حالت میں ساکت و صامت کھڑا ہو جاتا اور نیلگوں پانیوں سے' اس کے بے پایاں وجود کا نظارہ کرتا رہتا۔ لحہ بہ لحہ سمندر کی مہیب لہروں میں سے اٹھنے والی چنگھاڑتی آوازیں اور پھر ان کا یکبارگی نیچے گرتے ہوئے اپنے پھیلاؤ کو جھاگ بناکر کناروں تک لے آنا اور اپنے پیچھے ریت کے انبار چھوڑ جانا----- ایسا لگتا تھا کہ رنگوں' آوازوں اور سرتال کا ملاپ اس کے خوشنما فن کا اظہار کر رہا ہے اور پھر اس کی سبک خرامیوں میں ایک خاص قسم کی ترغیب تو بسااوقات دیوانہ کر دیتی ہے۔

قدرت کے لامحدود حسن کو دیکھ کر خدا کی ہستی اور اس کی ہمہ وقت موجودگی کو خراج نظر پیش کرنے کے باوجود یہ ہوشربا مناظر مجھے چند لمحوں سے زیادہ مبہوت نہ رکھ سکتے۔

میرے نزدیک خدا کی وہ تخلیقات جنہیں اس نے بے عیب اور مکمل حالت میں پیدا کیا تھا انہیں دیکھتے رہنے کی بجائے کرب کی ماری وہ صورتیں التفات کے قابل ہیں جنہیں اس نے اپنی پوشیدہ حکمتوں کی بنا پر ناتمام چھوڑ دیا تھا۔

پانی میں ڈوبے رہنے سے پھول جانے والی ہیبت ناک انسانی لاشوں کی حالت کا تقاضا ہے کہ انہیں جلد از جلد دفنا دیا جائے لیکن وارث' انہیں کوسوں میل دور لے جانے پر اصرار کرتے۔ فرسودہ اور بے چہرہ میتوں کو گھر لے جاکر ان پر پہروں گریہ کرنا اور رسمیں ادا کرنا تو محض پیسے اور وقت کا زیاں ہے لیکن زندگی کی قدر و منزلت اور موت کی تباہ کاریوں سے متعلق کوئی وعظ ان پر کارگر نہ تھا-----

بوڑھی اور کمزور ایمبولینس' قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرنے والے شہر میں جس قدر ممکن ہوسکا' لاشیں ڈھوتی رہی۔ بعض اوقات موقع بے موقع یوں بھی ہوتا کہ وہ ٹھپ سے کسی ویران علاقے میں بند ہو جاتی۔ میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کچھ تو قسمت آزمائی اور کچھ سواریوں کی تسلی کے لئے دستیاب اوزاروں سے گاڑی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا۔

ہم نے جیکب آباد' ٹھٹھہ' نواب شاہ اور بلوچستان تک اسی ایمبولینس میں سفر کیا۔

دوران سفر' انسانی سردمہریوں کی کئی مضبوط شہادتیں ملیں ـــ قرآن حکیم' جانوروں کے لئے بھی لطف و کرم کی تلقین فرماتا ہے لیکن لوگ ان ہدایات سے غافل تھے۔ مسخ شدہ انسانی لاشوں کے مقابلے میں لوگوں کی' ایک مردہ کتے سے کراہت زیادہ شدید تھی۔ راستے میں کوئی مردہ جانور نظر آجاتا تو فوراً" وین روک لیتا۔ مردہ جسم گھسیٹ کر کسی درخت کے سائے میں یا کسی جھاڑی تلے رکھ آتا اور اسے گھاس اور پتوں سے ڈھانپ دیتا۔

ایک پرانی اور خستہ حال عمارت کرائے پر لی گئی جس میں تمام معذور افراد کو منتقل کر دیا گیا۔ سیٹھ لوگ' ایک بار پھر آڑے آ گئے ـــ

"یہ شخص حقیری خدمت کے بدلے میں بہت کچھ سمیٹ رہا ہے۔ کوئی اس کا بھروسہ نہ کرے۔ یہ تو خود محروم لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے-----"

دوسروں نے یوں ہنگامہ بپا کیا-----

"کسے معلوم کہ اس کے اکاؤنٹ میں کتنا سرمایہ ہے اور آمدن و خرچ کے حسابات کس نے دیکھے ہیں۔ آخر یہ پیسہ کہاں جا رہا ہے! اتنی ڈھیر ساری رقمیں پرانی وین یا خستہ عمارت

تو نہیں کھا گئی"۔

انہوں نے میرے حسابات چیک کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ سن کر دوستوں میں کھلبلی مچ گئی جنہیں یہ کہہ تسلی دی کہ-----

"جب ہمارے حسابات میں کوئی گھپلا نہیں تو تم کیوں ڈرتے ہو ـــ حساب مانگنے کا حق تو صرف اسے ہے جو ہمارے ساتھ' ہاتھ بٹائے۔"

مجھ پر اعتماد یا عدم اعتماد کا اظہار کیا جاسکتا ہے' بازپرس بھی ہوسکتی ہے۔ جن لوگوں کو میرے عزائم پر شبہ ہے' انہیں عطیات دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور جو لوگ بھروسہ کرتے ہیں' انہیں میرے اس عہد و پیمان پر بھی بھروسہ ہونا چاہیے جس کے تحت میں ان کے مقاصد کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

سردیوں کی ایک یخ بستہ اور اندھیری رات کو جب میں اپنے کپڑے دھو رہا تھا تو اچانک بجلی چلی گئی۔ خلوت کے ان لمحات میں خیالات نے ایک طوفان کی طرح مجھے آن گھیرا اور میرے ذہن میں جیسے بجلی کا کوئی کوندا لپک گیا ـــ

"عبدالستار! تم زیادہ سے زیادہ صرف اپنی ذات کی حد تک ذمہ داری لے سکتے ہو۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر' ہاری ہوئی بازی جیتی جاسکتی ہے۔"

اگلے ہی روز ڈسپنسری کا نام "ایدھی ڈسپنسری" رکھ دیا گیا اور وین پر ـــ "ایدھی" کے الفاظ پینٹ کرا دیئے گئے۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا ـــ

"اگر کسی شخص کو اپنی طرف سے دیئے جانے والے عطیات کے استعمال پر شبہ ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ خیرات کردہ رقم واپس لے جائے۔"

بھلا اس سے زیادہ' لوگوں کو کیا تسلی دی جاسکتی تھی۔ اگر یہ رقوم اعتماد پر دی جاتی ہیں تو ہمیں ان کے خرچ کرنے کا اختیار بھی ہونا چاہیے۔ ہم ان گروہوں یا افراد کے دباؤ میں نہیں آئیں گے جن کی کارکردگی بالکل صفر ہے۔ ہر ایرے غیرے کو وضاحتیں دے کر' اور کاغذی پلندے میں الجھ کر اپنا وقت کیوں برباد کریں-----!

اب سیٹھوں کی اندرونی شوریدہ سری' ایدھی ڈسپنسری کو بھی آماجگاہ بنانے لگی اور ـــ رضاکاروں کے روپ میں انہوں نے اپنے جزوقتی کارندے' داخل کر دیئے۔ ان کے منفی اور قابل مذمت رویئے نے مطلق اختیارات کی ضرورت' اور بھی ناگزیر کر دی ـــ چنانچہ

کہنا پڑا کہ ہمیں کسی کی رائے یا پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس بات کے پابند ہیں کہ کوئی لاوارث لاش دفنانے سے پہلے کسی بورڈ کا اجلاس طلب کیا جائے۔ مسائل واضح اور ان کا حل قطعی طور پر سادہ ہے۔۔۔۔ جو لوگ اتفاق نہیں رکھتے، وہ چاہیں تو ہمیں چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسا کرکے ہم نے اس فشار سے کسی حد تک نجات حاصل کرلی۔ ڈسپنسری کے باہر آویزاں بورڈ پر عام لوگوں کی اطلاع کے لئے یہ عبارت لکھوا دی گئی ...

"عطیات دینے والا کوئی بھی شخص شک و شبہ کی صورت میں اپنی رقم واپس لے سکتا ہے"۔

یہی عبارت رسیدوں پر بھی چھپوا دی گئی۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندرونی خدشات اور توہمات کو رفع کرنے میں مدد ملی۔

بددیانت ڈرائیور کے لئے کرپشن کا سب سے آسان ذریعہ، ایمبولینس گاڑی میں سواریاں بٹھا کر ٹکے پیسے کمانے کا تھا ۔۔ اس کا تدارک کرتے ہوئے رسیدات جاری کرنے کا اصول اپنایا گیا۔ سربمہر لفافے میں بند دو رسیدیں، گاہک اور ڈرائیور کو جاری کی جاتیں ۔۔ رسید کی بنیادی پرت دفتر میں جمع کرا دی جاتی اور گاہک کو دی جانے والی پہلی رسید کا دفتر میں اندراج کر دیا جاتا ۔۔ دوسری بذریعہ ڈاک ہیڈ آفس کے پتہ پر روانہ کر دی جاتی۔ یہ طریقہ کار کسی بھی ممکنہ کرپشن میں سخت رکاوٹ کا باعث ثابت ہوگیا۔

اپنے ساتھی کارکنوں سے میں نے مطالبہ کیا کہ رونما ہونے والے داخلی یا خارجی واقعات کی اطلاعات دیتے رہا کریں۔ جس کے بعد ہم سب نے کبھی بھی کام سے غیر متعلق کسی موضوع پر بات نہیں کی۔ شب و روز کی مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ ہم اپنے کام کے سوا کسی اور جانب دھیان؛ دے ہی نہ سکتے تھے ۔۔ ادارے میں جو نظم و ضبط قائم کر دیا گیا تھا، اسے کامیاب بنانے کے لئے ضروری تھا کہ حقیر سے حقیر کام بھی خود کیا جائے۔ مسلسل محنت کے عمل نے مجھے، آخرکار منوالیا۔

1958ء کے دوران، والد کے ترکے سے ایک بڑی رقم ملی۔ ان دنوں خطیر دولت کے حامل کسی بھی شخص کو لکھ پتی کہا جاتا تھا۔ اس سرمائے کو حصص خریدنے میں لگا دیا گیا۔ جو منافع آتا، وہ میرے کھاتے میں چلا جاتا۔ یہ منافع میری محدود ضروریات کیلئے کافی تھا۔

اسی سال ملکی سطح پر نااتفاقیوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث برسراقتدار سیاسی حکومت کا

خاتمہ کر دیا گیا جس کی جگہ فیلڈمارشل محمد ایوب خان کا معروف مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ غریبوں اور خستہ سامانوں کا جو پوچھیں تو کوئی حال نہ تھا۔ رشوت، بددیانتی، نیم خواندہ اور بے صلاحیت لوگوں کو ملازمتوں کی ارزانی، نہ حساب نہ کتاب، نہ قانون، نہ اخلاق۔۔۔۔ یہ تھا آزادی کا حاصل جو پہلے دن سے ہی اس قوم کا مقدر بن چکا تھا۔

کسی سانحہ یا وقوعہ پر متاثرہ لوگوں نے سروس کے لئے، وقت بے وقت ہمیں آواز دی کہ ہم شب و روز، ڈیوٹی پر حاضر رہتے تھے۔ ہمہ وقت خدمت گزاری کی ایک مستعد سروس، برادری کے گلے میں ایک پھندے کا روپ دھار گئی۔ ان کے پاس مصیبت کے وقت میں ہمیں بلانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ رقیب، جلتے بھی اور کارکردگی کے صلے میں، ہمارے ممنون احسان بھی ہوتے۔ ان کے توہین آمیز رویوں کے جواب میں مکمل عاجزی اور انکساری کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا جسے دیکھ کر، کئی مخالفوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ایک مرتبہ جب میری واشگاف مخالفت کرنے والے ایک میمن سیٹھ کی بچی، اپنے گھر کی چھت سے گر پڑی تو کئی جگہ ایمبولینس کے لئے، دیوانہ وار ٹیلیفون کئے گئے۔ اتفاق ہے کہ کہیں سے بھی کوئی ایمبولینس دستیاب نہ تھی۔ جب ہمیں سیٹھ اور ان کے گھر والوں کی اس پریشانی کا علم ہوا تو دفتر میں ایک معنی خیز سکوت طاری ہوگیا۔ ساتھیوں نے دبے لفظوں میں اپنی سوچ کا اظہار کیا ۔۔

"ستار بھائی! سیٹھ کو بتا دو کہ تم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔۔۔۔۔"

میرے لئے دشوار تھا کہ سامنے بھڑکتی آگ دیکھ کر چپ بیٹھا رہوں، سو فرض کی تکمیل کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں جاکر دیکھا کہ بچی، فیملی کے گھیرے میں، فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ فوراً" وین میں ڈالا اور ہسپتال کو چل پڑا۔ واپسی پر وین چلاتے ہوئے، یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ مخالفوں کی زخمی بچی کو ہسپتال لے جانے میں میرے احساسات وہی تھے جو اپنی ماں کے لئے ہوسکتے تھے ... دکھ کی بات تو یہ ہے کہ بچی جانبر نہ ہوسکی تاہم اس عمل سے، مرحومہ بچی کے والد نے ہماری مخالفت ترک کردی اور اس کی بیوی نے بھی اپنی زکوٰۃ کے پیسے بھیجنا شروع کر دیئے۔

سیٹھ کی طرف سے اپنے کام پر وارد ہونے والے بے معنی اعتراضات کا جواب دیتے

ہوئے میں نے اس کے ایک حاشیہ بردار سے کہا کہ — میں اس عورت کی شرمناک داستان' اچھی طرح جانتا ہوں جس کا خاوند تو جیل میں سڑ گل رہا تھا مگر تمہارے سیٹھ نے' اس غریب عورت کو پیشہ کرانے کے دھندے پر لگائے رکھا۔ بظاہر تم لوگ یتیموں کو کھانا کھلاتے ہو--- غریب بیواؤں کے سر' تم نے چادروں سے ڈھانپ رکھے ہیں اور ان کے بچوں کی تعلیم کا خرچ اٹھا رہے ہو — اس کے ساتھ ساتھ تم ان کی جوان بیٹیوں سے یہ تقاضا بھی کرتے ہو کہ وہ نقاب الٹ کر' تمہاری گنہگار آنکھوں کی پیاس بجھائیں------؟

ہم نے ان دھتکارے ہوئے لوگوں کو عزت دی ہے اور ان کی ڈھارس بندھائی ہے۔

اس قماش کے سیٹھوں کا معمول تھا کہ وہ خیراتی اداروں کی آڑ میں کھیلتے کرتے تھے اور انہیں گلہ بھی یہی تھا کہ ہم نے اس دھندے میں' ان کا ساتھ کیوں نہ دیا۔ میں اپنے طور پر ایک کھلے' سپاٹ اور بے داغ راستے پر چل رہا تھا۔ برادری کے کچھ افراد پر اب حقائق کھلنے لگے تھے جس کے باعث ان کے علاوہ دیگر خاندان قبیلوں سے بھی خیرات و صدقات کی ترسیل ہونے لگی۔

لوگوں نے' چونکا دینے والی ہماری آواز سنی اور ان میں سے جس نے باقاعدگی کے ساتھ ان فکری خطوط پر چلنے کی کوشش کی' کامیاب رہا۔

سماجی بہبود کے حوالے سے میری ذات پر حملوں کے تواتر اور اس بارے میں رقیبوں سے سوال و جواب کے سلسلے کو کئی سال ہو چلے تھے۔ اب میں وسیع و عریض علاقوں تک جا کر کام کرنے کے لئے مضطرب تھا۔

اس سلسلے میں' حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ گرامی سے مجھے حوصلہ عطا ہوا۔ تبلیغ دین کے راستے میں آپؐ کو بے پناہ مصائب جھیلنا پڑے۔ آپؐ کے دوست کم تھے اور منافقین زیادہ--- میں نے جو کچھ بھی پایا' وہ حضورؐ کے فیضان نظر کا ہی صدقہ ہے۔ اسی لئے میں نے سماجی ارتقاء کے لئے' اسلام کے ابتدائی دور سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مذہب تو پہلے ہی پورے عالم میں' ایک فعال قوت کی حیثیت سے ابھر چکا تھا لیکن اس کے پیروکاروں کی بے عملی نے اسے ضعف پہنچایا۔ اسلام' خود کفالت اور خدا ترسی جیسی صفات پر زور دیتا ہے۔ اسلام' تمام زمانوں کے انسانوں کا مذہب ہے۔ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے دیگر مذاہب کے پیروکار' مسلمانوں کا کردار دیکھتے

ہیں۔ قول و فعل میں تضاد کا' اسلام کی مثالی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ حقوق العباد کا مقصد' خدا ترسی کے سوا نامکمل ہے۔

آبائی گاؤں بانٹوا میں' شروع ہی سے میری زندگی' تیزی اور عجلت سے کام کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ اب حالات نے عجب پلٹا کھایا ہے۔ آٹھوں پہر ایمبولینس لئے بھاگتا پھرتا' کیونکہ بیماروں' زخمیوں اور مرنے والوں کے پاس مہلت نہیں ہوتی۔ اسی لئے ساتھیوں سے کہتا رہتا — "یہ بیٹھنے کا وقت نہیں۔ خاموش کیوں کھڑے ہو — تمہیں ہر وقت متحرک رہنا پڑے گا۔" غنیمت تھا کہ انہوں نے پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔

کسی کام کے آغاز سے پہلے' میں گہری سوچ یا لمبے چوڑے منصوبے بنانے کا قائل نہیں تھا۔ ہمیشہ کسی کام کی تکمیل کے بعد ہی' اپنی کارکردگی کا جائزہ لیتا اور اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتا۔ اپنے فیصلوں کو اس وقت تک برقرار رکھتا' جب تک ان کی افادیت نظر آتی رہتی۔ بصورت دیگر یا تو زیر تجویز منصوبے ختم کر دیتا یا انہیں بھرپور قوت کے ساتھ' آخر تک نبھاتا۔

دوران کار ایمبولینس چلانے' اپاہجوں کی دیکھ بھال' میتوں کو نہلانے اور دفنانے کی ذمہ داری کے باوجود اپنے کمرے میں جا کر کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ بنا ہی لیتا۔ ماں نے کہا تھا کہ یاد رکھو! چولہے کی آگ ہمیشہ جلتی رہنی چاہئے۔ میں عام طور پر سبزی اور دال پکاتا۔ گاہے بگاہے گوشت بھی کہ وہ مجھے بہت مرغوب تھا۔ جانتا تھا کہ باقی اشیاء کے مقابلے میں گوشت کا استعمال' ضروری ہے۔ کام اتنا زیادہ تھا کہ گوشت کھانے پکانے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ باورچی خانے کا جو بھی کام ہوتا' خود ہی کرنا پڑتا۔ آٹا گوندھتا' پھر الٹی سیدھی چپاتیوں میں ڈھال کر گرم گرم توے پر ڈالتا۔ سگھڑاپا نام کا نہیں' کام چلا لیتا۔ کپڑوں کے دو جوڑے' ابھی تک استعمال کے قابل تو تھے لیکن ان کی بوسیدگی نمایاں ہونے لگی تھی۔ ایک جوڑا پہنتا' دوسرے کو دھوپ میں سکھانے کے لئے لٹکا دیتا۔ میں اپنے حال میں مست تھا۔

کام کاج سے تھک کر سو جاتا تو لگتا کہ آج' پورے سکون سے رات بھر سویا ہوں۔ اکثر اوقات' ڈسپنسری کے باہر پڑے بینچ پر سوتے ہوئے' ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ میٹرنٹی یونٹ یا ڈسپنسری کے دوسرے شعبوں سے کوئی آواز آئی۔ سو کہاں کی نیند۔

ڈسپنسری اور زچگی کا کام ابھی اتنا وسیع نہ تھا۔ بھاگ دوڑ اور خود جا جا کر ہر کام نبٹانے کی کاوش نے دونوں یونٹوں کا حجم بڑھا دیا تھا۔ لوگ دور دور سے ہماری خدمات طلب کرنے لگے۔

سماجی مشن کے پہلے مرحلے میں ہمارا ایک "خبرنامہ" بھی تھا' جس سے ہم نے عوام کے دل جیتے اور خیرات کا شعور بیدار کیا۔ مخلصانہ کارگزاریاں' تنظیم کی مزید ترقی کا زینہ ثابت ہوئیں۔ سماجی خدمات کے اعتراف میں' ہمیں تین لاکھ روپے کا عطیہ ملا جس سے تین مزید ویگنیں خرید لی گئیں۔ یوں اس اعتراض کا بھی ازالہ ہوگیا کہ ایدھی کی حیثیت' ایک ایمبولینس سے زیادہ کی نہیں۔

اس دوران طلباء کے ایک گروپ کے بارے میں سنا کہ وہ اپنے طور پر بڑی شد و مد کے ساتھ میرے خلاف لگائے گئے الزامات کا دفاع کر رہے تھے۔ جب مخالفین نے مجھے کمیونسٹ کہا تو مدافعانہ دلائل کے باوجود اس تہمت نے میرا تعاقب نہ چھوڑا۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کا ایک گروپ ہمارے دفتر آیا تو ان کی گفتگو کا موضوع' اشتراکیت ہی ہوتا۔ یہ جوان' میرے سادہ خیالات سے کافی متاثر ہوئے اور اشتراکی نظریات کے حامل ایک لیڈر سے ملوانے لے گئے۔ ہم جس بس میں جانے کو بیٹھے' وہ سوائے ایک سیٹ کے' کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں سیٹ پر بیٹھنے لگا تو پہلو میں بیٹھے ایک خوش لباس بابو کے گھٹنے سے میرا گھٹنا ٹکرا گیا۔ بابو نے سر پر قیامت اٹھالی اور انتہائی نفرت انگیز لہجے میں کہا ـــ "پرے ہٹو ـــ مجھے ہاتھ مت لگانا۔"

لڑکے' برداشت نہ کر سکے اور میرا دفاع کرتے ہوئے بابو سے کہا ـــ "بھائی! کیا تم جانتے ہو کہ تم جس کے ساتھ الجھے بیٹھے ہو' یہی شخص ایک دن تمہارے کام بھی آ سکتا ہے۔" مداخلت کرکے معاملہ ٹھپ کرا دیا گیا اور ہم سب خاموشی کے ساتھ اپنی منزل کو روانہ ہوگئے۔ بہت سے لڑکے' ہمارے حمایتی ہوگئے۔

سیٹھ لوگ' ہر نئی حکومت کی حلف برداری کے موقع پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسا کر اپنی سماجی' معاشی اور معاشرتی بقاء کے راستے ہموار کر لیتے۔ ان کا یہ حال تھا کہ بھاری نذرانوں' چاپلوسی اور خوشامد کے ذریعے' ہر حکومت کا ساتھ دیتے۔ کوئی ایسا قانون یا ضابطہ نہ تھا جسے توڑ موڑ کر' اس کا اصل حلیہ نہ بگاڑ دیا گیا ہو۔ سب کچھ جائز تھا۔ ہر

بدقماش نے سزا سے بچنے کے لئے سفارش کے ذریعے' حکام تک رسائی کا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ بڑے بڑے لوگ بھی کرپشن اور موقع پرستی کی علامت بن چکے تھے۔ ملک و ملت کو جس پریشانی کا سامنا تھا' اس کا ازالہ تنہا قائد اعظمؒ یا ان کے چند مخلص ساتھی کیسے کر سکتے تھے۔ آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا تھا۔

1962ء میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر' بنیادی جمہوریت کے انتخابات میں حصہ لینے کی ٹھان لی۔ سیٹھ لوگ جل بھن گئے اور انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اپنا فیصلہ واپس لے لوں۔ جب ڈٹ گیا تو سیٹھ برادری' مجھے شکست دینے کی مہم میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئی۔ کیا کچھ حربے استعمال نہ کئے گئے اور ان الزامات کو پھر سے دوہرایا گیا جن کا میں سال دو سال پہلے سامنا کر چکا تھا۔ مجھے کمیونسٹ' زانی' چور اور جاہل تک کہا گیا۔

میری تذلیل کے لئے ان خود ساختہ کہانیوں کا اعادہ' کوئی نئی بات نہ تھی لیکن یہ بیہودہ پراپیگنڈہ' میری گیارہ سالہ سماجی خدمات کے باوجود کیا جا رہا تھا۔ میں' واحد میمن تھا جس نے بے سروپا مخالفتوں کے باوجود انتیس سال کی عمر میں بلامقابلہ سیٹ جیتی تھی۔ 1964ء کے معروف انتخابی معرکے کے دوران میں نے صدر ایوب کے مقابلے میں' قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کا ساتھ دیا۔ معتبر خاتون خود ہار گئیں یا انہیں اس وقت کے قبضہ گروپ نے ایک سازش کے تحت ہرا دیا۔ یہ فیصلہ اس وقت کی تاریخ نے سنائے بغیر ضبط کر لیا تھا۔ کون جانے!

میٹھا در کے علاقے سے جیت کر میں نے بنیادی ممبرشپ دوبارہ حاصل کر لی تھی۔

تھوڑا بہت جانتا تھا کہ سیاستدان ہمیشہ ایسی دنیا میں رہتے ہیں' جس کا انحصار وقتی خواب دکھانے پر ہوتا ہے۔ خود کو اتنی بڑی اور بھیانک برائی کے ساتھ مزید چپٹے رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جو یا تو مجھے کھا جاتی یا ہمیشہ کیلئے اپنا قیدی بنالیتی۔

سیاسی مہم جوئی' میری غلطی تھی۔ حکومت کے قریب رہ کر سماجی بہبود کے کام کا فروغ' سسٹم میں رہتے ہوئے سسٹم کی تبدیلی اور بیداری کی تحریک ـــــ یہ سارے کام قابل قدر سہی لیکن ساتھی کرپٹ ہوں تو پھر یہ ایک خواب ہی ہے۔ حالات و واقعات کے اس رخ کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے سیاست میں آنے کا فیصلہ' جلد بازی پر مبنی محسوس ہوا۔

1964ء کے دوران محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف انتخابی فتح کا جشن منانے کے لئے

صدر ایوب نے ریلی منعقد کی۔ میں اس میں احتجاجاً" شامل نہ ہوا اور ساتھیوں سے کہا ۔۔۔ "قائداعظمؒ نے تقسیم ہند سے پہلے انتہائی مشکل حالات میں' ایک قوم کو دریافت کیا تھا۔ انہیں پاکستان کی صورت میں جو کچھ بھی ملا' لے لیا لیکن اس کے بعد ہماری غفلتوں کا کوئی جواز نہیں۔ ہم پر ایک ماں کی طرح یہ غیر مشروط ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنے اپنے عقلی اور مادی وسائل کے مطابق اس نوزائیدہ ملک کی نگہبانی وپاسداری کریں ۔۔۔ کمزور لیڈر ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جن کی نبضیں کمزور ہوں تاکہ وہ ان کے ذریعے ملک میں بے اعتمادی اور مردہ دلی کے جراثیم پھیلا سکیں۔ اوپر ہی اوپر ایک نا اہل قیادت ابھرتی رہے اور نیچے رشوت' بد دیانتی اور بد انتظامی پھیلتی پھولتی رہے۔ زہریلے جراثیم تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں اور انہیں اس طریقے سے ایک طرف کرنا ہے کہ وہ بھی نہ رہیں اور کام بھی متاثر نہ ہو۔" میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ہمیشہ صداقت اور فضیلت و بزرگی کا تعاقب کرو۔ کام کرو تو ٹھوس طریقے سے کرو۔ سطحی جھاڑ پونچھ اور آنکھوں میں دھول جھونکنے والا کام نہیں ہونا چاہئے۔ عجلت ترک کردو اور اپنے اندر ٹھہراؤ پیدا کرو تاکہ اچھے نتائج نکل سکیں۔ اب' قائد اعظمؒ کے وہی اصول پیش نظر رکھے جنہیں بروئے کار لا کر' انہوں نے پاکستان حاصل کیا تھا اور لوگوں کی اس اکثریت سے جا ملنے کا عزم کیا' جنہیں کبھی کسی قابل نہیں سمجھا گیا۔ فیصلہ یہی تھا کہ حکمران طبقے کی اعانت کے بغیر' بابائے قوم کی جائے ولادت کے گلی کوچوں کی خاک سے ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی جائے جو تمام خلق خدا کے لئے ایک شجر سایہ دار کا کام دے سکے۔

ایک عزم نو کے ساتھ' میں ڈسپنسری کی جانب لوٹ آیا۔ سیاسی سرگرمیوں سے اب کوئی سروکار نہ تھا۔ سامنے اب پہلے سے بھی زیادہ دشوار مرحلہ تھا۔ لوگوں کی خدمت ہی حقیقی سیاست ہے اور ایک خاموش نظام کے نفاذ کا جو مشن سامنے تھا' اس کی کامیابی کے لئے بھی ضروری تھا کہ اسے صیغہ راز میں رکھا جائے اور وقت سے پہلے نظریات و افکار کو افشا نہ کیا جائے ۔۔۔ کہیں وہ ہوا میں بکھر کر تحلیل نہ ہو جائیں۔ میں نے گزرے ہوئے ان برسوں کا احاطہ کیا جب ماں کی بیماری اور موت نے ایک نصب العین کی راہ سجھائی تھی۔ پھر سیٹھوں کی مخالفت نے ایسا متحرک کیا کہ ایک ڈسپنسری نے ۔۔۔ نئی دنیا کے در کھول دیئے۔ پروردگار دو عالم نے وعدہ فرمایا ہے کہ آخرکار مساکین ہی زمین کے وارث ہوں گے۔ سو

اس مقدس اور عظیم الشان حوالے سے یہی تمنا ہے کہ ایک ترکے کی صورت میں میری محنتوں کا ثمر بھی ناداروں اور محروموں کو ملے۔ یہی لوگ' میرے وارث ہوں گے۔ لیکن اس کے لئے ایک عمر درکار ہوگی۔

یہ ایک یخ بستہ' خاموش اور بے تمنا رات تھی کہ میں سر پر کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ خواب کے عالم میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کے بجنے "گنگنانے جیسی آواز آئی۔

"لالہ! جاگو' دروازہ کھولو' ایک عورت اپنے بچے کو جنم دینا چاہتی ہے۔"

کمبل میں سے جھانکتے ہوئے دیکھا کہ رات نے اچانک اپنا روپ بدل لیا ہے۔ فرش پر لیٹا' میں اس لڑکی کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک کراہتی ہوئی ایک دردناک آواز نے میرے تسلسل کو بکھیر کر رکھ دیا۔ اٹھ کر میں اپنی جیبوں میں چابیاں تلاش کرنے لگا۔ کمبل الٹا سیدھا کیا اور گھبراہٹ کے عالم میں سامنے والے بنچ پر جا گرا۔ مڑ کر دیکھا تو چابیاں میری آنکھوں کے سامنے' امینہ کے ہاتھ میں جھول رہی تھیں۔ میری ہتھیلی پر دھم سے چابیاں رکھتے ہوئے' اس نے کہا ..... "یہ لیں اور جلدی سے دروازہ کھولیں۔" اس کے ہاتھوں سے چابیاں پکڑیں اور دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

اپنی شادی کے بارے میں آخری مرتبہ' آج سے نو برس پہلے سوچا تھا اور اس خیال کو اس سختی کے ساتھ ایک طرف کر دیا تھا کہ دوبارہ مجھے اس کا کوئی اتہ پتہ نہ چلا۔ وقت تیزی کے ساتھ گزرتا رہا۔ شب و روز کی پاگل کر دینے والی مصروفیات ۔۔۔ اپنوں کے غم' دوسروں کے دکھ' شریکوں کے طعنے اور قرابت داروں کا حسد ۔۔۔ کیا کچھ نہیں تھا! اس ویرانے میں اتنا بھی یاد نہ رہا کہ میں کتنے برس کا ہو گیا ہوں۔ یہ بات بھی انتہائی بے یقینی کے ساتھ گردش کرتی رہی کہ میں 1928ء میں پیدا ہوا یا 1931ء کے دوران یا 1932ء میں ۔۔۔! شاید بتیس برس کا ہو چکا تھا۔ اب تک کی زندگی' طوفانوں میں' بیچ منجدھار کے گزری لیکن سامنے چاندنی میں کھڑی ایک لڑکی' گئے وقت کی یادیں واپس لے آئی۔

یہ احساس پہلے سے تھا کہ مردوں کے مقابلے میں خواتین' سماجی بہبود کے کام میں زیادہ سود مند ثابت ہوتی ہیں۔ انتہا درجے کی خدا ترسی کے جذبوں سے مالا مال ہونے کی بنا پر ایک تو انہیں نصب العین کا دھیان رہتا ہے' دوسرے وہ بہت مستعد ہوتی ہیں اور نظم و ضبط کا خیال بھی رکھتی ہیں۔ اسی لئے مختلف اسامیوں میں خواتین کو بھرتی کیا گیا جن کی

تعداد اب ستر تک پہنچ چکی تھی--- ان میں سے ایک کو بھی دوسری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انہیں ہمیشہ محض کام کاج کے حوالے سے جانچا اور پرکھا--- پھر بھی طرح طرح کی افواہوں نے مجھے گھیرے میں لئے رکھا---

امینہ' ابھی تک ہمارے ساتھ کام کر رہی تھی اور ایک متمول خاوند کی آس میں بیٹھی تھی۔ اسے اپنا آئیڈیل شاید ابھی تک نہیں ملا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگا کہ وہ کسی قدر افسردہ تھی۔ ..... اس دوران سات میں سے پانچ وہ لڑکیاں جنہیں میں نے شادی کے لئے چنا تھا' اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔

امینہ' ایک تجربہ کار اور سینئر نرس تھی جو اپنا کام بڑی تندہی اور لگن سے کرتی تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ بھی اچھا تھا ..... طبعاً" خوش مزاج بھی تھی۔ دوران کار' خفا ہو جاتا تب بھی اس کے چہرے سے زندہ دلی کے آثار ختم نہ ہوتے۔ وہ زندگی کے ایک ایسے مقام پر تھی جہاں' کسی سے بھی شادی کر سکتی تھی ..... اس کے باوجود کہیں کوئی گڑ بڑ ضرور تھی۔ اس کی جانب سے برملا اقرار کا شائبہ نہ سہی ..... پر تیزی سے گزرتے لمحے نے مجھے یہی باور کرایا...... کیا یہی خاتون میرا مقدر تھی؟ ..... مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔!

باب پنجم

ادھوری دلہن

1965ء میں بھارت نے پاکستان پر بلا اشتعال حملہ کر دیا۔ قومی زندگی کے اس چیلنج کو سامنے رکھتے ہوئے ہم بے پناہ مصروف ہو گئے۔ زخمیوں کی امداد اور ہلاک ہونے والوں کی تجہیز و تکفین کے لئے ہم کراچی کے طول و عرض میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ کرفیو اور بلیک آؤٹ کے سائرن چیخ رہے تھے۔ بچے پانی کے لئے بلبلاتے اور درد کی شدت سے تڑپ' تڑپ جاتے۔ اس غیر معمولی صورت حال نے خواتین' نوجوان طلباء اور طالبات کو گھروں سے باہر نکل کر قومی فریضہ انجام دینے کا حوصلہ دیا۔ انہوں نے ابتدائی طبی امداد کی تربیت لی اور فوجیوں کو ضروری سامان پہنچانے کا کام بھی کیا۔

میں نے شہری دفاع کا کورس کر رکھا تھا۔ اس ضمن میں' طالب علم رہنماؤں کے ایک سرگرم گروپ کو ہدایات دیں' جو منگھو پیر میں' مزدوروں کے لئے قائم کردہ ایک فری ڈسپنسری چلا رہے تھے۔ انہیں سیاست سے باز رہنے کی تلقین بھی کی گئی تھی ..... وہ پر امید تھے اور چاہتے تھے کہ میدان عمل میں آکر سیاسی تجربات حاصل کریں۔ میں نے انہیں سمجھایا ..... "ایک نہ ایک دن' تم لوگ سیاست کے حوالے سے ایک ہی کام کے لئے مجھ سے آملو گے اور وہ ہے عوامی خدمت۔"

میٹھادر دفتر کے ایک کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے خواتین کے ایک گروپ کو امدادی سامان کے پیکٹ بناتے دیکھا۔ کچھ پیکٹ کھول کر چیک کئے تو ان میں سامان کم نکلا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا اور انہیں حکم دیا کہ تمام پیکٹ کھولیں اور ان میں پورا سامان دوبارہ پیک کریں۔

..... کارکنوں کے ایک گروپ سے میں نے چلا کر پوچھا ..... "تم جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو' کیا تمہاری نگرانی کے لئے پولیس طلب کرنا پڑے گی یا کوئی استاد جو تمہاری اصلاح کرے یا پھر کوئی خاکروب جو بعد میں تمہاری پھیلائی گئی' غلاظتوں کو صاف کرے؟" بے چارے کارکن ابھی کچھ دیر اور میرے غم و غصہ کے طوفان میں گھرے رہتے کہ دروازے پر ناگہاں ..... ایک تبسم فرما خاتون کے آنے سے سکوت طاری ہو گیا۔ مسکراتے ہوئے اس کے دونوں گالوں کے وسط میں پڑنے والے گڑھوں نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ اس

نے برجستہ کہا ۔۔"مجھے میری خالہ نے یہاں کام کے لئے بھیجا ہے"۔اسے امینہ کے حوالے کر کے' تیزی سے باہر نکل گیا۔ جنگ نے مجھے' اپنے منطقی انجام تک اس قدر مصروف رکھا کہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

اس کا نام بلقیس تھا' میں نے اسے پہلی بار اس روز دیکھا تھا جب وہ اپنی خالہ کے ساتھ ڈسپنسری آئی۔ میں حساب کتاب کے بکھیڑے میں الجھا ہوا تھا ۔۔۔ انہیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ لڑکی زیر لب کچھ بڑبڑاتی اور ہر چند سیکنڈ بعد میری طرف گھورتی۔ فائل بند کر کے' متوجہ ہوا تو بتایا گیا کہ یہ لڑکی نرس بننا چاہتی ہے۔ میرا سوال تھا ۔۔"اس کی عمر تو بہت ہی کم ہے۔ کیا یہ سکول نہیں جاتی؟" خالہ نے بتایا ۔۔۔ "اب تو ماشاء اللہ یہ سولہ برس کی ہے۔ لیکن اسے پڑھنے لکھنے سے رغبت نہیں۔ یہ تو بس کام کرنا چاہتی ہے۔"

میں اس کی مستقل مسکراہٹ اور ہوشربا آنکھوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے متوجہ ہوا تو دل ہی دل میں' اپنے قہقہے ضبط کرتے ہوئے' رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ساتھ ہی اسے تنبیہ کی ۔۔"یہاں کام کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ میں تمہیں یہاں اپنا یا کسی اور کا وقت ضائع کرتے نہ دیکھوں۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے پر خوف کا ایک تاثر ابھرا' لیکن اس نے یوں آمادگی ظاہر کر دی' جیسے بیٹری سیل سے چلنے والا کوئی کھلونا' اپنے سر کو حرکت دیتا ہے۔

بعد ازاں اسے کئی مرتبہ' دفتر کے سامنے سے بکمال تندی و تیزی گزرتے دیکھا۔ وہ اندر جھانکتی' مسکراتی اور کسی ڈوبتے ستارے کی مانند گم ہو جاتی۔ میں نے ڈسپنسری میں غیر سنجیدہ عناصر پر کنٹرول کرنے کے لئے جان بوجھ کر ایک سخت اور ظالمانہ رویہ اختیار کر لیا تھا جس نے معمول کے ہنسی مذاق کو بھی ختم کر دیا تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ ایک انتھک کارکن ہوں لیکن بلقیس کے معاملے میں صورت حال ذرا مختلف تھی ۔۔ اب دوسروں کے لئے بھی میرا رویہ خوشگوار ہو چلا تھا۔ امینہ نے یہ تبدیلی دیکھ کر کہا ۔۔"ایدھی مسکرا رہا ہے۔ ارے یہ تو ہنستا بھی ہے اور باتیں بھی کرتا ہے" ۔۔ لیکن بلقیس نے مذاقاً" کہا۔۔۔۔"ہاں وہ تو زندہ بھی ہے۔"

کیا اس نے مجھے مردہ تصور کر رکھا تھا؟ شاید وہ درست کہتی تھی۔ میں واقعی اپنی زندگی

کے اس طویل سفر میں شب و روز لوگوں کو دفناتے ہوئے' شاید خود بھی مر چکا تھا ۔۔ کسی کا اکلوتا بچہ' اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے معصوموں کو بے آسرا چھوڑنے والی ماں' پورے گھرانے کا کفیل باپ ۔۔۔ میں جب ان سب لوگوں کے جنازے اٹھاتا تو ایسا لگتا کہ ہمیشہ کیلئے موت کے حصار میں گھر گیا ہوں۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ انسانی وجود' ایک ہی سانس کا مرہون منت ہے۔ میں ان منظروں میں انسانی زندگی پر اچانک محیط ہونے والے ان ہیبت ناک سایوں کو دیکھ کر کیسے زندہ رہ سکتا تھا' جبکہ موت ایک سے دوسرے' وہ نہ سہی تو پھر تیسرے کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہتی۔ یہ کام کرتے' چودہ برس بیت چلے تھے۔ سماجی بہبود کے ادارے کو' ایمبولینس اور ابتدائی ڈسپنسری پر مشتمل ایک صنعت کا درجہ مل چکا تھا۔ مجھے یہ سارے مہ و سال' اس کی گہری بنیادیں کھودنے میں لگے۔

بلقیس' روزانہ صبح ہی صبح' نرسوں والے سفید یونیفارم میں ملبوس آموجود ہوتی ۔۔ میں اس کی راہ تک رہا ہوتا۔ کبھی کبھار ۔۔۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمٹ سی جاتی ۔۔ اور مجھے بیتاب کرتی تیزی کے ساتھ چلی جاتی۔ لیکن دوسرے کمرے میں جا کر' زور دار قہقہہ لگاتی' جسے سن کر میں کمرے میں داخل ہوتا تو فوراً" سنجیدہ ہو جاتی۔

بلقیس کی نکھری نکھری رنگت' نازک سراپا' لمبے بالوں کو چہرے پر سے جھٹکنے کا انداز اور سلیقے سے چوٹی بنانا ۔۔ گویا یہ میرے صبر و قرار کی آزمائش تھی۔ بلقیس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی تابانی' اس کی نیکی اور شرافت پر گواہ تھی ۔۔ ضروری نہیں تھا کہ ان آثار کو تلاش کیا جائے ۔۔۔ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ سے عیاں تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی دکھ نہیں دیکھا۔

اگرچہ ہمجولیوں سے اس کی گپ شپ' کام میں حائل نہ ہوتی لیکن تھی وہ بڑی باتونی ۔۔۔ سارا کام بھاگ کر کرتی اور باقی لوگوں کے مقابلے میں آدھا وقت لیتی۔ سیڑھیاں چڑھتے اترتے' ٹیکہ لگاتے اور فرش صاف کرتے' بے تکان باتیں کرتی جاتی۔ جب کبھی ڈسپنسری میں کوئی میت آتی تو اسے چپ لگ جاتی۔

بلقیس کی والدہ' رابعہ ماں تقسیم ہند کے بعد انیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ بیٹی کے علاوہ ان کے دو بیٹے بھی تھے ۔۔۔ وہ اپنی والدہ' بہن اور بھائی کے ہمراہ پاکستان آکر آباد ہوئیں۔ بلقیس کے ماموں نے دکان کا کاروبار یوں سنبھالا کہ پہلے تو منافع اڑاتے رہے

اور پھر غیر ضروری اسراف میں، دکان کا بنیادی سرمایہ بھی ضائع ہو گیا۔ بچوں کی کمسنی کے باعث، رابعہ ماں نے اصرار کے باوجود، دوسری شادی نہیں کی اور مریم استانی نامی ایک خاتون کے ساتھ مل کر، بیس روپے ماہانہ کی نوکری کر لی۔ بعض اوقات اضافی پڑھانے پر انیس بیس روپے زائد ملتے۔ بلقیس کی چچی کے انتقال کے بعد خاندان والوں نے ان کی شادی تجویز کی تو انہوں نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا۔۔۔"میری اولین ترجیح، اپنے تین بچوں کی پرورش اور تربیت ہے۔"

رابعہ ماں مجھے بہت اچھی لگیں۔ وہ ایک سنجیدہ خاتون تھیں۔ ان کی یہ خاصیت فوری طور پر بلقیس کے حق میں گئی۔ جب رابعہ ماں کام پر جاتیں تو ان کے بچوں کی نگہداشت، بلقیس کی خالہ کے ذمے ہوتی جو زچہ خانے میں ایک تربیت یافتہ دایہ کی حیثیت سے رات کی ڈیوٹی کرتی تھیں۔ خالہ نے امینہ کو بتایا کہ میری بہن نے کبھی زکوٰۃ نہیں لی کیونکہ اس کے خیال میں زکوٰۃ ایک ایسا نمک ہے جو مٹھی میں آتے ہی گھل جاتا ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ زندہ رہنے کے لئے باعزت ذریعہ، مزدوری کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس بات نے مجھے بلقیس کی پرورش کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ پڑوسیوں سے سنا کہ رابعہ ماں ایک خدا ترس خاتون ہیں۔ چار مرتبہ حج کر چکی ہیں، باقاعدہ نماز پڑھتی ہیں، ہر مہینے پورے قرآن کی تلاوت کرتی ہیں اور ہر ماہ گیارہ روزے رکھتی ہیں۔ البتہ وہ سخت گیر تھیں۔ یہ خاندان، میری کفایت شعار فیملی سے قدرے مختلف تھا۔ تھوڑا بہت جو کچھ بھی کماتے اسے فلم بینی کے چسکوں اور کیماڑی کی سیر و تفریح میں دریا برد کر آتے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کی مدد بھی کرتے رہتے ۔۔۔ وہ ہمیشہ خوش باش رہنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے کھارادر میں دو کمروں کے مکان میں، سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ ان کے پڑوسیوں نے بتایا کہ گھرانے کے تمام افراد رات بھر مونگ پھلی چھیل کر اس کی اجرت سے سینما دیکھتے، کورس کی صورت میں فلمی گیت الاپتے اور ٹانگے میں گھومتے پھرتے رہتے۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ بلقیس اکثر گھر والوں سے بچ بچا کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ دوپہر کا شو دیکھتی ہے۔ بلقیس اور اس کی سہیلیاں جب دیکھتیں کہ ٹکٹ لینے والوں کا بہت ہجوم ہے تو وہ لمبی قطار کو توڑتی، اپنے سامنے کھڑی ہوئی خواتین کے ہینڈ بیگوں پر جھپٹنے مارنے کے انداز اختیار کرکے انہیں خوفزدہ کرتیں۔ اس طرح نوجوان لڑکیوں کا یہ شوخ و شنگ گروپ، باقی لوگوں سے پہلے ٹکٹ

حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن میں یہ سن کر بے حد لطف اندوز ہوتا، جب بلقیس پکڑی جاتی اور اس کی خوب شنوائی ہوتی۔

بلقیس کی عادت تھی کہ وہ کھارادر اور میٹھادر کی گلیوں میں پھیری ڈالنے والے چھابہ فروشوں سے کچھ نہ کچھ خرید کر کھاتی رہتی۔ سکول میں، شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا جب اس کی شوریدہ سری کے نتیجے میں، کوئی بحران نہ پیدا ہوا ہو۔ اسکول کے کام کی وجہ سے اسے اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے نوٹس مانگنا پڑتے تھے۔ لڑکیاں انکار کرتیں تو بلقیس ان کی کتابیں کھڑکی سے باہر پھینک دیتی۔ شکایات کا انبار لگ جاتا۔ استانیاں مداخلت کرتیں اور بلقیس رو دھو کر اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرتے ہوئے کہتی ۔۔۔"بے شک تلاشی لے لو۔" خطرہ ٹل جاتا تو عجیب سٹائل سے کہتی ۔۔۔"میں نے تمہیں پیار سے کہا نہیں تھا کہ نوٹس دے دو۔ اب وہ گم ہو گئے یا تم نے خود پھاڑ دیئے۔ میں نہیں جانتی۔"

لڑکیاں تکرار کرتیں، تو وہ ان کے قلم، چشمے اور پنسل بکس اٹھا کر پھینک دیتی۔ محض ایک ہیجانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اس نے یہ سب کچھ اپنا رکھا تھا۔ استانیاں روز اس کے کان کھینچتیں اور کلاس سے باہر نکال دیتیں۔

سکول کے باہر سادہ لوح چھابڑی فروشوں کو اپنی دلفریب مسکراہٹ سے بیوقوف بنانا اس کا معمول تھا۔۔۔۔"ماسی! لاؤ تمہارے چنے بیچ دوں۔ میں اس تیزی سے بیچوں گی کہ تم گھر جا کر اور چنے تیار کر لاؤ گی۔" اسے ہمیشہ اجازت مل جاتی۔ پھر سب لڑکیاں، مصالحے دار چنوں کی پلیٹیں لئے ادھر ادھر پھرتیں ۔۔۔ اسی دوران بلقیس بہت سارے چنے اخبار میں لپیٹ کر ایک جھاڑی تلے رکھ آتی جنہیں اس کی سہیلیاں وقفے وقفے سے اٹھا لے جاتیں، ماسی، بلقیس کے متعلق دوسروں کو بتاتی ۔۔۔"آج تو مجھے ایک فرشتہ مل گیا، جس نے میرا سارا مال اتنی جلدی بکوا دیا"۔ بالآخر بلقیس کو سکول سے اٹھا لیا گیا۔ پہلے اسے سلائی، کڑھائی کے کورس کروائے گئے لیکن دونوں مرتبہ نظم وضبط کی پابندی نہ کرنے پر یہ کام بھی چھڑوا دیا گیا۔

ان دنوں قدرتی گیس نہ تھی ایندھن کے لئے گوبر کے اپلے استعمال ہوتے تھے۔ بلقیس کو جب کبھی گوبر اٹھانے کے لئے کہا جاتا تو اس کا مزاج بگڑ جاتا۔ بھوسے اور گوبر کا آمیزہ بناتے اور اسے چھت پر ڈالتے ہوئے متواتر روتی، بڑبڑاتی اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی رہتی۔ وہ غصے سے گوبر کا گولہ بنا کر دیوار پر دے مارتی۔ اس کا یہ شکوہ بھی جاری رہتا

کہ اس کام سے اسے بڑی گھن آتی ہے۔

گھر کا کوڑا کرکٹ اکٹھا کرتے ہوئے بھی اس کا یہی رویہ ہوتا اور انکار کرنے پر خالہ اس کی پٹائی کرتیں۔ چارو ناچار' کام کرکے دروازے پر آکھڑی ہوتی اور خالہ سے چلا کر کہتی —"میں نے مردے کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب تو چوم لیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ زچہ بچہ مرکز کی لیڈی ڈاکٹر دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں بلقیس کو کچھ زیادہ ہی طلب کرتی تھی۔ "بلقیس تم کہاں ہو — دیکھو جب میں بلاؤں تو بھاگ کر آیا کرو۔"

ہر شخص کی زبان پر بلقیس بلقیس کا ورد تھا۔ یہ سن کر مجھے اس سے زیادہ' اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ مجھے رنج تھا کہ اس لڑکی نے کام کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ یہ کوئی سلائی کڑھائی کی کلاس نہیں تھی۔ پشیمان تھا کہ یہ سب کچھ کب' کیوں اور کیسے ہونے دیا گیا! میں غصے اور ملال کی کیفیت سے دوچار وارڈ کی طرف چل پڑا۔

جاتے ہی لیڈی ڈاکٹر سے بلقیس کے بارے میں سختی سے پوچھا تو یہ سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ "ایدھی صاحب! آج تک جو بھی لڑکی میری نظر سے گزری ہے' میں نے بلقیس کو ان سب میں سے اعلیٰ کارکن پایا ہے۔ وہ ہمیشہ مختصر وقت میں' کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر' مکمل اور بھرپور کام کرتی ہے۔ ہر شخص اسے پسند کرتا ہے۔ مریض اسے بلاتے ہیں۔ ساتھی لڑکیاں اسے چاہتی ہیں اور میں بھی اس کی کمی محسوس کرتی ہوں۔"

یہ سن کر میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا لیکن اس کے باوجود' یہ لڑکی میرے اعصاب پر سوار رہی۔ میں اسے پسند کرنے لگا۔ شام کے وقت جب وہ کالے برقعے میں ملبوس ہوتی تو اس کا چہرہ' سیاہ پس منظر میں دمکتا دکھائی دیتا۔ اب مجھے اپنی وہ وحشت یاد آئی جب میں نے امینہ کو شادی کا پیغام دیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس کے بعد اس حوالے سے انکار کی ایک لمبی لائن — میں وہی طریق کار اختیار کرکے دوبارہ مایوس اور افسردہ نہیں ہونا چاہتا تھا..... شبہات نے سر اٹھایا..... بلقیس کچھ زیادہ ہی خوش فہم معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے شادی سے اس کا مقصد محض دولت کا حصول اور عیش و عشرت ہی ہو۔ میں یہ سوچ کر ایک طرف ہو گیا اور شادی کے خیال سے کترانے لگا۔

ایک روز وہ گاجر کا حلوہ اٹھائے میرے پاس آئی اور لجاتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کے

لئے میری ماں نے پکا کر بھیجا ہے۔" حیرت ہے کہ آج تک میرے لئے تو کسی نے بھی کچھ پکا کر نہیں بھیجا تھا.....! میں نے ٹفن لے کر اس کے سامنے کھولا اور یہ سوچتے ہوئے کہ یقیناً" اس کا کوئی مطلب ضرور ہے۔ شاید وہ مجھے پسند کرتی ہو..... دفتر کی میز پر پہلی بار کچھ کھاتے ہوئے محسوس ہوا' ممکن ہے وہ عندیہ دینا چاہتی ہو کہ میں ہی اس کے مستقبل کا شوہر ہوں۔

ڈسپنسری میں ایک لاوارث بچی لائی گئی۔ اسے بلقیس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ جب بھی وہ اسے معائنہ کے لئے لاتی تو بات کرنے کا موقع مل جاتا۔ بلقیس سے متوقع انکار کے خوف سے ایک عرصہ تک' باقاعدہ شادی کے لئے نہیں کہا۔ اب صورت حال قدرے مختلف تھی۔ یہ بھی سنا کہ کوئی اور لڑکا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ جان کر اس لئے حیران نہیں ہوا کہ بلقیس' شباب کے ایک ایسے عالم سے گزر رہی تھی کہ جہاں لڑکے لڑکیاں' ایک دوسرے کو پسند کرتے ہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکا کافی متمول' پڑھا لکھا اور خوبرو ہے— میں جہاں تھا' وہیں ٹھہر گیا — تاہم اسے جب بھی دیکھا' ایسے لگا کہ — کیا یہی میرا نصیب تو نہیں؟

اپنی شریک حیات کے بارے میں یہ سوچ کر ہمیشہ محتاط رہا کہ اس کے جذبات' قوت برداشت اور نصب العین کو مجھ سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ جانتا تھا کہ ہمارے درمیان' کوئی بھی اختلاف' میرے عزائم' مقاصد اور سماجی بہبود کی عمارت میں شگاف ڈال سکتا ہے۔ اپنے قرب و جوار میں' ناکام شادیوں کی وجوہ پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ جہاں آکر ان شادیوں نے دم توڑ دیا ہے' وہاں سے تو ان کا آغاز ہونا چاہئے تھا۔ جھگڑا اس وقت شروع ہوتا ہے جب ایک' دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مرد' کچھ زیادہ ہی تجاوز کر جاتے ہیں جبکہ عورتیں اپنی ساری عمریں' دفاع میں گزار دیتی ہیں۔

ایک روز' بلقیس' میٹرنٹی وارڈ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو میں نے اسے آواز دی — "کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ کام کرتی رہو گی؟"

یہ سن کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ سوال ہی ایسا تھا جس نے ہم دونوں کو حیران کر دیا۔

"ہاں" — کہہ کر وہ تیزی سے زینہ چڑھتی چلی گئی۔ میں اپنے احمقانہ اور مبہم سوال پر

برا فروختہ تھا۔ اس نے تو کام کرنے کی حامی بھری تھی نہ کہ شادی کی۔ اب اس موضوع پر کچھ زیادہ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ شاید ایک اور کوشش درکار تھی ۔۔۔ خدشہ تھا کہ کہیں وہ کسی اور سے شادی کی حامی نہ بھر لے۔

بتایا گیا کہ امینہ جونیئر لڑکیوں پر رعب جما کر' انہیں ڈراتی دھمکاتی رہتی ہے۔ وہ انہیں سارا دن کام پر لگائے رکھتی۔ یہ بھی سنا کہ وہ نقل اتارتے ہوئے میرا مضحکہ یوں اڑاتی ۔۔۔

"لڑکیو! اپنی سانسیں روک کر کام کرو ورنہ یہ مولوی ۔۔۔ تمہیں جان سے مار دے گا۔"

بعض اوقات' امینہ بڑے دعوے سے شیخی بگھارتی کہ

"مجھے تو اس نے شادی کے لئے کہا تھا لیکن میں نے یہ سوچ کر انکار کر دیا کہ دلہن بنا کر مجھے بینچ پر بٹھا دیا جائے گا اور انسانوں کی بجائے' لاشیں شادی میں' مہمان ہوں گی۔"

یہ سن کر لڑکیاں' قہقہہ لگاتیں۔ انکار کرنے والی دوسری لڑکیوں نے بھی کہا۔۔۔۔

"اگر ہم اس شخص سے شادی کرتیں تو یہ ہمیں باسی اور سوکھی روٹیاں کھلا کھلا کر مار دیتا۔ اچھا ہوا کہ خدا نے ہمیں بچا لیا۔"

ایک روز' بلقیس کو سٹور کی طرف جاتے دیکھا تو پیچھے ہو لیا۔ کمرے کی بتی جلانے کی کوشش کی' بلب فیوز تھا۔ وہ تاریکی میں راستہ ٹٹولتی آگے بڑھی۔ میری موجودگی کو محسوس کر کے چونک سی گئی۔

"میں ہوں ۔۔۔ ادھر" میں بولا۔

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس لمحے' بدحواسی میں' منہ سے یہی نکلا ۔۔۔ "کیا ۔۔۔ شادی کرو گی؟"

یہ الفاظ' تاریکی میں' اس وقت تک معلق رہے جب تک اس نے یہ نہیں' کہہ دیا۔۔۔۔"میں بھلا کیونکر ہاں کہہ سکتی ہوں۔ خالہ سے بات کریں۔"

یہ سن کر مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کے جواب پر نہیں بلکہ اس پر کہ آخر کار میں نے ایک قدم آگے بڑھا لیا تھا۔

اسی رات' خالہ سے بات کی تو انہوں نے رابعہ ماں سے گفتگو کر کے مجھے مطلع کرنے کی حامی بھر لی۔ اگلی صبح' بلقیس کام پر آئی تو اس کے چہرے پر گزشتہ روز کے واقعے کا کوئی تاثر نہ دیکھ کر' اطمینان ہوا۔ وہ ان دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں تھی جنہوں نے شادی جیسے

اہم مسئلے کو مذاق سمجھ کر اڑا دیا تھا۔ نجی معاملات کو' خود تک محدود رکھنے کی صلاحیت' اس میں بدرجہ اتم موجود تھی' جس سے مزید تقویت ملی کہ ۔۔۔ وہی میری بیوی بنے گی۔

میں اب بھی' گلیوں سے کوڑا کرکٹ اٹھانے اور ضرورت پڑنے پر بند گٹر کھولنے کا کام کرتا تھا۔ اپنے کپڑے خود دھوتا اور سوکھی روٹی کھاتا لیکن ادارے کے ایک بااختیار و کامیاب سربراہ کی حیثیت کا احساس بھی ہو چلا تھا۔ ہر صبح' رش کے اوقات میں' کپڑے کا تھیلا ہاتھوں میں لئے' سڑک پر کھڑا ہو جاتا اور لوگوں سے عطیات کی اپیل کرتا۔ ساتھیوں نے سڑک پر خود جا کر بھیک مانگنے کے انداز کو پسند نہ کیا۔ اپنی پوزیشن کو واضح کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔"غرور توڑنے کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ سڑکوں پر مانگنے سے' عاجزی پیدا ہوتی ہے۔" یہ جواب سن کر وہ حیرت سے دیکھتے تو میں کہتا ۔۔۔ "جب میری تعریف کی جاتی ہے تو میں بھی عام انسانوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ اپنی اصل حیثیت کو یاد رکھوں۔ لوگوں کی بھلائی کے لئے ان سے خیرات مانگتا ہوں ۔۔۔ کوئی سیاسی رہنما نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی ولی ۔۔۔۔ چلتا پھرتا فقیر ہوں۔"

جب کسی چوک میں کھڑا ہوتا تو کچھ کاریں پاس آ کر رک جاتیں اور کوئی شخص تیزی سے ہاتھ نکال کر میرے کشکول میں کچھ نہ کچھ ڈال جاتا۔ لوگ' اس عجلت میں یہ جاننے کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ میں کون ہوں اور کیا مانگ رہا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زندگی کے مسائل نے' ہر شخص کو افراتفری میں مبتلا کر رکھا تھا۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ کسی بڑے آدمی کا کوئی ڈرائیور' گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے بھاگ کر آتا۔۔۔۔ کچھ پیسے دیتا اور استدعا کرتا کہ میں اس کی ترقی و کامرانی کے لئے دعا کروں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جو صلے کی پرواہ کئے بغیر' کچھ نہ کچھ میری جھولی میں ڈال جاتے۔ میں نے اس گداگری کے دوران' محسوس کیا کہ لوگ جرائم کی سزاؤں سے بچنے' اپنے گناہوں کی مغفرت اور مختلف خاندانی جھگڑوں میں فتح یاب ہونے کے لئے خیرات کرتے ہیں ۔۔۔ بمشکل تمام کوئی ایسا بھی ہو گا جو محض بندگان خدا کی بھلائی کے لئے عطیہ دیتا ہو۔ خود فریبی نے' دنیا والوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

دو ماہ کے دوران' کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ایک روز میرے ساتھی' دفتری کاغذات سمیٹنے میں ہاتھ بٹا رہے تھے کہ بلقیس' سیاہ برقعے میں ملبوس' اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کی آنکھیں' نقاب کے عین اوپر جگمگا رہی تھیں۔ حجاب میں سے جھلکتی ہوئی مسکراہٹ نے میرے دل کو گرما دیا۔ دوستوں کی موجودگی کے احساس سے قدرے شرمسار ہو گیا اور بلقیس کو' جلدی سے اوپر جا کر میٹرنٹی ہوم صاف کرنے کو کہا۔

خالہ کی وساطت سے' بلقیس کی ماں کو پیغام ملا تو انہوں نے میری مالی حالت کے بارے میں اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔"میری بیٹی کیا کھائے گی۔ میں ایسے غیر محفوظ حالات میں بلقیس کا ہاتھ' ایدھی کے ہاتھ میں کیسے دے سکتی ہوں۔" میں نے خالہ کو یقین دلایا "میں نہ تو کسی کے بھروسے پر زندہ ہوں اور نہ ڈسپنسری سے کچھ لے رہا ہوں۔ ذاتی آمدنی سے' پورے خاندان کو پال سکتا ہوں۔" رابعہ ماں نے اس کام کو سرانجام دینے کے لئے مریم استانی سے کہا کہ وہ ساری بات بلقیس کو بتائے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دے۔

بلقیس نے' فلموں میں دلیپ کمار اور راج کپور کو دیکھ دیکھ کر' اپنے ذہن میں انہی جیسے رومانوی ہیروز کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا جن سے میری کوئی مماثلت نہ تھی۔ جب امینہ کو اس نامہ و پیام کا علم ہوا تو اس نے بلقیس کو خبردار کرتے ہوئے کہا......

"یہ شخص تمہیں اپنی مرضی کے بغیر سانس تک بھی نہیں لینے دے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کتنا جنونی ہے۔" امینہ نے خالہ اور رابعہ ماں سے بھی کہا ۔"ایدھی نارمل انسان نہیں' وہ "جن" کی طرح ہے۔ اس کے شکنجے میں جا کر' تمہاری بیٹی مرجائے گی اور پھر تم اسے' کبھی بھی نہ دیکھ سکو گی۔"

سہیلیوں نے بھی اسے سمجھایا "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ اس مولوی کے پاس ہے کیا کہ وہ تمہیں کچھ دے سکے۔ وہ کمرے میں بند کرکے ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنی کنیز بنا لے گا۔"

انہوں نے' اسے کسی امیر کبیر لڑکے کے ساتھ شادی کا مشورہ دیا اور طنز کیا ...." ہمارے خاوند تو' ہمیں سیرو تفریح کے لئے گھمانے لے جایا کریں گے ... تمہارا شوہر' تمہیں صرف قبرستانوں تک ہی لے جائے گا۔" ایک اور سہیلی نے یوں لقمہ دیا ... "ہم بناؤ سنگھار کریں گی اور تم مردے نہلاتی دفناتی پھرو گی۔" پھر سب قہقہے لگاتیں اور بلقیس بھی ان میں شامل ہو جاتی۔

میمن سیٹھوں نے میرے خلاف چلائی جانے والی مہم میں' ایک بار پھر چھلانگ لگا دی۔ بلقیس کے چچا کو' اس کے انچارج افسر کے ذریعے' پچیس ہزار روپے کی پیشکش کی گئی کہ وہ

عدالت میں جا کر بیان دے کہ ایدھی نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہے ... رابعہ ماں نے اس منصوبے کو فوراً" مسترد کر دیا۔ میرے ساتھی بھی اس بات کے مخالف تھے' کہ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کروں جو عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ انہوں نے پیش گوئی کی "جس روز ایدھی نے اس سے شادی کی' اس دن اس کا مشن' دم توڑ دے گا اور سارا کام ایک دم ٹھپ ہو جائے گا۔" لیکن ان تمام آراء کے باوجود' بلقیس کا فیصلہ' اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھا بھی تھا اور دلیرانہ بھی۔

اب بلقیس نے' شادی کی تیاریوں کے لئے ڈسپنسری آنا' جانا ترک کر دیا تھا۔ شادی کے تصور سے میں بھی خوش تھا۔ خالہ سے سنا کہ رابعہ ماں نے بلقیس کو نئے کپڑے سلوانے کے لئے پانچ سو روپے اور شادی کے دن پہننے کے لئے پندرہ تولے سونا بطور جہیز دیا ہے۔ انہوں نے باورچی خانے کے لئے ضروری سامان پہلے ہی جمع کر رکھا تھا۔ مجھے یہ تجویز ایک آنکھ نہ بھائی۔ میں نے لڑکی والوں کی طرف سے اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ شادی والے روز' میں ایک روایتی دولہا بن کر آؤں۔ انہیں صاف بتا دیا کہ میرے پاس پہننے کے لئے صرف دو پرانے جوڑے ہیں۔"

والد اور عزیز بھائی کے ساتھ مسجد پہنچا اور نکاح نامے پر دستخط کر دیئے۔ باقی امور طے کرنے کے لئے مولوی صاحب' دلہن کے گھر گئے۔ بارات روانہ ہونے ہی والی تھی کہ اچانک اطلاع ملی ... ایک بچہ قریب المرگ ہے' اسے فوری طور پر ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ دم توڑ دے گا ... اس بھاگ دوڑ میں یہ بھی ہوش نہ رہا کہ میری زندگی کی ساتھی' انتظار کر رہی ہو گی ...!

بلقیس کے ساتھ شادی' 19 اپریل 1966ء کو ہوئی۔ میں نہ تو بلقیس کی رخصتی کے موقع پر موجود تھا اور نہ شادی کی دیگر تقریبات میں ... بلقیس نے شادی کی پہلی شب' اپنے رشتہ داروں کے ہاں گزاری۔ اگلی صبح' ماں کے ساتھ گھر آئی۔ اس دوران میں' اتنا عدیم الفرصت رہا کہ اس سے کوئی رابطہ نہ کر سکا۔

پورے علاقے میں شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مخالفین کو میرا سکون اور قرار کب گوارا تھا۔ لوگوں سے کہا گیا کہ جو لاوارث بچہ بلقیس نے اپنا لیا تھا' وہ اصل میں اس کا اپنا بچہ تھا۔ پھر کیا تھا! ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا ...

"ایدھی کو نکال دو۔ وہ ایک گنہگار شخص ہے۔"

کچھ لوگ، مجھ سے ڈسپنسری کی چابیاں لینے بھی آن پہنچے ..... اس نازک موقع پر، میمن برادری میں سے، ایک دوست نے، پچاس ہزار روپے کا علی الاعلان عطیہ دے کر، مجھے اس مشکل سے نکالا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ادارے کا وقار مجروح نہ ہوا ..... والد نے ہمت بندھائی ..... "اگر تم اپنے اصولوں پر کار بند رہے تو کوئی دشواری، حائل نہیں ہو گی۔"

اس دوران بلقیس، میری عدم موجودگی میں، بہت خوش و خرم رہی۔ اس نے نئے کپڑے پہن کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ، سہیلیوں سے پوچھا ..... "بتاؤ، میں کیسی لگ رہی ہوں؟"...... جب اس سے پوچھا جاتا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے تو وہ بڑی بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیتی "مجھے کیا معلوم، میں تو صرف دلہن ہوں۔"

تمام ہنگاموں کے بعد، آخر کار اپنے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے بلقیس کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خائف تھا کہ وہ شکوے کرے گی، لیکن اس نے کمال سگھڑاپے سے کمرہ صاف کر رکھا تھا اور کھانے کا اہتمام بھی۔ مختصر سی وضاحت نے اسے مطمئن کر دیا۔ اصل میں ہم دونوں شرم و حجاب کے ہاتھوں خاموش تھے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں ملانے کی بجائے کبھی فرش اور کبھی چھت کو دیکھتے ..... یوں ہمارے ازدواجی مکالمہ کا آغاز ہوا۔

ایک رات، تاخیر سے گھر پہنچا تو باہر بینچ پر ہی سو گیا۔ علی الصبح، بلقیس میرے پاس آئی اور سبز چائے کے ساتھ باسی روٹی دیتے ہوئے کہا...... "اب میں آگئی ہوں، آئندہ تمہیں تازہ کھانا ملا کرے گا۔" میں نے بلقیس کی اس پیشکش کو محض وہم کی بنیاد پر ٹال دیا۔

"کہیں میرے طرز زندگی کو تبدیل کرنے کی، یہ کوئی ملی بھگت تو نہیں؟" پھر اسی شام میں نے دیکھا کہ وہ پوری تندہی کے ساتھ میٹرنٹی یونٹ میں کام کر رہی ہے۔

روایت عام ہے کہ شادی کے بعد دلہن آرام کرتی ہے۔ ابتدائی دنوں میں شوہر اور سسرال والے، اس کی خاطرمدارات میں لگے رہتے ہیں لیکن بعد میں اکثریت غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ بلقیس، جب اپنے معمول کا لباس پہن کر نیچے اتری اور فرش صاف کرنا شروع کئے تو دوسری لڑکیوں نے افسوس کرتے ہوئے اسے سمجھایا ..... "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے ..... تم تو ابھی نئی نویلی دلہن ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایدھی تمہیں عمر بھر اسی کام پر لگائے رکھے۔" بلقیس نے جواب دیا...... "میں ابتدا سے ہی، اپنے شوہر کے طرز زندگی پر عمل پیرا ہونا چاہتی ہوں۔ چند روز آرام کرنا بھی کیا ہے۔ اپاہج تو نہیں ہوں۔"

لڑکیوں نے، پرانے لباس پر طعنے دیئے اور سمجھایا...... "اوپر جاؤ اور بناؤ سنگھار کر کے آؤ۔ اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانو ورنہ تمہاری حیثیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔" بلقیس کا یہی جواب تھا ..... "ایدھی نے مجھے بیوی کا رتبہ دیا ہے۔ اس کی اپنی حالت بھی تو دیکھو۔ میں اس سے مختلف کیسے ہو سکتی ہوں۔" سوچ کی اس پختگی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

ایک شام میں نے دیکھا کہ بلقیس، اپنے کمرے میں شادی کا جوڑا پہنے کھڑی ہے۔ سفید گھونگھٹ کے پیچھے اس کا چہرہ، ایک روشن فانوس کی طرح جھلملا رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر، مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے کہا...... "بھلا اس اہتمام کی کیا ضرورت تھی ....." وہ اچانک بھڑک اٹھی ..... "یہ بھی کوئی شادی تھی؟ نہ پھول، نہ سیج۔ بس ایک میلی کچیلی چادر اور خالی کمرہ۔ کیا میں چند لمحے تنہائی میں بھی دلہن نہیں بن سکتی۔"

اس پر میں نے اس کی دلجوئی کے لئے، منہ دکھائی کے طور پر اڑھائی سو روپے دیئے اور کہا...... "اس اسراف بیجا کا تذکرہ کسی اور سے نہ کرنا۔" بلقیس نے، صورت حال کو مزاحیہ رنگ دیتے ہوئے کہا...... "اف! اتنی بڑی رقم؟ ڈرتی ہوں، لوگ حسد سے مر ہی نہ جائیں۔"

ایک روز، میں اس کے چہرے پر غازے کا لیپ دیکھ کر معترض ہوا۔ اس نے شوخی سے جواب دیا ..... "کیا عورت کا حق نہیں کہ وہ بھلی لگے۔" یہ کہہ کر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ میں نے اسے سمجھایا ..... "بلقیس! فطری حسن کو کسی آرائش کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

بلقیس، ان لوگوں میں گھری ہوئی تھی جو سرمائے کی طاقت کے زیر اثر تھے۔ اس کی سہیلیاں، عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اس تمام صورت حال پر امینہ کا یہ پروپیگنڈا، جلتی پر تیل کا کام دیتا ..... "امیر لوگ بہت نصیبوں والے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے بنگلوں میں رہنے اور قیمتی کاروں میں سفر کرنے سے وہ زندگی کے بارے میں ہم سے کہیں زیادہ باخبر ہوتے ہیں" ..... بلقیس دفاع میں کہتی ..... "امینہ! میرے خیال میں ایک کامیاب شادی کیلئے دیگر آسائشوں سے زیادہ خوش مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس پر امینہ اپنی بھنویں اوپر چڑھاتے ہوئے کہتی ..... "کیا ایدھی ایسا ہے؟"......

میں نے بلقیس سے کہا "ہمارے سامنے' سماجی انقلاب لانے' کا عظیم مقصد ہے۔ کیا تم اس کی تکمیل میں میرا ساتھ دو گی؟" وہ کچھ افسردہ ہو کر کہتی ....

"تم میرے ساتھ تنہائی میں باتیں کیوں نہیں کرتے۔" میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا .... "بلقیس! ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔ آؤ' میرا ساتھ دو۔"

ایک رات' باہر بینچ پر لیٹے ہوئے ریڈیو پر فلمی گانے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ آواز میرے کمرے سے آرہی ہے۔ غصے میں لال پیلا کمرے کی طرف دوڑا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے ریڈیو بند کر دیا اور چلا کر بلقیس سے کہا۔

"یہ چیزیں انسان کو اصل مقاصد سے دور لے جاتی ہیں۔ آخر تم سمجھتی کیوں نہیں؟"

میرے تلخ اور جارحانہ انداز گفتگو سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ الٹا اس نے وہ گیت وہیں سے گنگنانا شروع کر دیا جہاں سے میں نے اسے ٹوکا تھا۔

".... کسی کے دل میں رہنا تھا تو میرے دل میں کیوں آئے۔"

میں نے بمشکل تمام ہنسی کو ضبط کر لیا' اس نے اس کیفیت کو بھانپ لیا اور جھوٹ موٹ کی رونی صورت بناتے ہوئے کہنے لگی ...."اگر آپ کو صرف کام سے محبت تھی تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی۔" میں نے ایک بار پھر وضاحت کرنا شروع کی مگر رک گیا .... بلاشبہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہئے تھا لیکن میرے پاس وقت تھا ہی کہاں .... افسوس کہ میری بے پناہ مصروفیات نے' ہم دونوں سے نشاط کے وافر لمحات چھین لئے تھے۔

خاندانی روایات کے مطابق' بلقیس برقعہ اوڑھتی تھی۔ اس نے پردے کے باعث' کام کاج کے دوران پیش آنے والی دقت کے بارے میں بتایا تو میں نے کہا ...." حجاب میں بھی توازن برقرار رہنا چاہئے۔ پردہ' پاکیزگی اور حیا کی علامت ہے" .... بعد ازاں اس نے برقعے کی جگہ' چادر کا استعمال شروع کر دیا۔

عام لوگوں سے میرا' ایک عمر کا واسطہ تھا۔ ان سے میل جول اور ان کی عادات و اطوار کے مشاہدے سے انہیں پرکھنے میں بڑی مدد ملی۔ معمولی چوریاں بھی پکڑی جانے لگیں .... کارکن' مجھے ناخواندہ احمق سمجھتے تھے لیکن مجھے گھپلوں کی نشاندہی اور مجرموں کی شناخت میں خاصی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ رات کے کھاتے الگ کر دیتا اور فردا" فردا" ان پر نگاہ رکھتا۔ کوئی چوری کرتے پکڑا جاتا تو اسے یکدم ملازمت سے سبکدوش کرنے کی بجائے

اس کی عادات و اطوار اور نقل و حرکت کا مطالعہ کرتا تاکہ جان سکوں کہ تھوڑی چھوٹ دینے سے وہ کہاں تک جا سکتا ہے۔ آغاز کار میں' ایسے ہی انوکھے تجربے کرتا رہا......

خفا ہونے یا دباؤ ڈالنے سے' عیار آدمی اپنے کرتوتوں میں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ جب بھی کوئی کارکن' چوری کیلئے نیا سوراخ نکالتا' میں اسے بند کر دیتا لیکن وہ یہ جانے بغیر کہ اس کی باقاعدہ نگرانی کی جا رہی ہے' ایک سے دوسرے سوراخ کی ٹوہ میں لگا رہتا۔ جب اس کے سوچے ہوئے' چوری کے تمام راستے مسدود ہو جاتے تو یا وہ حلال کی کمائی پر اکتفا کر لیتا یا پھر نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ تجربے میں کئی چور آئے .... ہر ایک کے پاس واردات کا اپنا ہی طریقہ ہوتا۔

جو لوگ نظریاتی بنیادوں پر کام کر رہے تھے' اس مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو محض وقت گزاری کے لئے آئے تھے یا سیٹھوں کی جاسوسی پر مامور تھے' خود ہی چلتے بنے .... لیکن وہ کارکن جن کے پیش نظر کوئی نصب العین تو نہ تھا لیکن وہ اپنے قبیلے یا خاندان کے کفیل ہونے کی بنا پر توجہ کے مستحق تھے' انہیں بطور رضاکار رکھا گیا۔ انہیں ماہانہ الاؤنس بھی دیا جانے لگا۔ اتنا ضرور بتا دیا گیا کہ انہیں' اگر کوئی بہتر ملازمت مل سکتی ہے تو وہ میری نیک خواہشات کے ساتھ' ادارے کو چھوڑ سکتے ہیں .....اس کے باوجود' کئی مخلص اور محنتی کارکن مل گئے۔ ان کے ماضی و حال سے متعلق کسی چھان بین کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے تو محض ان کی اہلیت کار اور کام کرنے کے جذبوں سے سروکار تھا۔

ادھر زچہ خانے کے سٹاف کو سختی سے کہہ دیا گیا کہ وہ مریضوں سے حق خدمت کے طور پر پیسے یا تحفے تحائف نہیں لے سکتے اور نہ ہی انہیں اوپر جاکر کھانے پینے کی اجازت ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے' جب میں اکیلا تھا۔ اب تو میری بیوی بھی' میری معاون تھی۔ وہ کبھی کبھار ڈسپلن میں نرمی کرتی رہتی۔ اس بات کے شواہد موجود تھے کہ جب مریضوں کی جانب سے کارکن لڑکیوں کو انعام کی صورت میں کچھ ملتا تو بلقیس ان کی حوصلہ افزائی کرتی۔ اس نے تمام لڑکیوں کو ہلا گلا کرنے اور چائے سے لطف اندوز ہونے کی چھٹی دے رکھی تھی۔ سب کچھ جان کر بھی' عملاً" چپ رہا۔ ایک روز بلقیس نے خود ہی سارا بھانڈا پھوڑ دیا......

"اگر کوئی ماں یا اس کے قرابت دار' بچے کی ولادت پر خوش ہو کر' کسی کارکن لڑکی کو انعام میں کچھ دے دیتے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے ..... یہ تو خوشی کا موقع ہوتا ہے۔"

فرائض منصبی نے مجھ سے' زندگی کے کئی خوبصورت اور دلفریب لمحات' چھین رکھے تھے مگر ہمارے ازدواجی اور سماجی مراسم مضبوط ہو چکے تھے۔ بلقیس نے کئی مرتبہ' سماجی بہبود کے کام میں میری مصروفیات پر شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ ..... "کبھی ہم اپنی بھی بات کر سکیں گے؟" میرا جواب یہی ہوتا کہ اپنی باتوں کے لئے تو پوری زندگی پڑی ہے۔ بلقیس کہتی ..... "کل کی کسے خبر!"

بلقیس' حمل کے دورانئے سے گزر رہی تھی۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگی۔ ایک دم موڈی' مضطرب اور خاموش ..... اب اس میں پہلے جیسی شوخی بھی نہ رہی تھی ..... کبھی جی چاہتا تو زچہ خانے کی دیکھ بھال کر لیتی' کھانا پکاتی اور صفائی بھی کرتی ..... میں' اس کی دلجوئی کرتا' اس کے لئے پھل لاتا۔ روٹی پکاتا' کپڑے دھوتا ..... قریب قریب خانہ داری کا سارا کام سنبھالنا پڑ چکا تھا ..... وہ اس دوران بستر پر لیٹے' میری نگرانی کے فرائض سنبھال لیتی۔

مخالفین کا معاندانہ رویہ اب قدرے کم ہو گیا تھا۔ میں بھی نتائج سے بے پرواہ' کسی سے خوف زدہ نہ تھا اور نہ ہی لوگوں کے ردعمل کا دھڑکا تھا۔ مخالف عناصر' غیر اہم ہو چکے تھے۔ عزائم' اگرچہ پختہ ہو چکے تھے اور مشاورت کا بھی محتاج نہیں رہا تھا لیکن ان عزائم کو ابھی' ان ہزاروں برائیوں کی زد سے بچا کر رکھنا تھا جو بظاہر پر کشش تھیں ..... بے سروپا اور منفی پروپیگنڈے کی جگہ' میری مدح سرائی اور قصیدہ گوئی نے لے لی' لیکن میں نے اپنے آپ سے کہا ....."لوگوں کو کبھی اجازت نہ دینا کہ وہ تمہیں بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔ ان گنت لوگ محض اس لئے صفحہ ہستی سے مٹ گئے کہ انہوں نے اپنی کم مائیگی کو فراموش کر دیا تھا۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ تم ایک عام انسان ہو۔"

ڈسپنسری میں ہر وقت آنے جانے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آس پاس جتنی بھی جگہیں کرائے پر لی گئی تھیں' سب کی سب بھر گئی تھیں۔ زچہ بچہ وارڈ میں بھی' کوئی خالی بستر نہیں رہ گیا تھا۔ ٹریننگ سکول کے لئے جگہ بڑھا لی گئی تھی ..... اپاہج گھر میں بھی جگہ کم ہونے لگی تھی۔ لوگ تمام وارڈوں میں تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ اندرون سندھ اور پورے کراچی شہر میں' تنظیم کی کارکردگی کو سراہا جا رہا تھا۔ ایمبولینس گاڑیوں کا بیڑہ چودہ

تک بڑھ چکا تھا۔ واقعات و حادثات کی شبانہ روز مصروفیات اور تھکان نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ہنگامی حالات کے دوران' بلقیس نے بھی ساتھ جانا شروع کر دیا۔ ایک دن ایسے ہی موقع پر' ہم دونوں کو ایک انتہائی دلدوز سانحہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک لاپرواہ بس ڈرائیور نے محض چند لمحے بچانے کے لئے سینکڑوں کو سوگوار کر دیا۔ گاڑی ابھی محفوظ فاصلے پر تھی کہ ڈرائیور نے ریلوے کراسنگ عبور کرنے کی کوشش کی۔ ریل گاڑی' سمندری طوفان کی طرح امڈے چلی آ رہی تھی۔ بس' اس کے دیوہیکل وجود سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی ..... گاڑی پیچھے ہٹی تو انسانی گوشت کے ٹکڑے بکھر چکے تھے۔ ہم نے انہیں جمع کرنا شروع کر دیا۔

لوگوں کے لئے یہ منظر' مدتوں سوگوار رہنے کے لئے کافی تھا۔ بلقیس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے' بے تحاشا چیخ اٹھی ..... "مرنے والے تو گھر کی آس میں سفر کر رہے تھے۔ اچھی زندگی کے لئے' ان کے ذہن میں کچھ منصوبے بھی ہوں گے۔ سب چلے گئے؟ ..... خداوندا یہ کیا ہے .....□" میں نے کہا ..... "وہ چلے نہیں گئے بلکہ پیشگی اطلاع کے بغیر..... شاید موت نے انہیں لافانی بنا دیا ہو ..... عین تمہاری آنکھوں کے سامنے ہونے والا یہ سانحہ' اس حقیقت سے مطلع کرتا ہے کہ موت کے سائے ہمارے کس قدر قریب منڈلا رہے ہوتے ہیں ..... موت تو زندگی سے ایک قدم آگے' پیچھے یا دائیں بائیں ہی رہتی ہے ....."

گرمیوں میں معمول تھا کہ چار پانچ جوان لڑکے' سمندر کی ہولناک موجوں میں غرق ہو جاتے ..... ڈوبنے والوں کے لواحقین اور عزیز و اقارب' دھڑکتے دلوں اور آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ ..... ساحل سمندر پر زندگی کی آس لئے کھڑے ہوتے .....!

میانی کا ساحل حد سے زیادہ خطرناک تھا۔ ناظم آباد کالونی سے اکیس افراد پر مشتمل ایک خاندان' علی الصبح پکنک کے لئے روانہ ہوا۔ دوپہر تک چودہ افراد' طوفانی لہروں کی نذر ہو چکے تھے۔ ایمبولینس گاڑیوں نے ان کی لاشیں اٹھا کر' میٹھادر پہنچائیں۔ پورا علاقہ اس واقعے پر غم زدہ تھا۔ دکانیں سوگ میں بند تھیں۔ میں ایمبولینس کارواں کی راہنمائی کرتے ہوئے تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا۔ اطراف میں کھڑے حیرت زدہ' سوگوار لوگوں نے گاڑیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ملے جلے تاثرات' واضح طور پر نظر آ رہے تھے ..... موت کا خوف

اور ڈوبنے کی دہشت!

چودہ لاشیں ایک ساتھ ' لے جانا دشوار ترین مرحلہ تھا۔ ایک ملحقہ پلاٹ میں شامیانہ لگایا گیا۔ نماز جنازہ کے لئے ' تمام میتیں ایک قطار میں رکھ دی گئیں۔ حسب روایت وہی ہوا جو عموماً" دیکھنے میں آتا ہے۔ خاندان کے کچھ بزرگوں نے سعودی عرب سے آنا تھا جس کے باعث تدفین میں تاخیر ہو گئی۔ ہر لاش کو برف کے بلاکوں میں رکھ کر محفوظ کرنا پڑا۔ تمام رات اسی طرح بیت گئی۔

اس بد قسمت خاندان کے لئے رونے والی بس ایک بڑھیا رہ گئی تھی ..... بستی کے درو دیوار چیرتی اس کی فریادیں ' دور دور تک سنی جا رہی تھیں۔ جب ذرا تھکی تو سسکیاں بھرنے لگی اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مرنے والوں کی کہانیاں سنانا شروع کر دیں۔ آخر کار ایک نڈھال بچے کی طرح ' ساتھ کھڑی عورت کے بازوؤں میں لڑھک گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ کہے چلی جا رہی تھی ..... "میں نے بیٹیوں کے لئے عروسی جوڑے بنا رکھے تھے۔ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے۔" اس سے پہلے کہ جنازے اٹھائے جاتے ' بلقیس اس بوڑھی خاتون کو سہارا دے کر بالکونی تک لے گئی جہاں اس دکھیا نے اپنے خاندان کو ایک قطار میں ابدی نیند سوتے دیکھا۔ اس کی فریادوں نے سب کو رلا دیا۔

میں جانتا تھا کہ اتنے بڑے صدمے سے دو چار یہ خاتون ' اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک ایک نہیں ' کئی مرتبہ مرے گی۔

ایک گھر کی بیرونی دیوار پر ایک بلی دو دن تک متواتر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے چیختی چلاتی رہی لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ چند روز بعد وہاں سے عجیب سی بو آنے لگی۔ چار بڑے اور چھ چھوٹے بچوں پر مشتمل بلی کا خاندان ' مردہ پایا گیا۔ میں نے بلقیس کے ہمراہ گلی سڑی لاشیں جمع کیں اور انہیں دفن کر دیا۔ بلقیس غم سے نڈھال تھی۔ اس کی حساس فطرت اور خوش مزاجی ' دونوں جذبے ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ اس المیے سے فارغ ہو کر گھر جاتے ہوئے میں نے اسے کہا ..... "تم اپنے دل کو یوں غم زدہ نہ کیا کرو کیونکہ یہ کیفیت ' تمہاری ساری نفسیات کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ میری طرح اپنے دکھوں کو ایک عملی قوت میں تبدیل کر دو۔"

بلقیس جب بھی کسی مردہ خاتون کو نہلاتی تو اس کے لبوں پر یہی کلمہ ہوتا ..... "کون

جانے ' ہم مریں گے کہاں اور دفن کدھر ہوں گے۔" ایک بار ' اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس نے مجھ سے شکوہ کیا..... "تم کس قسم کے آدمی ہو؟ ہم جہاں بھی جاتے ہیں وہاں ہسپتال ہیں یا قبرستان۔ کیا ہم کبھی پکنک منانے اور تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لئے ساحل سمندر یا کسی تفریحی پارک تک نہیں جا سکتے؟" میں اس کا دل رکھنے کو مذاقاً" کہہ دیتا..... "اگر ہم سیرو تفریح کرنے نکل گئے تو ..... انقلاب کون لائے گا؟"

بلقیس کے ساتھ مراسم کے حوالے سے میری زندگی نے اب ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دمک ' ماند پڑ گئی تھی ' لیکن کبھی کبھار ' اس کا بے ساختہ قہقہہ ' ان مسرتوں کو واپس لے آتا جو کہیں گم ہو گئی تھیں۔ مجھے ایسے لگتا جیسے میرا بچپن لوٹ آیا ہو اور اس نے ' میرے تمام دکھ ہلکے کر دیئے ہوں۔

بلقیس پر اب یہ حقیقت آشکار ہو چکی کہ میرے خلاف تمام الزامات خود ساختہ تھے۔ اب وہ کہتی ..... "ایک ایدھی اور میں ..... لیکن ' ہم دونوں مل کر گیارہ بنتے ہیں۔"

ہماری شادی کو ایک برس ہو چلا تھا۔ لوگوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ میں نے اس پر کوئی پھونک مار کر ' اسے اپنی طرح پاگل بنا دیا ہے ..... خدا نے ہمیں ایک بیٹا عطا فرمایا جس کا نام میرے والد نے ' قطب رکھا۔ بلقیس ' جلد ہی معمول کی زندگی بسر کرنے لگی۔ اب اس نے قیمتی لباس پہننا اور ہار سنگھار کرنا ' سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ کسی دوست کے ہاں جانے کا پروگرام بنتا تو مجھے خواہ مخواہ یہ کہہ کر چھیڑتی ..... "ساحل سمندر کی طرف چلیں ' میں سیپیاں چنوں گی ' تم لاشیں تلاش کرتے رہنا۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ بلقیس ' سماجی مشن اور نصب العین کے بارے میں کبھی بھی غیر سنجیدہ نہ تھی۔ وہ سب کچھ جانتی تھی لیکن اس نے اپنی زندہ دلی کے باعث ' ساری گرانباریوں کو خوشگوار بنا دیا تھا تاکہ کام کاج کے دوران مزاح کا کوئی پہلو برقرار رہے۔

ایک روز ' غصے میں بھرا ایک شخص میٹھادر دفتر آیا اور زور دار لہجے میں پوچھا..... "ایدھی کہاں ہے؟ مجھے فوراً" اس کے پاس لے چلو۔ میٹھادر کے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور لاشیں دیکھ کر بچے خوفزدہ ہیں۔ تم یہ دھندا کہیں اور جا کے کرو۔" پھر وہ بڑبڑاتا ' شور مچاتا ' کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بلقیس نے کہا ..... "اس کا اعتراض درست تھا۔ تم جن لوگوں کو نہلاتے ' دھلاتے اور دفن کرتے ہو ' یہ سارے تمہارے اپنے

تو نہیں۔" میں خاموش رہا ...... اس واقعے کو دو تین روز ہی گزرے تھے کہ اس شخص نے' عمارت کی چھٹی منزل سے اپنے بھائی کی لاش اٹھانے کے لئے کہا۔ اب اس کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ میں کسی رد عمل کے بغیر ایمبولینس کے ذریعے اس کے بھائی کی لاش گھر لے آیا۔

نیو کراچی میں ہمیں ایک شخص ملا جسے کلہاڑی سے' ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر بکھرے ہوئے اس کی لاش کے ٹکڑے سمیٹے۔ ایک اور گنجان علاقے میں لوگ اچانک بیمار ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے پینے کے پانی میں ایک عجیب سی بدبو کی شکایت کی۔ جب انہیں پانی کی ٹینکی سے لاش ملی تو کوئی بھی اسے باہر نکالنے کو تیار نہ تھا۔ مجھے اور بلقیس کو ہی جانا پڑا۔ لاش اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ ٹینکی سے نکالتے ہوئے' پارہ پارہ ہو گئی۔ میں نے بلقیس سے کہا ...... "پتہ نہیں' ایک فانی شخص کسی دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ کیسے بناتا ہے ...... یہ سوچ کر میں کانپ جاتا ہوں۔"

بلقیس ازراہ مذاق کہتی ......"تم وہ سرخ رنگ کی صدری پہن لیتے' جو بچپن میں پہنا کرتے تھے۔ دیکھو ناں! تمہارا بھائی کتنا سمارٹ دکھائی دیتا ہے۔ تم بھی کوشش کرو تو اسی جیسے بن سکتے ہو۔" میں جواب دیتا ...... "میں دوسروں کی نقل کیوں کروں۔"

بلقیس جب باہر کے حالات سے گھبرا کر گھر لوٹتی تو اپنے بازوؤں کو اوپر لہراتے ہوئے کہتی ...... "تم' مجھے ایئرکنڈیشنر لگوا دیتے تو کتنا اچھا ہوتا' جیسے کسی گرم صحرا میں سرد ہوا چل پڑے۔" پھر گدے پر لیٹ کر سکون اور اطمینان کا سانس لیتی۔ میں سمجھاتا ...... "عیش و عشرت کے سامان' انسان کو نااہل' کاہل اور دوسروں کے بل بوتے پر زندہ رہنے کا عادی بنا دیتے ہیں ...... پھر یہ عادت' چپکے چپکے انسان کی رگ و پے میں یوں سرایت کر جاتی ہے کہ اس کا شعور' اچھے اور برے کی تمیز تک کھو بیٹھتا ہے۔"

بعض لوگوں نے بلقیس کو سماجی کام سے متنفر کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ اس کی ایک سہیلی نے دبئی سے لکھا کہ وہ اس کے پاس چلی آئے۔ لیکن بلقیس نے سماجی خدمت کو ترجیح دی اور سہیلی سے تعلقات منقطع کر لئے۔ اس نے مصائب میں کمال حوصلے اور قوت ارادی کا ثبوت دیا۔ اس کا جواب یہی ہوتا ...... "مجھے ایدھی اور اس کے مشن سے یکساں محبت ہے۔"

رابعہ ماں نے ایک دایہ کی حیثیت سے اپنی ٹریننگ' امینہ کے زیر سایہ مکمل کی اور پھر

میٹرنٹی ہوم میں دوسری عورتوں کو دایہ گیری اور نرسنگ کی تربیت دینے لگیں۔ سرکاری ہسپتالوں میں کام کرنے والی بڑی بڑی سند یافتہ خواتین بھی رابعہ ماں کے پاس آتیں۔ عام حالات میں ہم ایک دوسرے سے کم ہی ملتے۔ رابعہ ماں نے ہماری بے ترتیب اور منتشر زندگی کو سکون و اطمینان سے دوچار کیا۔ وہ ازدواجی زندگی کے بارے میں بلقیس کی راہنمائی کرتیں۔ ادارے میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے ہر وقت چوکس رہتیں اور خواتین کارکنوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھتیں۔ ان کی ہمہ وقت نگرانی نے کارکنوں کو متحرک اور فعال بنا دیا تھا۔

رابعہ ماں' لڑکیوں کو اکثر نصیحت کرتیں کہ رکاوٹوں اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر انہیں حتی المقدور کام کرتے رہنا چاہئے۔ مذاق مذاق میں یہ بھی کہہ جاتیں ...... "ضرورت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالو۔ وقت کے ساتھ چلنا ہی ہوشیاری ہے۔ ایسا کرو گی تو درست سمت میں چلتی رہو گی۔" کوئی لڑکی مقررہ وقت سے پہلے جانے کی اجازت لیتی تو وہ اسے چپکے سے کھسک جانے کا اشارہ کر دیتیں' ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی کرتیں کہ اگر اس نے یہ بات سب کو بتا دی تو وہ بھی اسی رعایت کا تقاضا کریں گی۔ رابعہ ماں کا یہ حال تھا کہ وہ ہر لڑکی کو یہ رعایت دیتی رہتی تھیں۔

امداد طلب کرنے والی خواتین سے کہا جاتا کہ وہ دایہ اور نرسنگ کی تعلیم حاصل کر لیں۔ اس طرح کراچی کے پسماندہ علاقے' موسیٰ لین' میٹھادر اور لیاری ـــ معاشی طور پر خود کفیل خواتین کی فراہمی کا ذریعہ بن رہے تھے۔ یہ خواتین ایسے ماحول میں بھی کام کرنے کی اہلیت رکھتی تھیں جہاں کچھ بھی میسر نہ ہوتا۔ بعض خواتین کئی ہزار روپے ماہانہ تک بھی کما لیتی تھیں۔ اس طرح ان کے گھروں میں آسودہ حالی کے اثرات نظر آنے لگے۔

نامساعد حالات کا شکار ہو کر آنے والی ان خواتین میں کچھ ایسی بھی تھیں جنہیں ان کی منشاء و پسند کے خلاف' شادیوں کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے ہمراہ' گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ جب رابعہ ماں نے ان بدنصیب عورتوں کو دایہ اور نرسنگ کی ٹریننگ دی تو یہ بخوشی ہمارے ساتھ منسلک ہو گئیں اور ادارے کا ایک حصہ بن کر رہنے لگیں۔

ایک دن میٹرنٹی یونٹ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رابعہ ماں کے ساتھ چند لڑکیاں بیٹھی بحث مباحثے میں الجھی ہوئی تھیں۔ میں نے غصے سے کہا ــ "یہ میٹرنٹی ہوم ہے۔ تمہیں

اس مناظرے کی اجازت کس نے دی۔ تم یہاں **گلچھرے** اڑانے آئی ہو؟" یہ سنتے ہی سب لڑکیاں ادھر ادھر ہو گئیں۔

بلقیس نے میرے اس سخت گیر رویئے پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے' رابعہ ماں سے کہا ..... "آپ خود ایک ڈسپنسری چلا سکتی ہیں۔ میں مناسب جگہ تلاش کر لوں گی۔" رابعہ ماں نے ادارہ چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے بیٹی کو سمجھایا...... "جو کچھ تمہارے خاوند نے کہا ہے' اس پر اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ جب عورتیں رائی کا پہاڑ بنانے لگیں تو زندگی ان کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔"

بے گھر افراد کے مرکز میں' بلقیس کی لگن دیکھ کر میں بڑا متاثر ہوا۔ وہ ہر کسی کے نام سے واقف تھی۔ ذہنی طور پر پریشان حال افراد سے اس کی خصوصی دلچسپی تھی - بوڑھی عورتوں سے وہ ان کی کہانیاں بڑی توجہ سے سنتی اور مجھے بتاتی ..... "ان کی کہانیاں' اگرچہ خود ساختہ ہیں لیکن وہ ایک ایسی تصوراتی دنیا میں رہتی ہیں جہاں خیالوں کے سہارے ہی زندہ رہا جا سکتا ہے۔"

ایک مرتبہ' بہن زبیدہ دوا لینے ڈسپنسری آئی۔ تمام مریض قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ زبیدہ نے تعارف کرایا تو مریضوں نے اس کے احترام میں جگہ چھوڑ دی۔ کمپوڈر بھی امداد کے لئے آگے بڑھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور زبیدہ سے کہا ..... "یہ ہماری کوئی ذاتی جاگیر نہیں۔ قطار کے آخر میں جاؤ اور اپنی باری کا انتظار کرو۔ یہاں کوئی کسی کا راستہ کاٹ کر آگے نہیں جا سکتا۔"

زبیدہ نے ان الفاظ کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے دوا بھی نہ لی اور ناراض ہو کر واپس چلی گئی۔ کوئی بھی ہو' اس کے ساتھ ترجیحی سلوک میرے لئے مشکل تھا۔

اگر ادارے میں کوئی بے سلیقہ کام دکھائی دیتا' میں غصے سے بے حال ہو جاتا۔ لڑکیاں بلقیس کے پاس جا کر سرگوشی میں کہتیں ..... "تم انہیں اوپر لے جا کر ٹھنڈا کرو۔" بلقیس ان لڑکیوں سے کہتی ..... "جاؤ اپنا کام کرو۔" بعد ازاں جب اس کی طرف بڑھتا تو وہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ..... "آپ نے سب کے سامنے مجھے شرمندگی سے دوچار کیا۔ میں آپ سے نہیں بولتی" ..... میں اسے ڈراتے دھمکاتے ہوئے کہتا ..... "اگر تم اسی طرح مجھ سے نالاں رہو گی تو پھر نہ کہنا ..... میں دوسری شادی کر لوں گا۔" یہ الفاظ' سنجیدہ ماحول کو

ہنسی مذاق میں بدل دیتے ..... "اچھا! دوسری بیوی۔ گویا تم اس گھر میں دوسری بیوی لانا چاہتے ہو۔ ہمارے گھر جو بھی آئے گی' ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے گی۔ کون ہے جو اس "ایمرجنسی سروس" سے شادی کرے گا۔"

بلقیس کو قدرت نے' ہر طرف خوشیاں بکھیرنے کی ایسی نادر صفات سے مالا مال کر رکھا تھا جن کی ایک مصروف شخص کی زندگی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر طرف چراغاں ہی چراغاں' گویا اس کے آس پاس مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ ہر کسی کے ساتھ' ہر موقع پر' مسکرا کر بات کرتی۔ میں نے اسے بات بے بات ہنسنے کی عادت پر قابو پانے کو کہا ..... "کسی وقت تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔ ہر وقت ایک ہی موڈ میں رہنا حماقت ہے۔" لیکن وہ اپنی شرارتوں سے باز آنے والی نہ تھی۔ بعض اوقات اسے سنجیدگی سے مصروف عمل دیکھ کر حیران ہو جاتا۔

مسئلہ کوئی بھی ہو' شواہد تو آس پاس مل ہی جایا کرتے ہیں۔ ایک جوان ماں' اپنے تین بچوں کے تحفظ کی خاطر کتنی فکر مند رہتی ہے' اس کا اندازہ آتشزدگی کے ایک المناک حادثے سے ہوا۔ ایک رات چند بچے اپنے کمرے میں کھیل رہے تھے کہ ماچس ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اچانک فوم کے گدے نے آگ پکڑلی۔ بچوں کی چیخ و پکار سن کر والدین اندر پہنچے اور جلتا ہوا گدا اٹھا کر کمرے سے باہر دوڑ پڑے۔ ان کے پیچھے کمرے کا دروازہ اچانک مقفل ہو گیا۔ باپ کلہاڑی ڈھونڈنے لگا اور بے بس ماں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے دروازے کو توڑنے کی بے سود کوشش شروع کر دی۔ باپ نے کھڑکی کی سلاخ توڑنے کی سعی کی لیکن ہر شے شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ باہر ایک ہجوم تھا۔ آخر کار دروازہ توڑ کر آگ بجھائی گئی تو بچے ایک دوسرے سے لپٹے' جل کر خاک ہو چکے تھے۔ جوان ماں' اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔

بلقیس کی حالت ابتر تھی۔ گھر لوٹتے ہوئے میں نے اس سے کہا ..... "تم نے دیکھا' موت سے بچاؤ ممکن نہیں۔ زندگی کی حفاظت کا اہتمام' سراب ہی تو ہے۔"

ایک ڈاکٹر صاحب' اپنے بائی پاس آپریشن کے لئے عازم انگلستان ہوئے۔ ان کی فیملی کے پانچ افراد' انہیں آنسوؤں اور دعاؤں کے ساتھ ایئرپورٹ پر الوداع کہنے گئے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے تو سڑک کے حادثے میں پانچوں جاں بحق ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس سانحہ کی اطلاع ہیتھرو ایئرپورٹ (انگلستان) پر ملی اور اگلی پرواز سے انہیں پاکستان واپس آنا پڑا جہاں ہمارے ساتھ' انہوں نے اپنی بیس سالہ بیٹی' داماد' جوان بیٹے اور دو بھتیجوں کی تدفین میں شرکت کی۔

اپنی فطری خوش مزاجی قائم رکھنے کی کوشش کے باوجود' بلقیس ہر غم کا اثر دل پر لے لیتی۔ اس کے قہقہوں میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تاہم اس کی آنکھوں کی چمک' ساتھ نہیں دیتی تھی۔ میں نے اسے درد والم سے ہار نہ ماننے کی تلقین کرتے ہوئے کہا — "تمہیں اپنی بقاء' مقاصد اور معیار کی نفی نہیں کرنی چاہئے۔ ان میں توازن ضروری ہے۔" وہ کہتی — "اگر میں ان مناظر سے متاثر نہ ہوتی تو انسان کہلانے کی مستحق نہ ہوتی۔ میں اپنی زندگی سے ناخوش نہیں۔ میری مسرتیں گم نہیں ہوئیں' انہیں تلخ حقائق نے گہنا دیا ہے — آپ میرے لئے متفکر نہ رہا کریں۔"

قطب کی ولادت کے بعد' چار سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے ہماری دو بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کے نام ہم نے کبریٰ اور الماس رکھے۔ خالہ کی غربت کے باعث' ہم نے ان کی دس سالہ بیٹی زینت کو بھی اپنا لیا۔ چاروں بچوں کی دیکھ بھال' ان کی نانی اور خالہ کرتی تھیں۔

ان دنوں' تپ دق ایک مہلک متعدی بیماری تھی۔ ٹی بی کے مریضوں کے ساتھ غیر ہمدردانہ سلوک میں متعلقہ خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ اس افسوسناک صورتحال نے مجھے ایک ٹی بی وارڈ کھولنے پر مجبور کر دیا جو دوسری منزل پر واقع تھا۔ میں اور بلقیس' مریضوں کے اس قدر قریب رہ کر کام کرتے رہے کہ ڈاکٹروں نے ہمیں تپ دق سے مامون و محفوظ قرار دے دیا تاہم ہمارے بچوں کو وہاں سے ہٹا دینے کا مشورہ دیا گیا۔ میٹھادر میں پانچ سال گزارنے کے بعد ہمارا خاندان کھارادر میں' رابعہ ماں کے دو کمروں پر مشتمل گھر میں منتقل ہو گیا۔

ایک ماہ بعد بلقیس نے تنگ کرنا شروع کر دیا کہ میٹھادر دفتر کی بالائی منزل پر ایک کمرہ خالی کر دیا جائے۔ اس نے کہا ..... "چھوٹے کمروں میں' بچوں نے رابعہ ماں کو زچ کر رکھا ہے۔ وہ ایک بوڑھی خاتون ہیں اور ان کے اعصاب بھی زیادہ مضبوط نہیں رہے ....." فوری انتظام کر دیا گیا اور وہ لوگ واپس میٹھادر آ گئے۔ اگلی صبح ہی سب نے بیک آواز مطالبہ کیا

کہ وہ یہاں بھی خوش نہیں۔ میں نے بلقیس کو صبرو برداشت کی تلقین کی۔ اس نے ایک نہ سنی اور سب کو اپنے ہمراہ کھارادر لے گئی۔ اسے بچوں کی پرورش میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ رابعہ ماں اور خالہ نے ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں اور ہم دونوں میٹھادر میں ہی مقیم رہے۔ بلقیس شام کے کھانے پر بچوں سے مل لیتی۔ میں نماز جمعہ کے بعد جاتا تو بچے باہر گلی میں بیٹھ کر ایمبولینس کا انتظار کرتے ہوئے ملتے۔ دوری کے باوجود مجھے اپنے بچوں سے بڑا پیار تھا۔ بلقیس' ممتا کی تسکین کے لئے ان کے کھیل میں شامل ہو جاتی۔ وہ مجھے یقین دلاتی ..... "رابعہ ماں کی زیر نگرانی بچوں کی تربیت بہتر ہو گی۔" ساتھ ہی از راہ تفنن یہ کہتی ..... "بہت ہوا تو بڑے ہو کر وہ مجھ جیسے بن جائیں گے۔" میں جواب دیتا — "اگر وہ ذرہ بھر بھی تم پر گئے تو میرے لئے فخر کی بات ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دیتی۔ بسا اوقات جارحانہ انداز میں کہتی — "آپ کی کتاب میں بچوں کے ساتھ رویئے کے ضمن میں کیا لکھا ہے۔ اگر انہیں پیدا کرنے کی اجازت ہے تو کیا ان کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں؟ رابعہ ماں ساتھ نہ دیتیں تو کیا ہوتا......؟" میں مذاقاً کہتا — "پھر امینہ ہمارے بچوں کو پالتی۔" یہ سن کر وہ سیخ پا ہو جاتی ..... شاید امینہ اس کی چڑ تھی۔ "— میرا خیال ہے کہ عورت کو اپنے گھر میں ہی رہنا چاہئے۔ کل میں رابعہ ماں کے ہاں چلی جاؤں گی اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال خود کروں گی۔ وقت بچے گا تو بالوں میں کنگھی کروں گی' اچھے اچھے کپڑے پہنوں گی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ پہلے کی طرح سینما دیکھنے جایا کروں گی' وہ یہ باتیں کچھ اس انداز سے کرتی کہ میں انہیں سنجیدگی سے لے لیتا۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہتی — " آپ تو ڈر ہی گئے' واقعی آپ میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

بلقیس' پیسوں کا تقاضا کرتی اور میں ٹال مٹول کر دیتا۔ وہ پوچھتی — "آپ مجھے کچھ رقم کیوں نہیں دے سکتے۔ اگر آپ نے بچوں کو چند پیسے دے دیئے تو اس سے کیا ہو گا' کیا وہ کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھیں گے؟" یہ سن کر میں اسے جھڑک دیتا اور عقل سے کام لینے کو کہتا..... "بلقیس' تمہیں اور کیا چاہئے۔ تمہیں خوراک' چھت اور لباس میسر ہیں۔ باقی سارے پھندے ہیں' ان سے بچ کر رہنا۔" بڑی بڑی گاڑیوں' محلات اور سازو سامان کی تمنا کئے بغیر بھی ہم ایک باوقار زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں اپنی بیوی کو سمجھاتا ..... "اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں بڑھوتی کے ساتھ' زیادہ آمدنی کی ضرورت بھی پڑتی ہے جو کرپشن

کے بغیر ممکن نہیں۔ جو لوگ اس چکر میں پھنس جاتے ہیں' اس کے مضرات سے محفوظ نہیں ہو سکتے ..... روپے پیسے کی ہوس' اپنے ساتھ دوسری ان گنت برائیاں بھی لے کر آتی ہے۔"

آخر کار' امینہ کو ایک متمول شوہر مل ہی گیا جس کے ساتھ پرسکون زندگی گزارنے کے لئے وہ ادارے کو چھوڑ گئی۔

دیگر اداروں کی طرح ٹرسٹ کے حساب کتاب میں بے بنیاد آمدن اور اخراجات سے متعلق' جھوٹ موٹ اندراجات سے پرہیز کی جاتی تھی۔ چنانچہ میں' کنجوس مشہور ہو گیا۔ کاروباری معاملے میں' میرا انداز کسی بینکار کا سا تھا۔ سماجی بہبود کی صنعت قائم کر دی گئی تھی جس کے حصہ دار عام لوگ تھے۔

بلقیس مجھ سے تو الجھتی رہتی' لیکن رابعہ ماں سے کہتی .....

"مجھے آسائش کے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ شوہر نے مجھے وہ سب کچھ دے رکھا ہے جو دولت نہیں خرید سکتی۔" وہ ہر وقت' شانہ بشانہ ..... بازوؤں کی طاقت بنتی۔



"دو خوشیوں کی دلہن"

شادی کی خوشیاں نصیب ہوں..... کیرا اور بلقیس ایدھی' ممی پاپا فاؤنڈیشن کے زیر سایہ رخصت ہونے والے جوڑے کے ہمراہ



بلقیس ایدھی' اپنے بچوں ..... کبریٰ ایدھی' الماس ایدھی' قطب ایدھی اور فیصل ایدھی کے ساتھ

باب ششم

شکستہ بازو

والد' بہت بوڑھے ہوگئے تھے--- وقت کے ساتھ' ان کی بلند و بالا قامت جھک کر' ایک چھڑی پر بارگراں بن گئی تھی۔ غل غپاڑہ کرتے سکوٹر' سر کھپاتے رکشے' دندناتی کاریں' دھاڑتی بسیں' بیل گاڑیاں' سائیکل سوار اور ہر طرف رینگتے بھاگتے لوگوں کی دھکم پیل --- والد' شہر کی اس آپا دھاپی میں مجھے قریب قریب روزانہ ملنے آتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ میں انہیں سمجھاتا ..... "آپ کے لئے' اب ان گلیوں راستوں پر چل کر میرے پاس آنا' خطرے سے خالی نہیں"--- پر وہ نہ مانتے--- یہ التجا بھی کی کہ میرے ساتھ آکر رہیں لیکن انہوں نے پسند نہیں کیا--- "اچھا یہ نہیں تو میں آپ کو لینے' خود آجایا کروں گا"۔ یہ بھی انہیں گوارا نہ ہوا ..... وقت اور زمانے نے' ان کی کمر جھکا دی تھی لیکن سر خم نہ ہوا ..... وہ ہر روز گرتے پڑتے' لڑکھڑاتے ڈسپنسری کے عقب میں آکر بیٹھ جاتے' پوتے پوتیوں کو کھارادر سے بلوا لیتے اور ان میں چاکلیٹ اور ٹافیاں تقسیم کرتے۔ تھوڑی دیر کے لئے بلقیس سے بات کرتے اور چلے جاتے ..... مجھے ان کا یہ معمول دیکھ کر گھبراہٹ ہوتی۔ میں نے جان بوجھ کر اس کمرے کو ہمیشہ نظرانداز کیا جہاں والدہ نے زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ ہم میں سے کسی نے' نہ تو کبھی ماضی کے واقعات دہرائے اور نہ ہی ماں کے بارے میں کوئی بات کی۔ والد کے لئے کھانا ابھی تک سامنے والی گلی میں رہائش پذیر عزیز اور زبیدہ کے گھر سے آتا--- کبھی کبھی ہم مل کر کھانا کھاتے--- والد' میرے کام سے خوش تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی ساری کمائی ورثاء میں تقسیم کر دی اور جو بچ رہا اس کا مجھے متولی بنا دیا۔

چھابہ گلی کے پہلو میں رسوائے زمانہ نپسئر روڈ واقع تھی جہاں' تاریک راتوں کے وحشت ناک لمحوں میں بے بس و لاچار اور حالات کی ستائی عورتوں کا دھندا کیا جاتا تھا ..... ایسی عورتیں' ڈسپنسری آتیں تو میں بلقیس کو ہدایت کرتا کہ معاشرے کے سفید پوشوں کے مقابلے میں' ان پر زیادہ التفات کیا جائے کہ سماجی نفرتوں نے انہیں بہت حساس بنا دیا ہے"۔

سولہ' سولہ سال کی جوان لڑکیوں کو ایک نہیں' تین تین چار چار مرتبہ کے شادی شدہ

بوڑھوں کے حوالے کر دیا جاتا۔۔۔۔ قسمتوں کے ان جابرانہ اور بے جوڑ قید خانوں سے اکثر لڑکیاں بھاگ کھڑی ہوتیں۔ عام طور پر ریلوے سٹیشنوں اور مزاروں میں گھات میں بیٹھے گھومتے دلال' ان بے گناہ اور بدنصیب لڑکیوں کو نئے پھندوں میں پھنسا کر' غلیظ کوٹھوں پر چھوڑ آتے ــــ عمر بھر انہیں جسم فروشوں کے رحم و کرم پر' موت کا انتظار کرنا پڑتا۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ راستے میں پڑی ایک تیس سالہ زندہ لاش کو ایمبولینس اٹھا لائی۔ اس نے بلقیس کو بتایا۔۔۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میں کس کی بیٹی ہوں ــــ میں نے نپیئر روڈ پر ہوش سنبھالا اور تب سے اسی بازار میں زندہ ہوں۔ سالہا سال' میری روح کو گھائل کیا گیا اور جب دیکھا کہ میرے جسم پر سے گوشت پوست کو پوری طرح نوچ لیا گیا ہے تو ظالموں نے مجھے گلی میں پھینک دیا۔۔۔۔"

یہ عورت ڈسپنسری کے اوپر والے سینی ٹوریم میں چھ ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد مر گئی۔ اسے دق لاحق تھا ــــ بلقیس نے اس کی میت کو غسل دیا اور میں نے اسے عام قبرستان میں لے جا کر دفنا دیا۔

بلقیس نے صورتحال پر رائے دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "اس بے چاری عورت کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔۔۔ شاید اب وہ امر ہو جائے۔"

میری سوچ یہی تھی کہ ــــ کوئی بڑی سماجی تبدیلی' ان دکھوں کا مداوا کر سکتی ہے۔ لوگ جب اس مسئلے کا کوئی حل بتائے بغیر' اس کی مذمت کرتے' تو بازاری عورتوں کے خلاف ان کے دلائل' بے وزن ثابت ہوتے ہیں۔ تسلیم کرنا ہوگا کہ فرد' گروہ یا قوم کی حیثیت سے' ہم آج تک ان مسائل کا حل ڈھونڈنے میں ناکام رہے ہیں۔

نپیئر روڈ کی خواتین سے بات چیت کے بعد' بلقیس' سنٹر میں کام کرنے والی لڑکیوں کو سمجھاتی ــــ "اس بدنصیب عورت نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ عورتیں' اپنے خاوند کے گھر میں داخل ہوتے ہی' اس کے سامنے شکایات کے انبار لگا دیتی ہیں۔ تم اس کے سامنے' اس کی ماں' بھاوج اور بہنوں کے خلاف بے سروپا باتیں سناتی ہو۔ پھر موقع بے موقع روپوں کا مطالبہ بھی کرتی ہو ــــ مرد اس صورتحال سے گھبرا کر' سکون دل کی تلاش میں دوسری عورتوں کی جانب فرار حاصل کرتا ہے۔ جب تمہیں پتہ چلتا ہے تو تم چیخم دھاڑ مچاتے ہوئے اپنے خاوند اور گھر کے لئے ایک نیا جہنم کھول دیتی ہو۔۔۔۔ میں نہیں کہتی کہ تم مرد کو

اپنے مسائل نہ بتاؤ۔۔۔ کہو مگر اس وقت جب وہ گھر آنے کے بعد تھوڑا توقف کرلے۔ سکھ کا سانس لینے کے بعد' کوئی بھی خوشگوار لمحہ ایسا آسکتا ہے کہ تم سارے دکھڑے اس کے سامنے بیٹھ کر سنا دو۔۔۔ واہی تباہی نہیں۔۔۔ سچی اور حقیقی آپ بیتی۔ پھر اپنی ہی سناتی نہ چلی جاؤ' کچھ اس کی بھی سنو....."

سنٹر کی بعض لڑکیاں' زندگی کی قدر و منزلت سے آشنا نہ تھیں' بلقیس انہیں خبردار کرتی ــــ "یاد رکھو' وہی زبان جو تمہیں حکمرانی عطا کرتی ہے' گدھے پر سوار بھی کرا سکتی ہے۔۔۔ کیا تم شادیاں نہ کر کے بوڑھی کنواریوں کی طرح اپنی زندگانی اسی طرح برباد کرنا چاہتی ہو؟ ..... اگر ایسا نہیں تو پھر شادی کی افادیت اور ضرورت کے احساس سے عاری کیوں ہو؟"

ادارے کی بہت ساری لڑکیوں نے بلقیس کو ایک مثالی عورت تصور کر لیا تھا۔ وہ نئی دلہنوں کو بتاتی کہ مرد بات بے بات روٹھنے اور ناک چڑھانے والی عورتوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ تمہیں خوش دیکھ کر خوش ہوں گے اور محبت بھی کریں گے ــــ اچھے برے حالات میں زندہ اور خوش رہنے کی عادت ظاہر کرتی ہے کہ تم اپنی بقا اور سلامتی کو کس قدر اہم جانتی ہو۔

..... بچے میٹھادر سے کھارادر چلے گئے تو میں نے دوبارہ باہر سونا شروع کر دیا۔ صبح کے آثار نمودار ہونے سے پہلے ہی' بھنبھناتی مکھیوں کی ایک فوج حملہ کر دیتی اور میں اذان سے پہلے ہی جاگ اٹھتا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ میں نے سنا کہ جس متروکہ بلڈنگ میں میری رہائش تھی' وہ ایک ایسے ہندو کی تھی جس نے کاروبار میں پے در پے ناکامیوں کے بعد اسے منحوس جان کر چھوڑ دیا تھا۔

1967ء میں ذوالفقار علی بھٹو' سیاسی افق پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنے انداز خطابت اور عزائم سے' عوام کے مایوس دلوں میں پھر سے امید کے دیئے روشن کئے۔ لوگ ان کے معروف سیاسی نعرے "روٹی کپڑا اور مکان" کی آواز سن کر متحرک ہوگئے۔ میں بھی ایک روز انہیں ملنے چلا گیا۔ ملاقات کے بعد واپسی پر ساتھیوں سے کہا ــــ "یہ سب اقتدار کا کھیل ہے۔۔۔۔ عوامی خدمت سے متعلق میرا نظریہ کچھ اور تھا۔۔۔۔" ساتھیوں نے دلیل دی ــــ "مولانا ــــ سیاست بھی تو اقتدار کی جدوجہد ہے۔۔۔۔" مجھے مولانا کہلوانا کبھی بھی پسند نہیں تھا جس کا میں نے اکثر و بیشتر مواقع پر اظہار بھی کیا۔ میں نے کہا ــــ "بھٹو

نے چونکہ لوگوں کی ضروریات کا اندازہ کرلیا ہے' عوام اس کے سحر میں طویل عرصہ تک گرفتار رہیں گے۔ عوام تو ایسی قیادت کے آرزومند ہیں جو کسی حالت میں بھی اپنے اصولوں کا نیلام نہ اٹھائے اور بے غرض عوامی خدمت سے اپنے وعدوں کا نباہ کرے۔ "دوستوں نے بھٹو کی سحرانگیز شخصیت' ان کے پس منظر اور ان کی سیاسی پیش بینی و فراست کا حوالہ دیا۔ میں نے تسلیم کیا کہ بھٹو صاحب محض اپنی خداداد صلاحیت پر ہی وزیراعظم بن سکتے ہیں لیکن لوگوں کو ان کی منزل مراد تک پہنچانے کے لئے جن اعصابی توانائیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی ان سے محروم ہیں ..... بحث چھڑ چکی تھی ... سوشلزم کو قبول عام اس لئے حاصل ہوا کہ وہ سرمایہ داری و مادہ پرستی کی بنیاد پر استوار ایک جابرانہ نظام کے خلاف' فکری اور عملی تحریک کی صورت ابھرا تھا۔ جاگیرداروں' صنعت کاروں اور عالمی قبضہ گروپوں نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ سوشلزم کو نظریہ ضرورت کے تحت گود لے لیا۔ میں نے بھی مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے کہا ... "اگر اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظریات کی بنیاد پر فلاحی ریاست کی تخلیق ممکن ہے تو پھر اسلام سے کیوں نہیں؟"

1970ء میں' قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں' میٹھادر سے ایک بار پھر اپنا حوصلہ آزمانے کا ارادہ کرلیا--- اب کی مرتبہ انتخابات میں حصہ لینے کا میرا فیصلہ' کسی جذباتی عجلت کا مرہون منت نہ تھا۔ انتخابی مہم کی دوڑ دھوپ نے مجھے توڑ کے رکھ دیا۔ میں آزاد امیدوار تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے بھٹو جیسے خاص و عام میں مقبول و معتبر شخص کی اثرانگیزیوں کا سامنا ہے لیکن مجھے تو بھٹو ہی کے نعرے "روٹی' کپڑا اور مکان" کو مزید تقویت دینے کی ضرورت نے متحرک کیا تھا کہ کہیں لوگوں کے ساتھ خلوص و محبت کے احساسات سے لبریز یہ جذبہ' فریب نظر ہی ثابت نہ ہو۔

میں گلی کی نکڑ میں کھڑا ہوکر مائیکروفون کے ذریعے اردگرد جمع ہونے والوں کو خطاب کرتا۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم تو تھا' ان کے اظہار کے لئے الفاظ کا ذخیرہ نہ تھا ..... تقریر کے دوران نہ تو آفرین کی آواز آتی' نہ صدائے نفرین سنائی دیتی ... جو کہنا ہوتا' بے تکان کہے جاتا ..... "سوچنا ہوگا کہ کوئی لیڈر ہمیں منزل تک پہنچا بھی سکے گا یا ہمارے سارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔"

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں مسلمان حکمرانوں نے اعلان کیا کہ سماجی بہبود کا

سسٹم ہی اصل میں ایک بہتر اور مثالی نظام زندگی ہے---- اور اب' بیسویں صدی کی مسافت طے ہونے کو ہے' آگے بڑھنے کی بجائے ہم نے ... دوڑ پیچھے کی طرف ... کا نعرہ لگا دیا ہے۔

طلباء کو سمجھایا ..... "وہ کام جو تم خود کرسکتے ہو' اس کے لئے دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دو---- کیا تم بے دست و پا ہو؟" پھر لوگوں سے سوال کیا ... "اسلام تو جانوروں پر بھی کہیں زیادہ ترس کھانے کی ہدایت کرتا ہے۔ تمہیں اس وقت کیا ہو جاتا ہے جب تم کسی کمزور گدھے کو کوڑے مارتے ہو اور بھوکے پیاسے کتوں کو نفرت و حقارت کے ساتھ دھتکارتے ہو--- اس حقیقت کو کس طرح جھٹلاؤ گے کہ مغرب میں رہنے والے اکثر لوگ کم از کم حقوق العباد کے معاملے میں' غیرشعوری طور پر اسلامی اصولوں پر کاربند ہیں مگر افسوس کہ ہم بہت پیچھے ہیں"۔

بلقیس نے الیکشن کے نتائج سے متعلق پیشگوئی کرتے ہوئے کہا ..... "آپ عنقریب بری طرح ہارنے والے ہیں۔ کسی پر پھوٹی کوڑی بھی خرچ نہیں کرتے۔ آپ چاہتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے' مفت میں جیت جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا"۔ دراصل' ایک روز پہلے بلقیس نے جب گھر میں آئے ہوئے ایک سیاسی کارکن کو ٹھنڈا مشروب دیا تو میں نے آپے سے باہر ہوکر اسے کہا ..... "اگر یہ لوگ یہاں کچھ کھانے پینے کی خواہش لے کر آتے ہیں تو میں انہیں کچھ بھی پیش نہیں کرسکتا۔ یہ ڈسپنسری ہے' کوئی ہوٹل نہیں۔ لاوارث لاشیں' ان کی تجہیز و تکفین' بھوک پیاس اور بیماری سے روتے بلبلاتے بچے اور ان کی اداس و پریشان مائیں-- اجڑے ہوئے لوگ' یہ ڈسپنسری تو صرف ان دکھی لوگوں کا مداوا کرنے کے لئے ہے۔"

بلقیس نے خبردار کرتے ہوئے واضح کیا ..... "باقی امیدوار تو لوگوں سے ووٹ لینے کے لئے ہر طرح کی ترغیب و تحریص سے کام لے رہے ہیں لیکن ایک آپ ہیں کہ چائے کی پیالی تک پلانا بھی گناہ سمجھتے ہیں----" میرا جواب یہی تھا ..... "اگر پوری دنیا کی بھوک مٹانے کا مسئلہ ہو تو میں حاضر ہوں لیکن ایسے لوگوں کے لئے میرے پاس کچھ نہیں' جن کے پیٹ پہلے ہی' کھاکھا کر پھٹ رہے ہیں ....."

میں نے مائیکروفون پر لوگوں کو وارننگ دیتے ہوئے کہا--- "دیکھو' ان دنوں وعدوں

کو ایسے ایسے خوبصورت اور دلفریب الفاظ میں لپیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے' جنہیں سنتے ہی اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ یاد رکھنا کہ ایک مرتبہ پھر یہ کیک' بڑے بڑے لوگ اور ان کے حواری ہڑپ کر جائیں گے اور ہمارے کھانے کو صرف باسی ٹکڑے رہ جائیں گے۔ نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے ..... کیونکہ تمہیں استعمال کرنے کے بعد کسی ڈھیر پر پھینک دیا جائے گا--- اٹھو اور اپنی گم گشتہ صلاحیتوں کو تلاش کرو---- صرف یہی طریقہ ہے کہ تم خوشحال ہوسکتے ہو۔ سیاست دانوں پر بھروسہ کرنا' ناقابل اعتبار اور بے سود سرمایہ کاری ہے جس کا انجام' بانجھ نتائج کے سوا کچھ نہیں---- سیاست تو ان لوگوں کے لئے ایک کاروبار ہے جس سے وہ شہرت' طاقت اور سرمایہ حاصل کرتے ہیں--- تم کس شمار میں ہو-----!"

طلباء کی ایک یونین جو بھٹو کی ہمنوا تھی' میں نے اس کے لیڈروں کو تعلیمی اور سیاسی اصلاح احوال سے متعلق کچھ تجاویز دیں۔ یونیورسٹی کے شعبہ سماجیات میں زیر تعلیم وہ طلبا جو عنقریب فارغ التحصیل ہونے والے ہوں--- اگر انہیں بلدیاتی اداروں میں کچھ فرائض سونپ دیئے جائیں تو وہ مستقبل کے رہنما بن کر ابھر سکتے ہیں' بجائے اس کے کہ وہ کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوکر دوسروں کے آلہ کار بنیں۔ اس طرح دس پندرہ برسوں میں مستعد اور محنتی سماجی کارکنوں کی ایک کھیپ تیار ہوسکتی ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ لچے لفنگوں کا مقابلہ غنڈوں سے ہے اور بدمعاشوں کے روبرو بدقماش کھڑے ہیں ..... بھٹو نے نوجوانوں کو باوقار زندگی کا نیا ولولہ ضرور دیا ہے۔ اگر کسی بھی وجہ سے نوجوانوں کی توقعات پوری نہ ہوئیں تو ایک خوشگوار مستقبل کی آس میں بیٹھے لوگ پکار اٹھیں گے ..... "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا.....!"

بازار میں لوگوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ..... "پڑھے لکھے افراد' باصلاحیت لوگوں کو ٹھوکریں مارتے ہیں اور عوام کو دلفریب نعروں سے مدہوش کرنے میں لگے ہیں--- اگر سیاست کا مقصد لوگوں کی خدمت ہے تو پھر انتخابی جلسوں میں ڈرامے بازیوں کی کوئی ضرورت نہیں---- اہل مغرب سے اپنی سیاسی روایات کا مقابلہ کرو تو یہ سب کچھ شور شرابے کے سوا کچھ نہیں۔"

انتخابات میں بھٹو کی سحرانگیز شخصیت نے کام کر دکھایا جس کے باعث' پیپلزپارٹی نے

بے پناہ کامیابی حاصل کی--- میں قومی اور صوبائی اسمبلی کی دونوں نشستوں پر ہار گیا جس پر میں نے ساتھیوں سے کہا ..... "جس قسم کے حالات تھے' میری شکست غیرمتوقع نہیں۔ میری یہ خواہش شاید قبل از وقت ہے کہ اسمبلی میں نمائندگی کروں ..... سوچا تھا کہ صداقت کے پرچار اور سادگی کے لئے لوگ مجھ پر اعتماد کریں گے--- اگر مجھے اسمبلی میں جانے دیا جاتا تو میں بھٹو صاحب کو ان کے وعدے یاد دلاتا رہتا' لیکن ....." بعدازاں جب اسمبلی کی ایک خالی سیٹ پر ضمنی انتخابات کا موقع آیا تو دوستوں کے اصرار کے باوجود اس میں حصہ لینے سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ لوگوں سے جو کہنا تھا' وہ پہلے ہی سن چکے ہیں ... حکومت کی اعانت سے بے پرواہ میں نے اپنے طور پر' ایک فلاحی ریاست کے لئے بنیادیں کھودنے کا عمل جاری رکھا۔

1971ء میں مشرقی پاکستان کی' مغربی پاکستان سے علیحدگی کے مسئلہ پر' پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑ گئی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک قوم کو ذلیل کرنے اور اس کی حیثیت سے چشم پوشی کرنے کا انجام دیکھ لیا جب پاک فوج نے بھارتی سیناؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور پاکستان دولخت ہوگیا ..... اس کے نتیجے میں مجیب الرحمان نے بنگلہ دیش اور ذوالفقار علی بھٹو نے باقی ماندہ پاکستان کا اقتدار سنبھالا۔ مکتی باہنی اور دیگر بنگالی قوم پرستوں کے قتل عام سے بچتے بچاتے لاتعداد پاکستانی اپنی جائیدادیں اور کاروبار چھوڑ کر مغربی پاکستان بھاگ آئے۔ یہ لوگ تہی جیب بھی تھے اور بے سرو سامان بھی ..... کچھ ایسے بھی تھے جو کئی سال سے ہماری تنظیم کو باقاعدگی سے عطیات بھجواتے رہے' گردش زمانہ نے اب انہیں بھی خیرات لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے ایدھی سینٹر کو دی جانے والی عطیات کی رسیدیں دکھائیں تو ضروری جانچ پڑتال کے بعد پوری رقوم انہیں واپس کردی گئیں۔

1972ء کے دوران' پاکستان کے شمال میں واقع ایک شہر بشام کو زلزلے نے ہلا کے رکھ دیا۔ ضروری ادویات اور دیگر طبی سامان لے کر ایمبولینس گاڑیاں متاثرہ علاقے کی جانب روانہ ہوگئیں--- کارکنان' بسوں کے ذریعے چل پڑے۔ بلقیس اور چند ساتھیوں کے ہمراہ جب' بل کھاتی سڑکوں پر بشام جانے کے لئے روانہ ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ یہ سڑکیں تو ان گاڑیوں سے بھی تنگ ہیں۔ ایک دم خطرناک اور بے ترتیب .....!

بشام پہنچے تو مقامی لوگوں نے بلقیس کو آگے جانے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ جگہ

عورتوں کے گھومنے کی نہیں۔ پوچھا کہ زخمی عورتوں کی دیکھ بھال اور علاج کون کرے گا' پر وہ اپنے اقدام کی کوئی وضاحت نہ کرسکے اور نہ ہی انہیں احساس تھا کہ ایک عورت' بھی طبی امداد کا اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا ایک مرد ..... اگلے روز اسلام آباد کے لئے بس پکڑنے اسے میلوں چل کر جانا پڑا اور مجبوراً" وہ کراچی کے لئے پرواز کر گئی۔

سنگلاخ اور انتہائی دشوارگزار پہاڑی سلسلے میں امدادی کام' کرینوں کے بس کا روگ بھی نہ تھا۔ جس طرح بھی ممکن ہوا' مزدوروں نے زلزلے کے جھٹکوں سے ڈھیر ہو جانے والے کچے گھروں کے ملبے تلے سے لاشوں اور زخمیوں کو نکالنے کی مہم کا آغاز کیا۔۔ تقریباً ہر روز ہی کئی لاشیں دفنائی جاتیں ..... ہزاروں افراد بے گھر ہوگئے' جنہیں نزدیک ہی دامن کوہ میں بنائے گئے' ایک ہنگامی کیمپ میں سانس لینے کی مہلت ملی۔ وہیں فری ڈسپنسری اور ایک عبوری نوعیت کے چھوٹے سے ہسپتال کا اہتمام کیا گیا ..... دو ماہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ دسمبر میں شمالی علاقہ جات' بلا کی سردی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔۔ میں ایسے موسم کا عادی نہ تھا' سرد ہواؤں نے میرے سینے کو شدت سے آن جکڑا۔

بشام سے کراچی پہنچنے کے بعد' مجھے ایک نئے سانحہ کا سامنا کرنا پڑا ..... چچا نے اطلاع دی کہ والد سینے کے شدید درد میں مبتلا ہیں۔۔۔ میں یہ سن کر فوراً" چھابہ گلی کو بھاگا لیکن وائے حسرتا کہ میرے وہاں پہنچنے سے قبل' والد انتقال کرچکے تھے۔ خاندان کے کچھ لوگوں اور عزیز نے مل کر دعائے مغفرت کے ساتھ اپنے چھوٹے سے قبیلے کے سربراہ کو' خاموشی کے ساتھ' سپرد خاک کر دیا...... یہ ایک اور دردناک سانحہ تھا...... میرے پاس سفید کفن کو آنسوؤں سے سیراب کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

1973ء میں سندھ زیرِ آب آگیا۔ کچھ تو غفلت میں مارے گئے۔ جنہیں پیشگی علم تھا' بچ گئے۔ ان کا سارا ساز و سامان بپھرتے دریاؤں اور دھاڑتے ندی نالوں کی طوفانی لہروں پر تیرتا ڈوبتا فنا ہوگیا۔ ہمارا بڑا امدادی کیمپ' نوشہرو فیروز اور مورو میں لگایا گیا۔ یہاں کے وڈیروں اور اثر و رسوخ رکھنے والے جاگیرداروں نے کہا کہ میں ان کی جگہ زیرِ استعمال لاتے ہوئے' سارا امدادی کام انہی کے نام سے کروں۔ یہ پیشکش' بڑے مودبانہ انداز میں ٹھکراتے ہوئے کہا ..... "ہم نام و نمود کی خواہش کئے بغیر کام کرنا چاہتے ہیں۔"
عطیات و نقد رقوم جمع کرنے کے لئے پورے صوبے میں' ایک ہمہ گیر جال پھیلا دیا

گیا تھا۔ اخبارات اور لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے لوگوں کو خدا ترسی کا احساس دلایا جا رہا تھا۔ ڈسپنسریاں کھول دی گئی تھیں' لوگوں کو سیلابی تعفن کے باعث اچانک پھیل جانے والی بیماریوں سے بچانے کے لئے حفاظتی ٹیکے لگائے جا رہے تھے۔ بے گھر لوگوں کو اس وقت تک پناہ دی گئی' جب تک سرکار نے ان کا مستقل انتظام نہیں کر دیا۔۔ ایمبولینس گاڑیاں بھی منہ زور پانی کی متلاطم موجوں کے ساتھ' سرپٹ بھاگ رہی تھیں۔

سیلاب کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کی زد میں کھڑے لوگ' سفید جھنڈیاں دکھا دکھا کر فوری مدد کے طلبگار تھے۔ دو دن بعد' ایئرفورس کے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے انہیں گرداب بلا سے نکالا گیا۔ یہ لوگ گھنٹوں سے بھوکے پیاسے تھے لیکن زندگی کی آس سے قریب قریب مایوس' ہر سہولت سے محروم' ان کے احساس مہمان نوازی کو دیکھ کر ایسے لگا کہ شاید اتنے بڑے سانحہ کے باوجود انہوں نے ابھی سب کچھ کھویا نہیں ..... بھٹو نے مصیبت کے اس وقت ہماری کارکردگی کو سراہتے ہوئے' مالی امداد کی پیشکش کی جسے معذرت اور شکریئے کے ساتھ' قبول نہیں کیا گیا۔

اس دوران میرے بھائی نے میرے ساتھ کام کرنے کی خواہش کی۔یوں بھی والدین کی عدم موجودگی میں مجھے کسی مخلص ساتھی کی رفاقت درکار تھی ..... میں خود تو دفتر سے باہر کے کاموں میں مصروف ہوگیا اور ڈسپنسری کی انتظامی ذمہ داری' بھائی کو سونپ دی' جس سے قدرے بوجھ کم لگا۔

اسی سال بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ اب کی مرتبہ حجاج کے قافلے' خشکی کے راستے زیارات کو جائیں گے۔ یہ اعلان میرے خوابوں کی تعبیر تھی ..... پاکستان کی تاریخ میں قافلوں کی اس طرح باضابطہ اور منظم روانگی برائے حج' اپنی نوعیت کا پہلا اور شاید آخری واقعہ تھا ..... مجھے نہ جانے کیوں ایسے ہی لگا۔ میں پورے جوش و جذبے کے ساتھ حج کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ بلقیس نے بھی ساتھ جانے کے لئے خوب منت سماجت و خوشامد کی۔۔ سفر بے حد مشکل اور صبر آزما تھا لیکن موقع کی مناسبت کا دھیان کرتے ہوئے میں نے بلقیس کو اجازت دے دی۔ قافلے میں میری حیثیت' ایمبولینس ڈرائیور کی تھی اور بلقیس بطور نرس جا رہی تھی۔ ملک بھر سے کئی اور قافلے ترتیب دیئے گئے۔ چھ بسوں' ایک ویگن اور ایک ایمبولینس پر مشتمل قافلے میں' 250 افراد کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

آغاز سفر سے پہلے، میرے اور بلقیس کے درمیان، کئی باتوں پر اختلاف رائے تھا۔ بحث بھی ہوئی اور تنازعہ بھی۔ وہ اپنے ساتھ، دوران سفر ضرورت کی کئی چیزیں رکھنا چاہتی تھی اور میں مصر تھا کہ ضرورت کے مطابق، راستے میں یہ چیزیں خریدتے رہیں گے لیکن بلقیس نہ مانی اور اس نے چپکے سے اشیا کے بنڈل، ایمبولینس کے کونوں کھدروں میں چھپا کر رکھ لئے۔ چونکہ ادویات اور دیگر طبی سامان کے لئے جگہ درکار تھی، میں نے تمام بنڈلوں کو ایمبولینس سے باہر پھینک دیا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر روئی، چلائی اور مجھے سختی سے کہا ..... "میں سردی میں کیا پہنوں گی۔ تم چاہتے ہو کہ میں راستے ہی میں چل بسوں ـــــ میں تو نمونیے سے مرجاؤں گی۔" بلقیس کی عادت تھی کہ وہ ایسے مواقع پر اپنے سر کو ایک طرف جھکا کر بات کرتی تھی۔ اس نے حسب معمول، ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ طنزاً" کہا ..... "تم چاہو تو میں ابھی سے پیشگی کفن لپیٹ لیتی ہوں۔" اس نے بنڈل پھر سے رکھ لئے اور میں نے اس کے اوجھل ہوتے ہی انہیں ایک بار پھر وہاں سے ہٹا کر غائب کر دیا ..... ہم دونوں، زندگی میں پہلی مرتبہ، اکٹھے کسی طویل سفر پر نکلے تھے۔ میں نے تو روز آغاز ہی سے اپنے آپ کو، ایک مقدس فریضے کی تکمیل کے لئے تیار کرلیا تھا لیکن بلقیس اپنے دل میں حج کی تمامتر عظمتوں اور حرمتوں کے بھرپور احساس کے ساتھ ساتھ، اس سفر کو شاید ایک "ہنی مون" بھی سمجھ رہی تھی۔ جب ہم پیٹھادر سے عازم سفر ہوئے تو میں نے اسے سمجھایا ..... "بلقیس تم ایک نرس ہو اور میں ڈرائیور ..... اپنے آپ کو دھوکہ نہ دو۔ ہم دونوں کے کچھ فرائض ہیں، جنہیں دوران سفر اور حج کے موقع پر سرانجام دینا ہے۔" اس نے بے نیازانہ جواب دیا ..... "ہاں جب وقت آئے گا تو کام بھی کرلوں گی۔ میں اس بکھیڑے کو ابھی سے اپنے سر پر کیوں سوار کرلوں۔ ابھی تو میں، اپنے شوہر کے ساتھ ہوں ـــــ آزاد۔" میں چاہتا تھا کہ وہ لمبی تان کر لیٹ جانے کی عادت میں نہ پڑے اور ہر وقت کام کی تاک میں رہے ..... اپنی بیوی کو، میں سستی و کاہلی سے بچانا چاہتا تھا ..... اسی لئے صاف صاف بتا دیا ..... "اگر تم اپنی حماقتوں سے باز نہ آئیں تو میں تمہیں ایمبولینس سے نیچے اتار دوں گا ـــــ" وہ جانتی تھی کہ میں عملی طور پر ایسا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اسے یہ خیالی پلاؤ پکانے سے میں باز نہ رکھ سکا کہ ہم جدہ میں جی بھر کے شاپنگ کریں گے ..... ہوٹل میں قیام کریں گے ..... اور نہ جانے کیا کیا ..... اندرون سندھ سے گزرتے ہوئے، راستے میں ان جگہوں کو پھر سے دیکھا

جہاں ہم نے کئی لوگوں کو دفن کیا تھا، جن کی یاد نے اداس کر دیا۔ سفر کی تھکان ..... ماضی، حال اور مستقبل، ایک دوسرے میں پیوست ہوکر، طویل مسافتوں کی گرد میں گم ہوگئے تھے۔ اب وسیع و عریض، یخ بستہ بلوچستان ہمارے سامنے کھڑا تھا ـــــ سردی نے ہاتھ پاؤں شل کر دیئے تو بلقیس کو مجھے ستانے کا پھر موقع مل گیا۔ کہنے لگی ..... "آپ نے آتے وقت مجھے گرم کپڑے ساتھ رکھنے کی اجازت تو نہ دی۔ اب سردی سے واقع ہونے والی موت سے بچنے کے لئے ادویات تو ہوں گی آپ کے پاس ..... وہی مجھے دے دیں تاکہ میں انہیں کھالوں۔"

چلتے وقت بے تاب تھا کہ کسی بھی ممکنہ بیماری کے پیش نظر میں جس قدر بھی طبی سامان اور ادویات اپنے ساتھ لے لوں، کم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے صورتحال کا ایک رخ تو دیکھا لیکن دوسری جانب میری نظر نہ گئی کہ جسم اور روح کا رابطہ برقرار رکھنے کے لئے ہمیں دوائیوں کے علاوہ بھی کچھ مطلوب تھا۔ ہم کوئٹہ شہر سے گزر رہے تھے، جسے برف کے سفید تودوں نے ڈھانپ رکھا تھا ـــــ اگرچہ اس کے برفانی جمال نے مجھے ہمیشہ سانس روک کر دیکھنے پر مجبور کیا تاہم آج، شدید سردی کی زد پر کانپتی کپکپاتی بیوی بھی میرے ہمراہ تھی۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس ہمیں کوئٹہ کے لنڈا بازار لے گیا، جہاں کپڑوں کے ڈھیر لگے تھے۔ بلقیس، ایک دکان میں جلتے ہوئے ہیٹر کے سامنے جا کھڑی ہوئی ـــــ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ..... "بلقیس یہ کوٹ ٹھیک ہے، یہ سویٹر بڑا اچھا ہے ـــــ یہ موزے خوب گرم ہیں، یہ دستانے پہن لو ....." گویا میں ایک چٹان کی کوکھ میں پھول اگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلقیس، موج ہی موج میں ایک کے بعد دوسرا بنڈل کھلوا رہی تھی۔ بھانت بھانت اور طرح طرح کے مختلف ناپوں والے کپڑے، ادھر ادھر پھینک رہی تھی ـــــ مجھ پر بھی طنز فرما تھی۔ دکاندار بھی اس کی باتیں سن کر جھینپ رہے تھے۔ آخرکار، اس نے اپنی ضرورت کے چند کپڑے نکال ہی لئے اور میری جان میں جان آئی ـــــ کوئٹہ چھوڑنے سے پہلے میں نے چاہا کہ اطراف میں پھیلی ہوئی ہوش ربا آسودگی کا الوداعی نظارہ، جی بھر کے کرلوں۔ بلقیس، جب برف کے گولوں سے کھیلنے لگی تو یہ سارا تسلسل ایک دم ٹوٹ گیا ـــــ وہ اپنے اس مشغلے میں اس قدر محو تھی کہ وہاں سے چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی ـــــ میں نے پھر اسے سمجھایا ..... "دیکھو بلقیس! اگر تم نے مناسب اور مہذب رویہ اختیار نہ کیا تو میں تم سے بہت خفا ہو جاؤں گا۔" لیکن اس خدا کی بندی پر ذرا اثر نہ ہوا۔

دوران سفر جب آدھی رات آتی تو ہم کسی مسجد یا مدرسے کے سامنے قافلہ کھڑا کرکے' سٹوو پر کچھ کھاتے پکاتے ۔۔۔ بلقیس کی بھوک نے مجھے بہت نالاں کر رکھا تھا اور اس کے لئے مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ قافلے میں لوگ اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ آٹا گوندھا جاتا' چپاتیاں بنائی جاتیں۔ بلقیس برتن دھونے اور کھانا پکانے میں ان کی مدد کرتی اور پھر ساتھ مل کر کھانا بھی کھاتی۔

تین دنوں میں ہم نے' بمشکل ایران کی خوبصورت اور برفانی پہاڑیوں میں گھری ہوئی سرزمین کو طے کیا' رات آتی تو سب لوگ اپنی اپنی خواب گاہوں میں سونے چلے جاتے۔ خواب گاہیں کاہے کو تھیں' بس گاڑیوں اور بسوں کے ڈربے تھے یا سرراہے مسافر خانے ۔۔۔ ایران میں اس قدر شدید سردی تھی کہ ہمارے قافلے کے دو افراد' اس برفانی موسم کے ہاتھوں چل بسے۔ دونوں میتوں کو غسل دے کر راستے ہی میں دفنا دیا گیا ۔۔۔ پھر ہم عراق میں داخل ہوگئے۔ یہاں سے کویت اور پھر اکیس دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد' ہم حج سے ایک روز پہلے' سعودی عرب کے صحت افزاء شہر طائف پہنچے۔ ہمارے قافلے کے تقریباً" 250 زائرین نے احرام باندھے اور لبیک اللھم لبیک ۔۔۔ کی صدائیں بلند کرتے' بیت اللہ کی طرف چل پڑے۔ احرام باندھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ رنگ' نسل' خاندان' قبیلے اور زبان کے سارے فرق' مٹ گئے ہیں۔

آخرکار وہ مقام' ہمارے سامنے تھا جس کے لئے ہر دل بے قرار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔۔۔ یہ وہ جگہ تھی جسے بیت العتیق بھی کہا گیا۔ یہ پرشکوہ منظر دیکھ کر مجھے اپنا وجود بالکل حقیر لگا۔۔۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پا رہا تھا کہ اس کی بارگاہ میں' ایک لمحہ کے لئے بھی بیٹھ سکوں۔ میرے حواس گم تھے۔

لاکھوں افراد' ایک دوسرے کے شانہ بشانہ' صدائے اللہ اکبر ۔۔۔ کی تعمیل ارشاد میں کھڑے تھے۔ عظیم المرتبت گھر کے اردگرد' امت مسلمہ کا سیلاب' طواف کرنے میں مصروف تھا۔ سیاہ غلاف میں لپٹی ہوئی اس عمارت کا فن تعمیر' اسلام کے سادہ اصولوں کا مظہر تھا۔ کرۂ ارض پر بسنے والی' مسلم ثقافتوں کے اس ملاپ میں' بھائی چارہ بھی تھا' بردباری بھی تھی اور وجدان بھی تھا۔ صفا اور مروہ کے درمیان' سات چکر لگائے اور زمزم کا پانی پیا۔ مقام ابراہیمؑ کے عین سامنے' دو رکعت نماز ادا کی۔ حجر اسود کے بوسے لئے۔۔۔ اور دیوار

کعبہ سے لپٹ کر روئے مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ۔۔۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہر دو چار برس بعد' طواف کعبہ کو آتے اور قومی خزانے کے بل بوتے پر حج کا ثواب لوٹ لیتے ہیں۔۔۔ غریب آدمی کا ٹیکس یعنی زکوٰۃ بھی کم ہی ادا کرتے ہیں۔۔۔ آج اپنے خدا کے سامنے تنہا کھڑے ہیں اور خود ہی جواب دہ بھی ہیں۔۔۔ میں نے اپنی ذات کا محاسبہ کرتے ہوئے خدا سے فریاد کی ۔۔۔

"اے پروردگار' میری انا کو فنا کر دے ۔۔۔ مجھے پوری دنیا کے انسانوں کی' زندگی بھر خدمت کرنے کی توفیق عطا فرما۔"

ایک روز معلوم ہوا کہ حرم کعبہ کے عین سامنے' سعودی عرب کے بادشاہ بھی اگلی صف میں' نماز ادا کر رہے ہیں۔ بلقیس انتہائی حیرت سے بولی ۔۔۔ "یہ بادشاہ سلامت' یہاں کیسے آگئے ۔۔۔؟"۔ میں نے سرگوشی کی ۔۔۔ "اللہ کے دربار میں بادشاہ اور گداگر' ایک ہی قطار میں دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔"

مناسک حج کے سلسلے میں کئی لاکھ مسلمان' عرفات کے میدان میں کھڑے تھے۔ ہم "مشعر" میں ہی ٹھہر گئے' کنکریاں جمع کیں اور منیٰ کو چل دیئے جہاں شیطان سے نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لاکھوں افراد نے علامتی شیطانوں کو کنکریاں مار مار کر ڈھیر لگا دیا۔ میں نے کچھ کنکریاں اپنے پاس بچا کے رکھ لیں تاکہ وطن جاکر ان گنت شیطانوں کو مار سکوں ۔۔۔ لیکن اصل ضرورت تو اپنی خواہشات کو سنگسار کرنے کی ہے۔ اب ہمارا کارواں واپس کعبہ شریف پہنچ چکا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں ظاہر ہونے والے اشارے کی تعمیل میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنا چاہا تو دیکھا کہ چھری تلے حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ ایک دنبہ ذبح ہوچکا ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ ان کے پہلو میں کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس جلیل القدر واقعہ کی یاد میں' تمام دنیا کے مسلمان' حج کے دوسرے روز عید کا جشن مناتے ہیں۔ خدا کے راستے میں دنبے' بکرے اور اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں۔۔۔ عزیز و اقارب اور احباب میں ان کے معینہ حصے کا گوشت تقسیم ہوتا ہے لیکن اس علامتی واقعہ کے پس منظر میں اصل قربانی' حد سے متجاوز ضروریات کی ہے۔ اس قربانی میں انا کی موت کا پیغام بھی ہے۔ جبکہ ہم تو صرف ایک جانور کی قربانی دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

اس وقت سعودی عرب میں قربانی کا منظر بھی دیدنی تھا۔ قربانی کے جانور، افراتفری کے عالم میں بھاگتے نظر آتے۔ سعودی ڈرائیوروں کی ایک فوج قصابوں کا روپ دھارے ان کے تعاقب میں بھاگتی اور انہیں ہانک لے جانے کے لئے اس قدر زور زور سے ہارن بجاتی کہ یہ وحشت ناک آوازیں، قربانی کے جانوروں کے شور میں گم ہو جاتیں۔

اسلامی احکامات تو یہ ہیں کہ گوشت کے تین حصے بنا کر ایک اپنے لیے رکھ لیا جائے، دوسرا عزیزوں، رشتہ داروں اور احباب کیلئے، تیسرا حصہ مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور مسافروں میں تقسیم کر دیا جائے، کیونکہ ایک عالم ان نعمتوں کو ترس رہا ہوتا ہے۔ کاش، یہ گوشت ان تک پہنچ جاتا۔ یہ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ شاید پاکستان جاکر ایک اور بھیڑ کی قربانی بھی دینی پڑے۔

بلقیس نے شکوہ کیا ..... "میں نے دس ریال دے کر جو سالن خریدا تھا، وہ تو بہت کم تھا۔ میرا تو آج عید کے دن بھی معدہ خالی ہے۔" بلقیس کو نظرانداز کرتے ہوئے ایمبولینس میں بیٹھ کر، ضرورت مندوں کو مفت ادویات تقسیم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اچانک ایک سعودی میرے پاس آیا۔ اس کا پاؤں بری طرح جل چکا تھا۔ ہم نے اس کی مرہم پٹی کر دی تو بطور شکریہ اس نے چائے سے بھرا ایک مگ، بلقیس کو پیش کیا۔

بلقیس نے بڑے محتاط انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا------ "تم تو میری توقعات سے بڑھ کر غیر نکلے۔ تم خانہ خدا کے سامنے کھڑے ہو۔ تمہارے لیے اس سے زیادہ اور مناسب موقع کیا ہو سکتا ہے کہ اس ہستی سے جا ملو لیکن تم تو ابھی تک اپنی ڈسپنسری کے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے ہو---- جیسے کہ تم منجھدار میں بیٹھے ہو"---- میں نے جواب دیا ---- "یہ درست ہے کہ یہاں ہم سب لوگ، اللہ تعالیٰ کے حضور، عبادت کے لئے حاضر ہیں لیکن کسی کے زخموں پر مرہم لگانا بھی تو عبادت ہے۔"

میں اور بلقیس، ڈسپنسری میں سارا دن کام کرتے، رات آتی تو وین کی کھڑکیوں کے پردے گرا کر، گتے کے ڈبوں پر سو جاتے ..... بلقیس شکایت کرتی کہ اسے وین میں سونا پسند نہیں۔ کئی لوگوں نے ہمیں پیشکش کی ہے کہ ہم بطور مہمان ان کے ہاں چلے آئیں، لیکن گتے کے ڈبوں پر زیادہ سکون ملا، میں نے معذرت کر دی۔

ایک روز، بلقیس اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ، غسل کرنے قریبی ہوٹل چلی گئی۔ واپسی پر

اس نے تقاضا کیا ..... "ہم بھی ہوٹل کیوں نہ چلیں، جہاں نہانے کو گرم پانی اور صاف غسل خانے ملتے ہیں"۔ میں نے بلقیس کو سمجھایا ..... "اگر لاکھوں افراد، عام غسل خانے استعمال کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں، ہم کون اور ہماری ہستی کیا"۔ بلقیس کہاں ہتھیار ڈالنے والی تھی---- "اچھا یوں نہیں تو سونے کیلئے کہیں ایک کمرہ ہی لے لیں، ڈگی میں سونے سے میری کمر چھل چکی ہے"۔ میں نے کہا ..... "میں تو صرف تمہاری وجہ سے وین میں سوتا تھا، اکیلا ہوتا تو کسی فٹ پاتھ پر دوائیاں سجا کر سو جاتا اور ایمبولینس کرائے پر دے دیتا۔ تم نے تو مجھے اچھے خاصے منافع سے محروم کر دیا ہے۔" ہم دونوں یونہی چھیڑ چھاڑ کی باتیں کرتے، معمول کے کاموں میں کھو جاتے----

اب ہمارے سامنے شہر نبیؐ تھا جہاں کے گلی کوچوں میں آج بھی اسی نبوت اعظمیٰ کے آثار گل افشاں، نظر آتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ زائرین اپنے اور روضہ رسولؐ کے درمیان بنائے گئے حفاظتی جنگلے پر ٹوٹ پڑے۔ لوگ جالیوں میں سے جھانک کر، اس نورانی کیفیت کا نظارہ کرنا چاہتے، جو ان کی زندگی بھر کا خواب تھا--- یہاں بھی وہی دھکم پیل، وہی ایک دوسرے کو پامال کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا شوق---- کہ اگر کوئی آواز انہیں صبر و تحمل یا شائستگی کی تلقین کرتی تو اس آواز کو، اپنے اور خدا کے رسولؐ کے درمیان ایک گستاخانہ مداخلت سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران، میں نے ایمبولینس کو زیر تعمیر عمارت کے ایک پہلو میں کھڑا کر دیا لیکن اس سے اٹھنے والے گرد و غبار سے میرے سینے کی بیماری دوبارہ عود کر آئی۔ شدید بخار کے باعث، میری حالت غیر ہوگئی۔ بلقیس بہت پریشان تھی۔ وہ مجھے بار بار کسی ہسپتال سے دوا لینے یا ڈاکٹر کو بلوانے کا مشورہ دیتی۔ میں اپنے علاج سے مطمئن تھا لیکن بلقیس برابر شور مچا رہی تھی---- "خدا نے کہاں حکم دیا ہے کہ تم اپنی ضروریات پر خرچ نہ کرو۔" اس کے باوجود کہ بخار کی شدت سے میرا سر چکرا رہا تھا، میں نے پھر بھی سمجھایا ..... "بلقیس، میں نہیں چاہتا کہ چھوٹی چھوٹی پریشانیوں سے گھبرا کر اپنی ذات کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا دوں۔" تنگ آکر وہ مجھے ایک بنگالی دوست کے گھر لے گئی تاکہ اطمینان سے میرا علاج ہوسکے۔ اب بلقیس بھی پر سکون ہوگئی۔

پاکستان چھوڑنے سے پہلے ہی میں نے بلقیس کو بتا دیا تھا کہ ہم حج کا مقدس فریضہ ادا

کرنے' مکہ اور مدینہ کا سفر کر رہے ہیں۔۔۔۔ تم وہاں جا کر کسی قسم کی خریداری نہیں کرو گی۔ بلقیس نے نہ تو اس وقت میری ہدایت کی پرواہ کی اور نہ اب اسے یاد تھا کہ میں نے کیا کہا تھا۔۔۔۔ "ہر شخص اپنے بچوں کیلئے کچھ نہ کچھ خرید رہا ہے۔ ہم بھی کیوں نہ خریدیں؟" بلقیس نے آخرکار ضد کر کے مجھ سے رقم نکلوا ہی لی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔۔ "اگر راستے میں کسٹم والوں نے کوئی اعتراض کیا تو یہ سارا سامان' گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔" بلقیس نے خریدی ہوئی تمام اشیاء چپکے سے کارواں میں شامل' اپنی ایک ہمسفر سہیلی کے حوالے کر دیں کہ وطن واپسی پر یہ امانتیں اسے واپس مل جائیں۔ ساتھ ہی وہ سرگوشی میں مجھ سے یہ کہہ گئی ۔۔۔ "آپ کی بیوی ہونا' کوئی آسان کام نہیں۔"

پاکستان واپس آتے ہوئے' میں نے محسوس کیا کہ ایمبولینس چلا چلا کر میرے ہاتھ پاؤں اکڑ چکے ہیں۔ میں نے بلقیس کو بتایا کہ سفر کے مصائب اور دیگر تکالیف اٹھا کر' حج کرنے میں جو روحانی سکون ملتا ہے' ہزاروں آسائشوں سے بھی ممکن نہیں۔۔۔۔ بلقیس ہنس پڑی اور کہنے لگی ۔۔۔ "آپ کی باتیں سن کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی آپ چاہیں گے کہ اپنی میت کو خود غسل دیں' خود ہی کفن پہنائیں اور خود ہی اپنے آپ کو دفن کر دیں"۔۔۔۔ ایمبولینس وین نے دوران سفر ہمیں کوئی خاص تکلیف نہ دی لیکن کویت میں آکر اس نے ہاتھ کھڑے کر دیئے کہ بس۔۔۔۔ شیروانی میں ملبوس ایک صاحب' ہمیں پریشان دیکھ کر قریب آئے۔ تعارف ہوا تو انہوں نے ہمیں اپنے گھر چلنے کی پیشکش کی تاکہ سکون کے ساتھ گاڑی بھی درست کرا لی جائے اور آرام بھی کر لیں۔ بلقیس نے اس گھر میں جا کر یوں محسوس کیا' جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہو۔۔۔۔ گذشتہ کچھ دنوں سے اس کی نکسیر بھی پھوٹ رہی تھی۔ آخرکار وہ اس قابل بھی نہ رہی کہ میرے ساتھ سفر جاری رکھ سکے' چنانچہ اسے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی روانہ کرنا پڑا۔

قافلہ' عراق کے مقدس شہر کربلا تک آ پہنچا تھا جہاں نواسہ رسول؂ حضرت امام حسینؑ اپنے عہد کے ظالموں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے' راہ حق و صداقت میں' اپنے خاندان اور ساتھیوں سمیت شہید ہوگئے۔ وہ علاقہ جو پہلے کبھی لق و دق صحرا کی صورت تھا' اب وہاں ایک پرہجوم شہر آباد ہوچکا تھا۔ عین وسط میں حضرت امام حسینؑ کا مقبرہ تھا۔ اپنے ساتھیوں سے الگ ہوکر' میں ان آثار کو دیکھنے میں محو ہوگیا۔ کربلا کے بے آب و گیاہ جنگل

میں صدیوں پہلے' ظالم و مظلوم کے درمیان جو لکیر کھینچی گئی تھی' آج بھی واضح نظر آتی ہے۔ اس موقع پر مجھے بانٹوا میں اپنے استاد کے یہ الفاظ یاد آگئے ۔۔۔ "کربلا کا سانحہ' تاریخ کا محض ایک واقعہ نہیں' ایک دائمی حقیقت ہے جو کسی کمزور انسان کو ظلم اور ناانصافی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔" اجتماعی سماجی بہبود کے نظام اور اس کے احیا کے لیے میری جدوجہد بھی اسی حوالے سے تھی۔ اس سانحہ نے مجھے اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہنے کا درس دیا ہے۔

بلقیس کراچی جا چکی تھی اور میں کارواں کے ساتھ تنہا ڈرائیونگ کرتا گھر لوٹ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ شریک سفر رہتے ہوئے' کس قدر شور شرابا کرتی تھی اور میری سوچ کے راستے میں کیسی کیسی رکاوٹیں کھڑی کر دیا کرتی تھی۔ میں اس کے بغیر بے حد اداس تھا۔ ایسے لگتا جیسے وہ' روشنی بھی اپنے ساتھ لے کر چلی گئی ہو۔ واپس میٹھادر پہنچا تو مزید سفر کرنے کی آرزو نہ رہی۔

کچھ عرصہ بعد' کراچی ایئرپورٹ پر' میری ملاقات حاجیوں کے ایک گروپ سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا ۔۔۔ "کیا تم زکوۃ دیتے ہو؟" صرف ایک نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے سب کو مخاطب ہو کر کہا ۔۔۔ "کیا آپ لوگوں نے کبھی سوچا کہ غریبوں کا مال کھا جانے سے حج قبول ہو جائے گا؟" خاموشی کے سوا' ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

1973ء کے دوران' ایدھی فاؤنڈیشن کو' ٹریڈ یونین کے بکھیڑے کا سامنا کرنا پڑا۔ ہنگامی اور حساس نوعیت کی تنظیموں میں یونین سازی کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن جس انداز میں یونین سازی کی سازش ہمارے ادارے میں ہوئی' اس کا واحد مقصد' قیمتی وقت کا زیاں تھا۔ اس کے بعد ہی 1994ء میں ادارے کو نئے سرے سے رجسٹرڈ کرایا گیا اور ایدھی فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی گئی۔

بلقیس' میری بیوی ہی نہیں' ایک معتمد ساتھی کارکن بھی تھی۔ میں اسے اپنے سامنے سے گزرتے' ذہنی مریضوں سے گپ لگاتے اور بچوں سے کھیلتے دیکھتا۔ بعض اوقات وہ میری حد سے زیادہ کفایت شعاری پر شکوے بھی کرتی' تاہم کام کے دوران کسی انجانی خوشی کے احساس سے اس کی آنکھیں چمکتی رہتیں۔ وہ کسی ان دیکھی خوشی کے احساس سے' خوش و خرم نظر آتی۔

بلقیس کے دونوں بھائی' اقبال اور محمود بہت اچھے تھے۔ اقبال' مقامی بینک میں بیس سال سے کام کر رہا تھا۔ افسران کو اس کی یہ عادت پسند تھی کہ وہ مقررہ وقت سے پہلے آتا اور چھٹی کے بعد بھی کام کرتا رہتا۔۔۔ ایک مرتبہ جب اعلیٰ حکام کے سامنے اس کا تعارف میرے حوالے سے کرایا گیا تو اس نے فوراً" ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "جناب' میرے ساتھ' میری اپنی صلاحیت کار کے حوالے سے سلوک کریں۔ مہربانی فرما کر ایدھی کو میری شناخت کا حوالہ نہ بنایا جائے"۔

کھارادر میں آج بھی چھوٹی چھوٹی تنگ جگہوں پر' کئی منزلہ عمارات میں بہت سے افراد اور خاندان گتھم گتھا رہائش پذیر تھے۔پانی بہت کم دستیاب تھا' جس فلیٹ میں رابعہ ماں رہتی تھیں وہاں صبح شام صرف ایک گھنٹے کے لئے سمندر کے کھارے پانی کی سپلائی ملتی۔ لوگ قطرہ قطرہ گگریوں میں بچا کر رکھتے۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ اس پانی میں صابن تو گھلنے کا نام ہی نہ لیتا' کہاں کا دھونا نہانا۔۔۔ لوگ بڑے جوکھم سے قطاروں میں کھڑے ہو کر چار گھونٹ میٹھا پانی' کارپوریشن کے نلکوں سے بھر لاتے وہ بھی ہاتھا پائی اور لڑائی مار کٹائی کے بعد۔۔۔ ایک مرتبہ تو معاملہ ایک دوسرے کی جان لینے تک پہنچ گیا۔ دق کی بیماری میں مبتلا ایک لڑکی نے دوسری کے گھڑے میں تھوک دیا جس پر اسے تھپڑ مار دیا گیا' پھر کیا تھا۔۔۔ فریقین ایک دوسرے کے روبرو آ گئے۔۔۔ گالیاں بکی گئیں' ایک دوسرے کے گریبان پھاڑے گئے' بال نوچے گئے اور دھمکیاں دی گئیں کہ ہم یہ معاملہ ایدھی تک لے جائیں گے۔ دوسری پارٹی کہنے لگی ۔۔ ہم ایدھی کو بتائیں گے کہ ایک بیمار لڑکی کو کیسی بے دردی سے مارا پیٹا گیا ہے۔ لوگوں کا ہجوم اردگرد جمع ہو گیا۔۔۔

سترہ رمضان 1976ء کو ہمارا چوتھا بچہ' فیصل پیدا ہوا' جس کے کچھ ہی دنوں بعد ہمیں فون کال کے ذریعے ایک عمارت کے گرنے کی اطلاع دی گئی۔ یہ کوئی ظالمانہ مذاق تھا یا کسی شخص کے ذہنی افلاس کا عملی مظاہرہ۔۔۔ جعلی سائرن' جھوٹ موٹ کی ڈرا دینے والی ہولناک آوازیں۔ میں ان خرمستیوں سے عاجز آ گیا تھا۔۔۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک طرف عبادت دوسری جانب یہ غوغا آرائی۔۔۔ سحری کے بعد مزید کسی اطلاع کے لئے دفتر گیا تو پتہ چلا کہ واقعی "بسم اللہ بلڈنگ" ڈھیر ہو چکی ہے۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا تو قیامت کا منظر تھا۔۔۔ چھ منزلہ ایک ناقص عمارت نے گر کر اپنے ملبے تلے ایک سو سولہ

افراد کو دفنا رکھا تھا' کچھ لوگوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ان میں سے بیشتر کو بچا لینے کی ایک ہی صورت تھی کہ بڑی بڑی کرینوں کی مدد لی جائے۔ لوہے کے بھاری بھرکم گاڈروں' لکڑی کے شہتیروں اور سیمنٹ کے دیوہیکل بلاکوں کو اپنی جگہ سے ہٹانا' کارکنوں کے بس کا روگ نہ تھا۔۔۔ یہ تو کسی دوزخ کا منظر لگتا تھا۔ آس پاس متاثرہ لوگوں کے قرابت دار' زارو قطار رو رہے تھے اور لرزتے کانپتے ہاتھوں سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ اپنے پیاروں کو زندہ حالت میں دیکھ سکیں۔

سانحہ کے تیسرے روز میں نے ایک آہنی گاڈر کے نیچے سے کسی انسان کو کراہتے محسوس کیا۔ ایک دراڑ کے ذریعے اس تک آکسیجن پہنچائی گئی۔ یہ آواز' ایک بچے کی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ ابتدائی معلومات کے مطابق' پچیس خاندان اس ناگہانی حادثے کا شکار ہوئے تھے۔ کتنے ہی بچے مر گئے اور کتنے' عمر بھر کے لئے معذور ہو کر رہ گئے۔ ساتھ ہی مرنے والوں کی اشیائے زندگی کی لوٹ مار کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بلقیس نے یہ بے رحم منظر دیکھا تو چند کارکنوں کو ساتھ لے کر' بچا کھچا سامان' نزدیکی سکول کی عمارت میں جمع کیا اور حکام کی نگرانی میں' لواحقین میں تقسیم کر دیا۔ شاید اب ایدھی فاؤنڈیشن' قومی سطح پر تسلیم کئے جانے کے قابل ہو چکی تھی۔

بسم اللہ بلڈنگ میں' ٹھیکیداروں نے سیمنٹ بچانے کے لئے زیادہ ریت استعمال کی تھی۔ بھٹو بھی جائے حادثہ پر آئے۔ انتظامیہ ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ وزیراعظم کے آنے سے لوگوں کی کچھ ڈھارس بندھی۔ بھٹو نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا اور کہا ۔۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف کہیے"۔ میں نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا ۔۔ "اپنی چارپائی میرے لئے کافی ہے' مجھے یہیں رہنے دیجئے۔" میں نے ان سے استدعا کی کہ متاثرین کی رہائش کا متبادل انتظام کرا دیں۔ انہوں نے موقع پر ہی احکامات جاری کر دیئے۔

وہ چھوٹا بچہ' جسے ملبے میں سے نکالا گیا تھا' بعد میں پتہ چلا کہ وہ عمران نامی اس بچے کا بھائی تھا جسے حادثے کے ابتدائی لمحات میں ایدھی سینٹر لایا گیا تھا۔ اس کے بھائی جاوید نے بلقیس کو حادثے کے واقعات سنائے ۔۔ "ہماری امی باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھیں اور ہم سب کھیل رہے تھے کہ ایک دم کوئی بھاری چیز مجھ پر آن گری اور اندھیرا چھا گیا۔ امی ۔۔۔ "عمران' جاوید۔ عمران' جاوید" کی صدا لگا رہی تھیں لیکن ہم ان کی صرف آواز ہی سن پا

رہے تھے، دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ سوچا، اگر ایدھی قریب ہوتے تو شاید ہمیں نکال لیتے۔" ان دونوں بچوں کو دادی نے پالا۔ پورے علاقے میں، اس حادثے کے سوگ میں عید نہیں منائی گئی۔

چند روز بعد اطلاع ملی کہ ایک اور بلڈنگ گر گئی ہے، جس کی خطرناک صورتحال کے بارے میں حکام کو پیشگی اطلاع دے دی گئی تھی۔ بہت سے خاندان تباہ ہوگئے۔ میرا دل اس بدنصیب عورت کے لئے رو رہا تھا جو ڈھیر ہو جانے والی عمارت میں، اپنی بوڑھی ماں اور تین جوان بیٹیوں سمیت جاں بحق ہو گئی تھی۔ اس کا خاوند، میرے سامنے سوگوار بیٹھا، اعتراف گناہ کر رہا تھا ـــ "میں ایک شرابی کبابی اور سخت گیر آدمی تھا جس نے زندگی بھر، اپنے بیوی بچوں کو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ترسایا۔ میری بیوی کپڑے سی کر محنت مزدوری کرتی۔ بمشکل ایک وقت کا گزارہ ہوتا۔ میں اس کا سب کچھ ایک حریص سود خور کی طرح چھین لے جاتا۔" وہ انتہائی وحشت انگیز انداز میں، اپنا سر پیٹنے لگا۔ میں نے اسے کہا ـــ "اب تمہیں تنہا، اسی پچھتاوے میں زندگی گزارنی ہے۔"

گھر میں ہمارا تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزرتا۔ بچے بھی اس کے عادی ہو چلے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت، بلقیس، رابعہ ماں یا خالہ کے ہاتھوں میں رہی۔ جس کے باعث کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ ہاں ایک مرتبہ جب ہمارے بڑے بیٹے قطب نے سائیکل کا مطالبہ کیا تو بلقیس نے بھی اس کے مطالبے کی حمایت کر دی اور دلیل دی کہ اس کے سارے دوست بھی تو سائیکلوں پر سوار سکول جاتے ہیں، یہ کیوں نہ جائے؟ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ـــ "ہمیں اپنی خواہشوں پر زور دینے کی بجائے ان لوگوں کی جانب دھیان دینا چاہئے جن کے پاس سائیکل بھی نہیں"ـــ بعض اوقات میں غصے میں آکر خدا جانے کیا کچھ کہہ جاتا ـــ میری دلیل یہ تھی کہ ہم اگر دنیا کے تمام بچوں کیلئے سائیکل نہیں خرید سکتے تو پھر اپنے بچے کے لیے بھی نہیں خریدیں گے۔

بچے سکول سے واپس آکر اپنی ماں کو شکایتاً" بتاتے ـــ "امی، ہمیں سکول میں کوئی بھی ایدھی کے بچوں کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ سب کہتے ہیں کہ تمہیں تو کوئی بھی نہیں مانتا کہ کس کی اولاد ہو"ـــ لیکن میں نے بلقیس کو پہلے ہی ہدایت دے رکھی تھی کہ کسی طرح بھی اور کسی جگہ پر بھی میرے نام کو شناخت کا حوالہ نہ بنایا جائے۔ ہماری بڑی بیٹی

الماس میرے الفاظ پر اس سختی سے کاربند تھی کہ جب انٹرویو میں اس سے والد کا نام پوچھا گیا تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔ــ شکر ہے کہ میرے بچوں نے بھی اپنا موازنہ، دوسرے بچوں سے نہیں کیا۔ میں بلقیس کو یقین دلاتا کہ خوشحال بچوں کی پیروی، ہمارے بچوں کے لیے کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر گڑھے میں گرتا ہے، تو کیا ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو بھی گرنے دیں؟"

اپنی محتاط طبیعت کی بنا پر اپنی اولاد اور خاندان کو شروع ہی سے بڑی بڑی کاروں اور فلک بوس محلات کو للچا کر دیکھنے کی عادت سے باز رہنے کی تلقین کر دی تھی۔ انہیں سمجھاتا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے یا لوگوں کی تحویل میں ہے، یہ سب قومی امانت ہے۔ آج انہیں جو بھی حالات درپیش ہیں، یہ ان کے مستقبل کے حوالے سے، ہنگامی ٹریننگ کا حصہ ہیں۔ پیدل سکول جانے، بس یا تانگوں کے ذریعے سفر کرنے، گھر سے باہر کے نلکوں سے پینے کا پانی لانے اور اپنے ماں باپ کو لاشوں کی عفونت سے دوچار، گرمجوشی کے ساتھ کام کرتے دیکھنے کے یہ مرحلے، بچوں کی کردار سازی کے لئے موزوں ہیں۔

ہمیں وقت اور سرمایے کا ضیاع گوارا نہ تھا۔ شاید اسی لیے ہمارا دوسروں کے گھروں میں آنا جانا بھی کم تھا۔ میں تقریبات میں بھی خال خال جاتا۔ اپنے برادر نسبتی اقبال کی شادی میں گیا بھی تو مجبوراً" پندرہ منٹ کے لیے۔ اس سے پہلے دو شادیوں میں شامل ہو کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ تو سراسر وقت کا ضیاع ہے اور میری مصروفیات سے باہر کی کوئی چیز ـــ

اندرون سندھ کسی میت کو پہنچانا ہوتا تو بلقیس مجھے ساتھ چلنے کو ضرور کہتی تاکہ فرض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ، بچوں کی تفریح بھی ہو جائے۔ میں ہمیشہ کی طرح، اس خواہش کی مخالفت کرتا ـــ "تم بچوں کو کیوں اذیت دیتی ہو۔ یہ سفر نہ تو خوشی کا ہے، نہ کھیل تماشا"ـــ بلقیس کہتی ـــ "پھر انہیں کہاں لے جایا کریں، کم از کم جوان ہو کر یہ تو کہا کریں گے کہ امی ابا جہاں جاتے تھے ہمیں ساتھ لے جایا کرتے، حتیٰ کہ قبرستان بھی"ـــ بچے یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ سندھ جا رہے ہیں۔ چھلانگ لگا کر ایمبولینس کی عقبی سیٹ پر جا دھمکے، جہاں ایک خاتون، اپنی بچی کی لاش لئے پہلے ہی بیٹھی تھی ـــ ہماری منزل اندرون سندھ کا ایک قصبہ سکرنڈ تھا جہاں ہم نے میت پہنچانا

تھی۔۔۔۔ بلقیس نے اپنے ساتھ بھنا ہوا سالن اور کچھ خربوزے رکھ لئے تھے' جنہیں راستے میں کھانا مقصود تھا۔ رات کے اندھیرے میں سفر جاری تھا۔ سکرنڈ کے خطرناک علاقے میں پہنچے تو بے چاری عورت اپنے گھر کا راستہ بھول گئی۔ جدھر وہ کہتی' میں گاڑی کا رخ ادھر کر دیتا' لیکن بے سود۔۔۔۔ آخرکار وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گئی اور زور زور سے پکارنے لگی "ہارونا او ہارونا"۔۔۔۔ اندھیرے میں سانپوں کے شوکنے کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

عین ہمارے سامنے سیدھی افقی حالت میں چار نقاب پوش گھڑ سوار کھڑے تھے۔ بوڑھی اماں تو دیکھتے ہی چلا اٹھی ۔۔۔ "یہ وہ ظالم ڈاکو ہیں جو مارتے پہلے ہیں اور نام بعد میں پوچھتے ہیں۔" چاروں نے ایمبولینس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ پھر میرے قریب آ کر ایک نے پوچھا ۔۔۔ "کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"۔۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "عبدالستار ایدھی ہوں اور میت چھوڑنے یہاں آیا ہوں"۔۔۔۔ گھڑسوار نے واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور پھر میرے قریب آ کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یہ علاقہ بے حد خطرناک ہے' یہاں رات کو سفر نہ کیا کرو"۔ میں نے شکریے کے طور پر سلام کیا ۔۔۔ نقاب پوشوں نے بھی اپنی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ کر میرے شکریے کا جواب دیا۔۔۔۔ بلقیس کی جان میں جان آئی' میں نے بھی سکھ کا سانس لیا' بچے دبکے بیٹھے تھے' اٹھ کھڑے ہوئے۔

زندگی کے المیے' روز کا معمول تھے اور لاشیں اٹھائے پھرنا میرا پیشہ بن چکا تھا۔ بلقیس کے گھریلو بکھیڑے بھی' کچھ کم صبر آزما نہیں تھے۔ اس نے بچوں کے ساتھ مل کر مطالبہ کر دیا کہ گھر میں ٹیلی ویژن لایا جائے تاکہ بچے بھک منگوں کی طرح' دوسروں کے گھروں میں نہ جھانکتے پھریں۔ میں نے بلقیس کو ٹال دیا' پھر سمجھایا ۔۔۔ "انہیں ٹیلی ویژن کی بجائے دوسرے کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کیا کرو۔" بچوں اور بلقیس کا یہ تقاضا مہینہ بھر تو پوری شد ومد کے ساتھ چلا اور پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔ میں نے سوچا کہ اچھی بات۔ آخر بلقیس نے صورت حال سے سمجھوتہ کرتے ہوئے بچوں کو کسی اور طرف لگا دیا ہے۔ ایک روز قطب نے بڑی معصومانہ رازداری سے مجھے بتایا ۔۔۔ "امی نے قسطوں پر ایک ٹیلی ویژن خریدا ہے جو گھر میں رکھا ہے۔ ہم آپ کی موجودگی میں اسے کپڑے میں لپیٹ کر چھپا دیتے ہیں اور جب آپ نہیں ہوتے تو اسے لگا کر خوب دیکھتے ہیں۔" میں یہ جان کر ورطہ

حیرت میں پڑ گیا کہ یہ لوگ اتنی وزنی چیز کو کیسے کونوں کھدروں میں چھپائے پھرتے ہیں اور وقت بے وقت دیکھ بھی لیتے ہیں۔

بلقیس سے خفا ہوا کہ تم اس طرح نہ صرف مجھے بے وقوف بنا رہی ہو بلکہ اپنے بچوں کو بھی جھوٹ بولنے کی ترغیب دے رہی ہو۔ وہ معذرت کرنے کی بجائے' کچھ اور رنجیدہ ہو گئی۔ میں نے اسے وارننگ دی کہ اگر ٹیلی ویژن واپس نہ کیا گیا تو میں گھر نہیں آؤں گا۔ دوسرے ہی روز' بلقیس نے قسطوں سے خریدا گیا ٹیلی ویژن واپس کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد' میں ٹیلی ویژن لے آیا اور بلقیس کو تاکید کی کہ وہ اسے دیکھنے میں بچوں کی حوصلہ شکنی کیا کرے۔۔۔۔ وقت آگے بڑھتا رہا۔ بلقیس' پانچوں بچوں کے ساتھ' میرے خلاف چھوٹی چھوٹی معصوم بغاوتوں کی رہنمائی کرتی رہی۔۔۔۔ ہماری منزل ایک تھی۔ میں ایک سنجیدہ اور باعمل کارکن باپ تھا' بلقیس اپنے بچوں پر سب کچھ قربان کر دینے والی ماں بھی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ میری شناخت' ایک ضدی اور انتہا پسند شخص کی حیثیت سے کریں پر یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ عاجزانہ زندگی گزارنے کے لئے میں نے اعتدال کا جو پل' خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا' اسے اپنی زندگی میں اپنے بچوں کے ہاتھوں ٹوٹتے دیکھوں۔

بیس بائیس سال کا ایک نوجوان قیدی جیل میں مر گیا۔ ایک ماہ بعد اس کے دوستوں نے' مرحوم کی بیوی اور ماں کی جانب سے درخواست کی کہ میں اس کی میت پنجاب لے جاؤں۔ کسی میت کی امانتی تدفین بھی انوکھا اور حیران کر دینے والا نظریہ ہے۔۔۔۔ جس کے تحت موت کے بعد میت' ایک معینہ عرصے تک معرض التواء میں پڑی رہتی ہے۔۔۔۔ میں نے خود جا کر قبر کھودی اور نوجوان کو باہر نکالا' دیکھا کہ میت جوں کی توں تازہ تھی اور کفن تک میلا نہ ہوا تھا۔ میں نے بلقیس کو ایک خاتون کا واقعہ یاد دلایا جسے امانت کے طور پر دفن کیا گیا تھا اور جب دو ماہ بعد اس کی قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی موجود تھی۔ میرا خیال ہے کہ خاک' ان تمام میتوں کی حفاظت کا ذمہ لے لیتی ہے جنہیں امانت کے طور پر دفن کیا جاتا ہے۔

مرنے والے نوجوان کے دوستوں نے بتایا کہ ان کے پاس میت لے جانے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ بلقیس نے یہ بات سنی تو ان کی حمایت میں بولنے لگی اور میت کے ساتھ پنجاب جانے کو تیار ہو گئی۔ اس دلیل کے ساتھ کہ ہم ایک وقت میں دو کام کر سکتے ہیں۔

سیالکوٹ سے بیساکھیاں بھی خرید لیں گے اور میت بھی سپردخاک کر آئیں گے۔

کراچی چھوڑنے سے پہلے، علی الصبح حسابات چیک کرنے، دماغی امراض کے یونٹ گیا تو ایک نیم پاگل لڑکی کے مسلسل رونے اور لوگوں کو گالیاں دینے کی آواز نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس کا نام فریدہ تھا۔۔۔ جب میں اس کی طرف دھیان دیئے بغیر جانے لگا تو یونٹ انچارج دوڑی آئی اور کہنے لگی ۔۔۔ "یہ لڑکی، کل سے سیڑھیوں کے نیچے بیٹھی ہے۔ ہر آنے جانے والے کو گالیاں دیتی ہے اور کسی کی نہیں سنتی۔" ہسٹری پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس بدنصیب کے ساتھ کئی مرتبہ زنا بالجبر ہو چکا ہے ۔۔۔ علاج معالجے کے بعد جب بھی باہر گئی، آوارہ منش لوگوں نے اس کا دامن عصمت تار تار کیا۔۔۔ اب ہم حفاظت کے خیال سے، اسے روکتے ہیں تو گالیاں دیتی اور باہر نکلنے کے لئے چیختی چلاتی ہے۔" یہ سن کر میں نے خلاف معمول، طیش میں آکر، اس ذہنی مریضہ کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ وہ خوف سے سہم گئی۔

بلقیس نے پنجاب کے سفر کے لئے، قطب کو بھی تیار کرلیا تھا۔ ہم تینوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میت کے ساتھ، اس کے دوستوں نے پچھلی سیٹوں پر گزارہ کرلیا۔ راستے بھر مجھے اس احساس جرم نے ستائے رکھا کہ میں نے ذہنی طور پر ایک معذور لڑکی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ سوچتا رہا کہ میرا فعل، بلاجواز تھا۔ انتظامی یا اس لڑکی کی فلاح و بہبود ۔۔۔ کسی حوالے سے بھی میرا یہ اقدام مناسب نہ تھا۔ دل ہی دل میں، خدا سے معافی مانگتا رہا۔

سندھ عبور کرکے، ہم پنجاب کے شہر رحیم یار خان تک آپہنچے۔ یہاں ناشتہ کیا اور عازم سفر ہوئے۔ چند فرلانگ ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک ایمبولینس دو چار قلابازیاں کھا کر الٹ گئی، میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ جائے حادثہ کے قریب کچھ لوگ چارپائی پر بیٹھے تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے تابوت کو ویگن سے اچھل کر گرتے دیکھا۔ جہاں بلقیس بیٹھی تھی، اس طرف کا دروازہ کچھ اس طرح کھلا کہ بلقیس، آرام سے نیچے جاگری اور اسے آنچ تک نہ آئی۔ اس نے قطب کو بھی تھام رکھا تھا۔ وہ بھی محفوظ رہا۔ ہر طرف گرد اڑ رہی تھی۔ عجیب بے کسی کا عالم تھا۔ بلقیس نے جب مجھے بے ہوش پایا تو گھبرا گئی۔ نوجوانوں میں سے کوئی بھی زخمی نہ ہوا تھا لیکن حواس کسی کے بھی بجا نہ تھے۔ میں جس طرف گرا تھا، وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ میرا پہلو زخموں سے چور تھا۔ بلقیس نے چیخنا چاہا لیکن فرط غم سے

اس کی آواز رندھ گئی۔

میری عادت تھی کہ لمبے سفر میں، روپے پیسے احتیاطاً مختلف جگہوں پر چھپا کر رکھتا۔ بلقیس نے وین کے کونوں کھدروں سے، پچیس ہزار روپے نکال ہی لئے۔ میں نے اسے میٹھادر سے چلتے وقت ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر راستے میں کوئی واقعہ پیش آجائے تو میت کے ہمراہ لوگوں کو کچھ رقم دے کر آگے روانہ کر دینا۔ چنانچہ وہی ہوا اور لڑکے ایک بس کی چھت پر تابوت باندھ کر، سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔

ایک مسافر نے ہم سب کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر رحیم یار خان تو پہنچا دیا لیکن ہسپتال تک جانے کا راستہ اس قدر تنگ تھا کہ کار نہ جا سکی۔ چار و ناچار، ایک تانگے پر ڈال کر مجھے ہسپتال پہنچایا گیا۔ ہسپتال بھی بس نام کا تھا۔ ایکسرے کی سہولت تھی نہ آپریشن تھیٹر، نہ ڈاکٹر، نہ ادویات، نہ نرسیں، نہ زخم ڈھانپنے کو پٹیاں، حتیٰ کہ ڈسپرین کی گولیاں تک نایاب تھیں۔ ٹیلیفون تو پڑا تھا، البتہ کال صرف باہر سے آسکتی تھی۔ صورتحال سے گھبرا کر، بلقیس نے اپنی چادر پھاڑی اور پٹیاں بنا کر میرے زخموں پر باندھیں۔ کئی گھنٹوں کی رسوائی کے بعد، یہ تھی وہ طبی امداد جو بلقیس کے چاک پیرہن کے وسیلے سے مجھے ملی۔۔۔ بلقیس میری کیفیت دیکھتے ہوئے بے چین تھی کہ کراچی سے کوئی آئے اور ہمیں اس عذاب سے بچا کر لے جائے۔ وہ تانگے میں بیٹھ کر ڈاکخانے گئی اور کراچی فون کیا۔۔۔ "خدا کے لئے جلد پہنچو، ورنہ ایدھی مرجائے گا۔" یوں میرے مرنے کی افواہ، میٹھادر کے ان گلی کوچوں میں پھیل گئی جہاں میں ایک چوتھائی صدی سے کام کر رہا تھا۔ میرے سوگ میں دکانیں، مارکیٹ اور بازار بند ہو گئے اور جوق در جوق لوگ، ٹرسٹ دفتر کے باہر جمع ہو گئے۔۔۔ لوگ پوچھتے رہے ..... "کیا واقعی ایدھی مر گیا ہے؟ کیا یہ سچ ہے..... اسے ابھی مرنا نہیں چاہیے تھا، آخر ہوا کیا؟" لوگ رو رہے تھے، بین کر رہے تھے لیکن میں ان سے بہت دور، زندہ تھا۔ میرے ساتھی، حادثے کے چوبیس گھنٹے بعد رحیم یار خان پہنچ گئے۔

یہ وہ دن تھا جب وزیراعظم بھٹو کو، بسم اللہ بلڈنگ کے متاثرین میں فلیٹ تقسیم کرنا تھے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ ایدھی کہاں ہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ گاڑی کے حادثے میں زخمی ہیں اور رحیم یار خان کے ایک ایسے ہسپتال میں پڑے ہیں جہاں نہ ڈاکٹر ہے نہ دوائیں۔۔۔ اس پر بھٹو نے جہاز کے ذریعے ہمیں کراچی پہنچایا جہاں میں سول ہسپتال میں

زیر علاج رہا۔

میرا دایاں جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ سر پر بھی چوٹیں تھیں اور میری دائیں آنکھ سے مسلسل خون بہنے لگا تھا' چہرے کی ہڈیاں پچک سی گئی تھیں۔ اس حالت میں' بلقیس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی روح میں کلبلانے والی اس اذیت کے بارے میں بتانا چاہتا تھا جو حادثے کے باعث' میرے جسم پر آنے والے زخموں سے بھی زیادہ ہلاکت آفریں تھی۔۔۔ آپریشن کرکے میرے جبڑے اور ٹوٹے پھوٹے دانتوں کو' لوہے کی تاروں سے کسی حد تک مربوط کر دیا گیا۔ وہ لوگ جو ایک افواہ کی بناء پر میری موت کا سوگ منا چکے تھے' انہیں باقاعدہ آویزاں ایک بورڈ کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔

ہوش آیا تو میں نے بلقیس کو اپنے قریب آنے کو کہا اور اسے بتایا ۔۔۔ "تم لوگ اسے محض کار حادثہ سے تعبیر کر رہے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں کہ مجھے اندرونی طور پر' بہت کڑی سزا ملی ہے۔ میری روح گھائل ہو چکی ہے۔" بلقیس یہ سن کر مبہوت تھی۔ اس نے میری حالت دیکھ کر چپ رہنے کو کہا لیکن ۔۔ اب تو مجھے اپنے سر سے وہ بوجھ اتارنا تھا جسے میں کئی دنوں سے اٹھائے پھر رہا تھا۔ خدا نے میرا چہرہ مسخ کر دیا اور وہ ہاتھ ٹوٹ چکا تھا جو ایک ذہنی پسماندہ لڑکی کی طرف بڑھا تھا۔ درد کی شدت اور زیادہ نہ بول سکنے کی کیفیت کے باوجود' میں بلقیس کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔

دو ماہ تک' میں زیر علاج رہا اور لوگ میری پرسش احوال کو ہسپتال آتے رہے۔ چاہا کہ بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے' تمام اخراجات خود ادا کروں کیونکہ والد مرحوم اکثر کہا کرتے تھے ۔۔۔ "سرکاری خزانے سے تمہیں کچھ بھی نہیں لینا چاہیے کہ یہ قوم کی امانت ہے۔"

میٹھادر دفتر کے باہر' بینچ پر بیٹھنے سے مجھے یوں لگا کہ ۔۔۔ ابھی بہت کمزور اور بے بس ہوں۔ بلقیس نے حادثے کو یاد کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "آپ نے دیکھا کہ کسی مریض کو' اگر بروقت دوائیں اور طبی امداد مل جائے تو اس کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ بہت سارے لوگ شاید اسی لئے وقت سے پہلے مر جاتے ہیں۔"

میں زیادہ گفتگو کے قابل نہ تھا تاہم میں نے بلقیس کو بتایا کہ جب کبھی حکومت' عوامی مفادات کے پیش نظر' کسی فلاحی منصوبے کی اجازت دیتی ہے تو پہلے سے گھات میں بیٹھے

کرپٹ لوگ' اس کی تکمیل پر اٹھنے والا سرمایہ کھا پی جاتے ہیں۔ بلقیس اپنے طور پر کہتی رہی ۔۔۔ "لوگوں کو تو درد سر کی گولی تک میسر نہیں۔ آپ جس حالت میں بھی ہیں' اٹھیں۔ میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ آپ اپنا وعدہ ایفا کریں۔" بلقیس کے ہمت بندھانے پر' مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے پھر کمربستہ ہوگیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ بعد میں وہ ذہنی طور پر خستہ حال فریدہ' مجھے کراچی سے باہر' ملک کے وسیع و عریض' دور افتادہ علاقوں میں گھمانے لے گئی۔

فاؤنڈیشن کے وسعت کار کے بارے میں جان کر' میرے ساتھیوں کو اچنبھا ضرور ہوا لیکن وہ میرے مصمم ارادے اور ثابت قدم رہنے کی عادت سے واقف تھے۔ سب لوگ خاموشی سے چل پڑے۔ وضاحت کرتے ہوئے' میں نے دوستوں سے کہا ۔۔۔ "قدرت کاملہ' شاید خود ہی راستے متعین کر رہی ہے۔ ارادہ ہے کہ بڑی سطح پر' ملکی شاہراہوں اور دور سرحدوں تک' لنگر لگائے جائیں جہاں مسافروں کو مفت کھانا مل سکے۔" ساتھیوں میں سے ایک نے کہا ۔۔۔ "حیرت ہے' تنہا ایک شخص اپنے ناتواں کاندھوں پر' اتنا سارا بوجھ اٹھانا چاہتا ہے!"

میری عدم موجودگی میں سب نے باہم مشورہ کیا۔ ایک نے کہا ۔۔۔ "میں ایدھی کے ساتھ ایک عرصے سے کام کر رہا ہوں۔ اس نے اپنا طریقہ کار نہیں بدلا۔" دوسرا بولا ۔۔۔ "دوسرے تمام فلاحی ادارے سال میں ایک آدھ بار ہی کھلتے ہیں۔ ہماری تنظیم شب و روز مصروف عمل ہے۔ جو کارکن اس سے اتفاق نہیں کریں گے' ان کا راستہ ہی بدل جائے گا۔ سو کاہے کی بحث اور کہاں کا پروگرام۔"

کافی دیر تک' حیران رہنے کے بعد' ساتھی کارکنوں نے بلقیس سے پوچھا ۔۔۔ "یہ لنگر کا منصوبہ ہے کیا بلا۔۔۔ ملک کے طول و عرض میں اس کا پھیلاؤ اور مناسب دیکھ بھال' یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟" کئی قریبی ساتھیوں کو ڈر تھا کہ مجوزہ پروگرام میں دور دراز کا سفر درپیش ہوگا اور انہیں طویل عرصہ' میرے ساتھ گزارنا پڑے گا۔ میں نے کہا ۔۔۔ "مجھے خیرات کے مروجہ طور طریقوں سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے جس کے غیر حقیقی اور جعلی دکھاوے کی میں نے برملا نفی کی ہے۔ ابھی تو میں اپنے نئے پروگرام اور مشن کا سنگ بنیاد ہی رکھ رہا ہوں۔ تعمیر بعد کی بات ہے۔"

دوسری جانب، آنکھوں میں دھول جھونک کر مطلب نکالنے کے حربے بھی استعمال ہو رہے تھے۔ سیٹھوں کا ایک امیر اور خوشامد پسند طبقہ، چاپلوسوں کو تھوڑا بہت الںام دے کر، پریس میں اپنی نام نہاد خدا ترسیوں کی تشہیر کراتا جبکہ ایجنٹ، غریبوں کے نام پر لیا گیا پیسہ خود ہی ہڑپ کر جاتے۔ میں نے لوگوں کو ان فریب کاریوں سے بہت خبردار کیا کہ یہ تو دو طرفہ تعلقات کا شاخسانہ ہے۔ سیٹھوں کو اپنی مدح میں گیت گانے والوں کی ضرورت ہے اور گیت کاروں کو مالی سرپرستی کی۔ جب دونوں پارٹیاں، اپنے اپنے ضمیروں کا سودا کر لیتی ہیں تو اصلاح احوال کے سارے کام، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیس بائیس سال کی کوئی لڑکی مرجاتی ہے تو بعض لوگ، اس کی موت کا وظیفہ لیتے رہتے ہیں۔ پھر کہیں سے ہاتھ لگنے والا کوئی بچہ، مرحومہ سے منسوب کرکے، اس کے تعلیمی اخراجات کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ یوں حریص اور فریب سے روپیہ کمانے والوں کے ہاتھوں، کار بہبود کی تذلیل ہوتی رہتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو، صرف پانچ برسوں میں ہی، عروج و زوال کے سارے مرحلے طے کر گئے۔ جن لوگوں نے انہیں بطور مسیحا خراج پیش کیا تھا، آج وہی سڑکوں پر آکر، ان کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اپوزیشن جماعتوں کا خیال تھا کہ 1976ء کے دوران، محض پیپلزپارٹی کے جتوانے کے لئے، انتخابات "مانیٹر" کئے گئے تھے۔ دھاندلی کا یہ الزام اس قدر شدید تھا کہ "قومی اتحاد" کے نام سے ایک سیاسی جماعت معرض وجود میں آگئی جس نے بھٹو کے اقتدار کو سرعام چیلنج کر دیا۔ پاکستان کو ایک بار پھر اسی شورش، سیاسی عدم استحکام اور نااتفاقی کا سامنا ہوا جس کے مناظر، تقسیم ہند کے فوراً بعد، یہ قوم دیکھ چکی تھی۔ بھٹو نے مخلوق خدا کی ڈھارس بندھانے کی بہت کوشش کی لیکن آگ اتنی بھڑک چکی تھی کہ شعلے سروں سے بلند ہونے لگے۔ بھٹو نے بھی انہیں سرد کرنے میں تاخیر کر دی۔ دوست کہتے کہ بھٹو کو اس انداز میں اقتدار سے ہٹانا درست نہیں۔ اس طرح قومی اداروں کی رسوائی، دستور کی بے حرمتی اور جمہوری سفر کو خطرات لاحق ہونے کا اندیشہ تھا۔

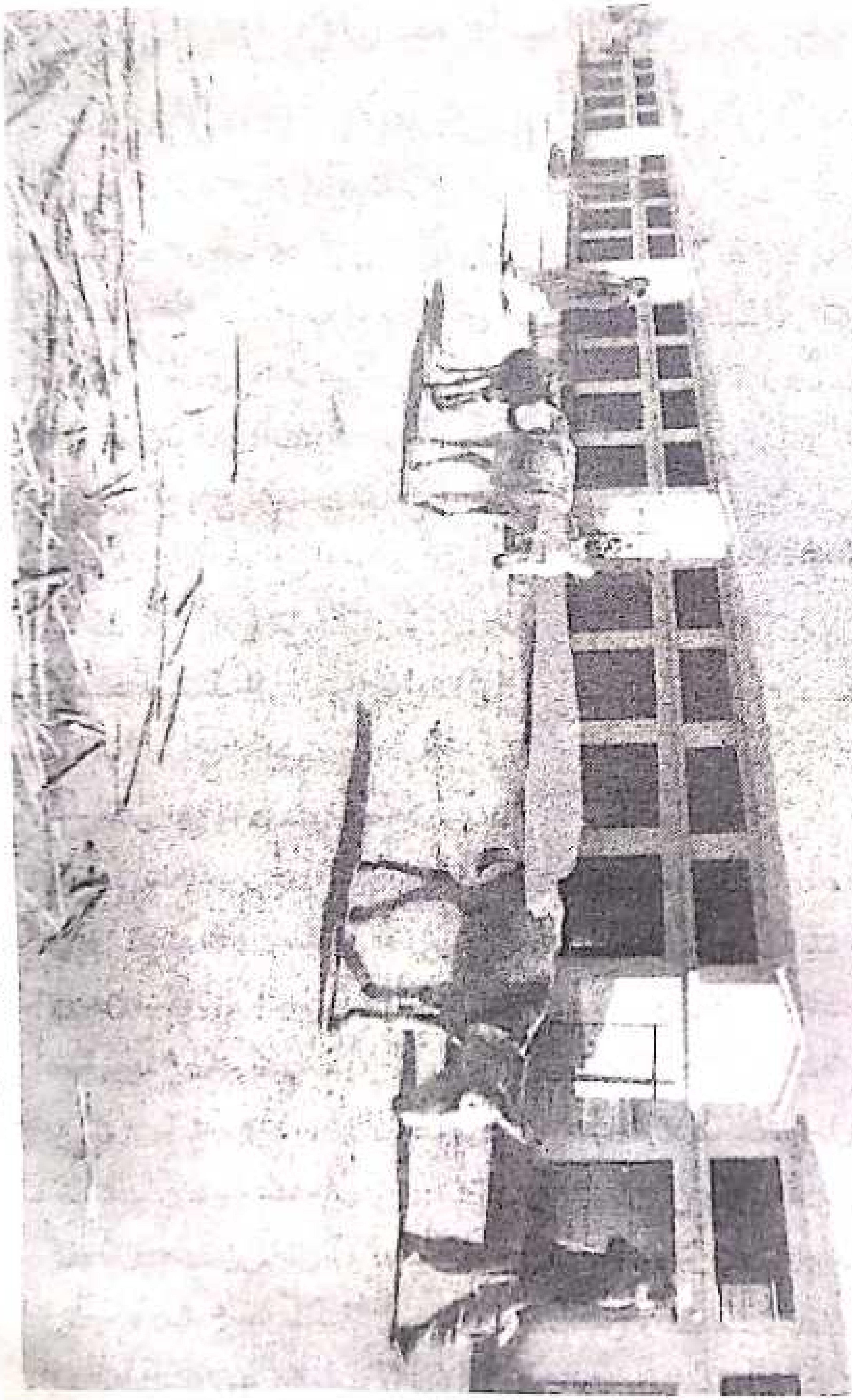
سیاسی فسادات کے نتیجے میں، سرکاری و نیم سرکاری املاک برباد ہونے لگیں اور جانوں کا اتلاف بھی ـــ میں نے حسب معمول زخمیوں کو ہسپتالوں تک پہنچانے اور مرنے والوں کو دفنانے کا کام شروع کر دیا ـــ کھوکھلے اور مبالغہ آمیز نعروں کے پس منظر میں رہ کر، میں ایک

فلاحی ریاست کے لئے سنگ بنیاد رکھنے اور اس کی منصوبہ سازی کی جانب متوجہ ہوگیا ـــ اگرچہ میں بھی کمزور تھا اور میری کرسی بھی مضبوط نہ تھی۔

خدا سے، میں نے ایک بار پھر دعا کی کہ وہ مجھے غرور و تکبر سے بچائے۔



ایدھی رضا کار' زخمی بے زبان کی مرہم پٹی کر رہے ہیں



ایدھی فاؤنڈیشن کے زیر انتظام' بیمار اور زخمی جانوروں کی مستقل علاج گاہ اور جائے پناہ

باب ہفتم

بچوں کے خواب

1977ء میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور جنرل ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اقتدار حاصل کرلیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا گیا۔ بھٹو کے عہد میں ملک، ہمیشہ قیاس آرائیوں کی زد میں رہا۔۔۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ..... "انسانی تاریخ میں بپا ہونے والے تمام انقلابات ایک کرپٹ نظام زندگی کی پیداوار ہیں اور کبھی کبھار ایک آمر ہی صاحب اختیار ہوتا ہے کہ سماج میں انقلابی تبدیلیاں لائے، اگر وہ لوگوں کے دکھوں کا علاج نہیں کرتا اور اپنے مفادات کا دائرہ بھی وسیع کرلیتا ہے تو اس کی خودنمائی، جمہوریت کے راستے کھول دیتی ہے۔"

لوگ کہتے تھے کہ جنرل ضیاء الحق نہ تو ایک پسماندہ قوم کی سیاسی و معاشی جدوجہد کے نتیجے میں سامنے آئے تھے اور نہ ہی ان کی زندگی کا یہ خواب تھا۔۔۔ عوام ایک جابرانہ حکومت کو اپنا مقدر جان کر چپ ہوگئے تھے جس کی حیثیت کو کسی طرح بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔۔۔ میں ان خیالات سے الگ تھلگ، اپنے کام میں مگن ہوگیا۔

ایک روز فٹ پاتھ پر اپنا روایتی تھیلا اٹھائے بنگلہ دیش کے لئے فنڈ جمع کرنے نکلا۔ اس مہم میں خود نادار بنگالیوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ میرے تھیلے میں کچھ پٹیاں، ایک رسید بک، باسی روٹی کے ٹکڑے، بے بی ملک پوڈر، فیڈر اور پانی ...... یہ تھی میری کل کائنات۔

ایمپریس روڈ پر ایک کھمبے کے پاس کھڑے ہوکر، کینسر کے ایک مریض طالب علم کے لئے چندہ جمع کر رہا تھا تو پیشہ ور گداگر، مجھے دیکھتے ہی ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ بسوں اور کاروں میں سوار لوگوں نے مجھے پہچان لیا اور دیکھتے دیکھتے ایک ہجوم جمع ہوگیا۔ بلقیس میرے ساتھ تھی۔ تین دنوں میں اڑھائی لاکھ روپے اکٹھے ہوگئے۔ پہلے روز دوپہر تک تمام بھکاری مجھے اپنا رقیب جان کر کھسک گئے۔ بلقیس نے ان میں سے کسی کو کہتے ہوئے سنا ..... "آؤ کہیں اور چلیں کہ ہمارے ٹھکانے پر تو ایدھی نے قبضہ کرلیا ہے"۔۔۔ بلقیس نے ہنستے ہوئے انہیں جواب دیا ..... "بھائیو! تم بھی آن ملو کہ ہم، اس ملک کے سب سے بڑے گداگر ہیں"۔

ہر سال ٹیلیفون ڈائریکٹری سے پتے لے کر قریب قریب پچاس ہزار افراد کے نام "اپیل برائے زکوٰۃ" کے عنوان سے مراسلات روانہ کئے جاتے، اب یہ فریضہ، ہیڈ آفس کی ایک سینئر خاتون اہلکار کی نگرانی میں خواتین کے سپرد کر دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ لفافے کھلے رکھے جائیں، ورنہ ٹکٹ کا اضافی خرچ اٹھانا پڑے گا۔ لڑکیوں نے دن رات لگا کر کام تو کر دیا لیکن تمام لفافے بند کر دیئے۔ صاف مطلب یہ تھا کہ انہوں نے میری ہدایت کی پرواہ نہیں کی اور فاؤنڈیشن کو ہزاروں روپے کا زیربار کر دیا۔ غصے میں مجھے کہنا پڑا ۔۔ "یہ جرم کس نے کیا ہے؟ چالیس ہزار روپے کا نقصان کون پورا کرے گا؟" لڑکیوں سے پوچھا ۔۔ "تمہیں کس نے لفافے بند کرنے کو کہا تھا؟" تمام لڑکیوں نے بیک آواز کہا ۔۔ "بلقیس نے" یہ سن کر میرا غصہ دوچند ہوگیا۔

بلقیس رابعہ ماں کے گھر تھی۔ جاتے ہی آواز دی ۔۔ "بلقیس!" بوکھلاہٹ سے دوچار میری آواز سنتے ہی، وہ بے چادر و پاپوش دوڑتی باہر آئی ۔۔ "تم نے میرا سارا کام تباہ کر دیا۔ تمہاری ایک احمقانہ حرکت نے مجھے ہزاروں روپے کا مقروض کر دیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟" میرے کرخت لب و لہجے نے اسے پتھر کی طرح ساکت کر دیا۔ بلقیس کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ منت سماجت کرکے فوراً" میرے ساتھ چلی آئے اور اس واقعہ کی وضاحت علیحدگی میں کرے۔ میں وین میں بھی تپتے جا رہا تھا۔ شاید وہ دل ہی دل میں عافیت کی دعائیں مانگ رہی ہو۔

میٹھادر پہنچتے ہی بلقیس، لڑکیوں کی بازپرس کرنے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں نے اسے آواز دی ..... "بلقیس، کام درست کرائے بغیر واپس نہ آنا ورنہ تم سب کو اٹھا کر باہر پھینک دوں گا اور یہاں سے ہمیشہ کے لئے روانہ ہو جاؤں گا"۔ بلقیس کے پہنچنے سے پہلے ہی، لڑکیوں نے اس ساری صورت حال کا انتہائی احمقانہ تدارک یہ کیا کہ لفافے پر لگی گوند کو پانی سے گیلا کرکے تمام لفافے کھولنا شروع کر دیئے۔ جب انہوں نے بلقیس کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو چلا اٹھیں ..... "بلقیس! شکر ہے خدا کا کہ تم آگئی ہو۔ سچ پوچھو تو ہم نے ایدھی صاحب کے خوف سے گھبرا کر تمہارا نام لے دیا ورنہ ہمارا تو برا حال ہوتا۔ ہم اور کر بھی کیا سکتی تھیں"۔ بلقیس اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور لڑکیوں سے کہا کہ جو کرنا ہے جلد کرو ورنہ وہ ایک دم آدھمکیں گے۔

بلقیس کے زرخیز دماغ نے اس تمام صورتحال کا کچھ نہ کچھ حل نکال ہی لیا۔ لڑکیوں کو حکم دیا کہ سب قینچیاں لے آئیں، لیکن انتہائی تیزی کے ساتھ ـــ اگر وہ ہمارے سر پر آ کھڑے ہوئے تو کچھ نہیں کرنے دیں گے۔ بس جو کرنا ہے پلک جھپکنے میں کردو ... لڑکیوں کے ایک گروپ نے ہر لفافے کے اوپر والا حصہ کاٹ دیا اور دوسرے گروپ نے لفافہ سنبھال کر دیا۔ اس بکھیڑے میں آدھی رات ڈھل گئی۔ آخر کار...... بلقیس سہمی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ سیڑھیاں اتری اور اک تبسم شیریں کے ساتھ کہا ... "دیکھیئے ہم نے کام کر دیا ہے۔ اب ان پر ٹکٹوں کا خرچ نہیں اٹھے گا۔" پھر دھیمے لہجے میں کہا ... "پلیز آپ خفا نہ ہوا کریں، ہم نے اب تو مسئلہ حل کر دیا ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا"۔ میں نے بادل نخواستہ اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے کہا ... "ہاں ٹھیک ہے لیکن کام انتہائی گھٹیا اور معیار سے گرا ہوا ہے"۔ بعدازاں بلقیس نے مجھ سے شکایت کی ... "یہ کوئی آبرو مندانہ بات نہیں کہ لوگ ہمیں باہم الجھتے دیکھیں۔" میں نے اسے واضح طور پر کہہ دیا ... "اس بارے میں کچھ مت کہو۔ ردعمل، میرے اختیار میں نہ تھا"ـــ پھر مذاقاً" کہا ... "تمہیں یہ کہہ کر بے وقوف بنایا گیا کہ جنت تمہارے قدموں تلے ہوگی، میرا خیال ہے کہ دوزخ عورتوں سے بھرا ہوگا۔ بہشت، احمقوں کے لئے نہیں۔" شاید اس آس میں کہ وقت کے ساتھ اس حماقت کو فراموش کر دوں گا، اس نے مجھ سے اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کی۔ لیکن میں اس واقعہ کو کبھی نہ بھول سکا۔

بلقیس کے مشاغل میں یہ بات سرفہرست تھی کہ وہ گھنٹوں شہر کی بڑی بڑی مارکیٹوں کا، رکشہ میں سروے کرکے، کراچی کے تمام ایدھی سینٹروں کے لئے پھل، سبزیاں، گوشت اور مچھلی خرید کر لاتی۔ سودا خریدتے وقت عام گھریلو خواتین کی طرح، ایک ایک چیز کے بھاؤ پر دکانداروں سے جرح کرتی، دکاندار بھی قیمتوں میں اسے تھوڑی بہت چھوٹ دے دیتے اور کبھی کبھار اس کے خریدے ہوئے سامان کے ساتھ چند فری کریٹ بھی رکھ دیتے ـــ میں بھی کچھ مواقع پر اس کے ساتھ گیا۔ وہ اس قدر انہماک سے سودا خریدنے میں مگن ہو جاتی کہ میں اس میں کچھ بھی اضافہ نہ کرسکتا۔

بلقیس ہر ہفتے عشرے کے بعد، وین میں موسمی پھلوں کی وافر مقدار بھر کر لے جاتی اور ان قیدی خواتین، بچوں اور جوان لڑکوں میں تقسیم کرتی جو بے چینی سے امرودوں، آموں،

آلو بخاروں اور آڑوؤں کا انتظار کر رہے ہوتے۔ ایک مرتبہ بلقیس نے، اشیائے خوردونوش کی تقسیم کا فریضہ مجھے سونپ دیا۔ چھوٹتے ہی حادثہ یہ ہوا کہ میں نے قطار میں کھڑے بچوں میں سے ایک کو، باقیوں کے مقابلے میں ایک کو آم کم دے دیا۔ بلقیس نے یہ منظر دور سے دیکھا تو چلائی ... "انصاف کریں، انصاف ـــ" پھر کسی کو پانچ، کسی کو ایک ... دراصل ایسا کرکے انہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ بچے بڑے ہوکر، نصیبوں پر شاکر رہنے کی عادت سے مانوس ہو جائیں ـــ بلقیس واپس آتے ہوئے بہت خفا ہوئی کہ آئندہ وہ مجھے ساتھ نہیں لایا کرے گی۔ اس نے کہا ... "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے لوگ، بانٹ کر کھانے کے قائل نہیں۔ آپ نے شاید ان بچوں سے مذاق کیا۔" میں نے وضاحت کی ... "بلقیس، میرا اقدام مذاق نہ تھا بلکہ زمینی روایت پر عمل کیا گیا۔"

خوراک چاہے مقدار کی صورت ہو یا کوالٹی کے انداز میں، خدا کی دین ہے جو محروم انسانوں کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ پروردگار نے ایدھی فاؤنڈیشن کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اس سے وابستہ مساکین و غربا جس قدر چاہیں کھائیں۔ میں نے کھانے پینے کے معاملے میں کبھی بچت اور کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ جہاں تک دوسری نعمتوں کا تعلق ہے، وہ بھی خدا کی دین ہے جس کے لئے کوئی قید نہیں!!

1978ء کے دوران افغانستان میں جنگ کے باعث ان گنت مہاجرین، پشاور اور کراچی میں آبسے تھے ... بے پناہ بیرونی امداد کے باوجود، ان کی بے بسی و بے چارگی میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ سنا کہ ... امداد کا بیشتر حصہ، روایتی غاصبوں نے ہڑپ کرلیا۔ فاؤنڈیشن نے بہرحال، فرائض سنبھال لئے اور مناسب جگہوں پر، عارضی امدادی مراکز قائم کر دیئے۔ دریں اثناء، بلقیس کے تعاون سے ہماری گھریلو زندگی پرسکون رہی۔ تنہا ہوتا تو توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا۔

بلقیس کا معمول تھا کہ وہ ہر شام دو چار گھنٹے، رابعہ ماں کے پاس گزارتی۔ کام کاج کی مشقت، اسے نڈھال کر دیتی۔ وہ کئی کئی گھنٹے دہکتے سورج تلے، سبزیاں خرید کر ایدھی سینٹروں تک پہنچاتی اور اسی تسلسل میں، ذہنی مریضوں، معذوروں اور بیماروں کی دیکھ بھال بھی کرتی۔ ہنگامی حالات سے نبرد آزما رہنے اور نرسنگ سکول چلانے میں، اس کے اعصاب کمزور ہونے لگے۔ گھر میں جھاڑو سے لے کر بچوں کی پڑھائی تک، انہیں قرآن مجید پڑھانے

اور کبھی کبھی سکول سے فرار ہونے پر باز پرس تک سے وہ دو چار رہتی ۔۔ میرا یہ حال تھا کہ صرف چھٹی کے روز دوپہر کا کھانا بچوں کے ساتھ کھانے کا موقع ملتا۔ بچے میری موجودگی میں نہ شور کرتے' نہ ہی آپس میں جھگڑا فساد ۔۔ شاید اسی لئے ان پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ جتنی دیر بھی گھر میں رہتا' بلقیس اور بچے سوالوں پر سوال کرتے لیکن میں صرف نفی' اثبات میں جواب دیتا' خدا حافظ کہتے گھر سے نکل جاتا۔۔۔ یہی میرا معمول تھا۔

بلقیس چڑتی' خفا ہوتی اور شدید جھنجلاہٹ کا اظہار کرتی لیکن میرے ذہن میں یہی تھا کہ تعلیم سے رغبت اور لگاؤ' ان کے اندر ہی سے ابھرے گا۔ بے شک سرکاری تعلیمی اداروں کا معیار گھٹیا ہے تاہم اگر بچے اپنی خداداد صلاحیتیں بروئے کار لائیں گے تو اعلیٰ درسگاہوں میں جاکر تعلیم حاصل کرنے سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ میں نے ان کی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا ۔۔ "ہمارے بچے بے دست و پا' نہیں کہ وہ اپنی محنتوں سے' دنیا میں اپنے لئے کوئی جگہ نہ بنا سکیں۔ میں انہیں اپنے کاندھوں کا بوجھ نہیں بنانا چاہتا۔" بلقیس کا استدلال تھا کہ اچھے سکولوں میں جانے سے انہیں اعلیٰ معیار پانے کے مواقع تو مل سکیں گے۔۔۔ میں نے اتفاق نہ کرتے ہوئے سوال کر دیا ۔۔ "امراء کے بچے' اپنے والدین کی جانب سے مہیا کردہ بے پناہ سہولیات کے باوجود کیا حاصل کر لیتے ہیں۔ پڑھنے والے گلی کھمبوں کی مدہم روشنی میں بھی پڑھ کر زندگی کے اعلیٰ ترین مرتبوں تک جا پہنچتے ہیں ۔۔ وہ زمانے سے کیا کچھ نہیں سیکھ جاتے۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر نہیں چاہوں گا کہ ان پر جبر کروں۔ ہمارے بچوں کو اپنا منفرد طرز زندگی اختیار کرنا چاہیے۔"

ماضی میں جگہ کی قلت کے باعث ایسے ہزاروں لاوارث بچے' یتیم خانوں کے حوالے کئے گئے تھے جو جھاڑیوں' ڈھیروں اور درگاہوں پر پھینکے جانے کے باوجود' معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ تھیلے میں پڑا بے بی فیڈر اکثر اسی کام آتا ۔۔ اب میٹھادر کے میٹرنٹی یونٹ میں' ایسے بچوں کی نہ صرف باقاعدہ پرورش کی جاتی بلکہ دنیا بھر کے بے اولاد افراد انہیں سینے سے لگائے ہمیشہ کے لئے اپنے گھروں میں لے جاتے۔ ایسے کئی مردہ بچے بھی بے نام قبروں میں دفنائے گئے جنہیں' غربت اور رسوائی سے بچنے کے لئے بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا ۔۔ خیالات کے اس بے باکانہ اظہار پر' سیٹھوں کی طرح کٹھ ملا بھی لٹھ اٹھا کر میرے پیچھے پڑ گئے۔

جب ایک فتوے کے مطابق' مسجد کے سامنے ایک لاوارث بچے کو کھلے بندوں سنگسار کیا گیا تو میں اس ظلم پر تڑپ اٹھا۔ ایک نوزائیدہ بچے کو گنہگار کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ایک گمراہ سماج میں ایسے جرائم کا ارتکاب' انتہائی مایوس کن حالات میں کیا جاتا ہے۔

اس مرحلے پر' عملی طور پر کچھ کرنے کا خیال آیا اور میں نے ایدھی سینٹروں کے باہر جھولے رکھوا دیئے جن کے ساتھ یہ عام درخواست بھی مشتہر کر دی کہ۔۔۔ "دوسرے گناہ کے ارتکاب یعنی معصوم جان کو قتل کرنے سے پہلے' بچہ ہماری نگرانی میں دے دیجئے"۔۔۔ میرے اس اقدام پر مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے لاؤڈ سپیکروں پر فتویٰ صادر کر دیا ۔۔ "ایدھی کافر ہے' اسے عطیات نہ دو۔" جانتا تھا کہ کسی بھی حوالے سے' فتویٰ جاری کرنے کے مجاز تو صرف وہی علما ہوتے ہیں جو کبھی کسی لاوارث بچے کو پتھر مار کر ہلاک کرنے کے حق میں نہیں۔ میں نے علماء کے کسی بڑے گروہ سے رجوع کرنے کی بجائے' خاموشی کو غنیمت جانا اور سارا معاملہ پروردگار پر چھوڑ دیا کیونکہ ہر مصیبت میں وہی مددگار ہے۔

میرے دلائل سن کر بعض جہلا اور بھی بھڑک اٹھے اور یہ احمقانہ اعلان کیا کہ اس قسم کے بچوں کو گود لینا حرام ہے۔۔۔ میں نے ان پر سوال کیا کہ میں ان بچوں کو کہاں پھینکوں کیونکہ مذہب بھی ان سے روگردانی کرنے یا انہیں بے سہارا پھینک کر کیڑے مکوڑوں اور کتوں کی خوراک بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ خدا تو ہر زندگی ۔۔ کی قدر و منزلت کا حکم دیتا ہے۔ ہم کون ہیں کہ اسے قتل کر دیں جبکہ اس کے جسم میں' خدا نے خود روح پھونکی ہے۔

جب اس محاذ پر ناکام ہوئے تو لے پالک اولاد کی وراثت کا مسئلہ چھیڑ دیا۔۔۔ میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا ۔۔ "افسوس' تم لوگ جس قانون پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے ہو' وہ حقوق العباد کے خلاف اور انسان دشمنی پر مبنی ہے۔ وراثت کو بھول جائیں۔۔۔ آپ اپنی وافر دولت کا کچھ حصہ' ایسے بچوں کی پرورش کے لئے عطیہ تو کر سکتے ہیں۔ کیا اس کی بھی کہیں ممانعت ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کا سرچشمہ تو انسان دوستی ہے۔ افسوس ہوا کہ کچھ پڑھے لکھے افراد کے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

ستم یہ ہے کہ افراتفری کے اس عالم میں ملک کا وہ طبقہ جس کے پاس دولت کے بے پناہ وسائل ہیں' تمامتر آسائشوں کے باوجود' مغرب سے کچھ نہ سیکھ سکا۔ اسی فیصد مسائل کا

تعلق سماجی بہبود سے ہے لیکن عام لوگ' امراء کی ظاہری آن بان اور معاشرتی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور ممکنہ حد تک ان کی نقل کے لئے بھونڈے طریقے بھی استعمال کرتے ہیں تاہم جن عوامل کے باعث یورپ نے ترقی کی' اس کی نہ تو انہیں خبر ہے اور نہ ہی وہ اس بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔

سرمایہ دار تو محتاجوں کی ایک نسل پروان چڑھا رہے ہیں۔ انہیں خود اٹھ کر پانی کا گلاس پینا بھی عذاب نظر آتا ہے۔ والدین' اپنے بچوں کو قیمتی لفافوں میں لپیٹ کر' کبھی ایک اور کبھی دوسری باوقار درس گاہ میں پھراتے رہتے ہیں۔ ان دنوں یورپ میں بھی' ہمارے اونچے طبقات جیسے لوگوں کی کمی نہیں جہاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خیال سے عورتیں' اپنے خاوندوں کو کرپشن پر مجبور کر دیتی ہیں اور ان کے بچے' جوانی کی توانائیاں لے کر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اگرچہ میرے بچوں کو لاشوں کی بدبو سونگھنے اور انہیں اطمینان سے دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی لیکن ایک روز رونما ہونے والے واقعہ کے باعث' میرے سات سالہ بیٹے فیصل کو' ہیبت ناک حقیقت کا سامنا کرنا پڑا ..... ہنگامی اطلاع ملی کہ کراچی کے ایک بڑے پل کے نیچے پڑی' لاش میں سے عجیب و غریب بو آ رہی ہے۔ یہ سن کر فیصل اچھل پڑا۔ میں نے احتیاطاً" اسے وین سے اتر جانے کو کہا ..... لیکن وہ ضد کرکے ساتھ ہی چل پڑا۔

حادثے کی جگہ پہنچے تو تعفن سے ناک میں دم تھا۔ فیصل کا برا حال تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کی تاکید کی۔ پل کی ایک طرف سے کام کا آغاز کیا گیا جہاں کچھ لوگوں نے چادروں سے اپنے ناک ڈھانپ رکھے تھے۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ اس طرف جائیں ..... میں اور فیصل چل پڑے۔ جوں جوں آگے بڑھے' بدبو قریب تر اور ناقابل برداشت ہوتی چلی گئی---- میں گندے تالاب میں تیرتے ایک بورے کے قریب پہنچا اور جیب میں رکھے چاقو سے اس پر باندھی گئی رسیاں کاٹنا شروع کیں۔ فیصل بھی اپنی استطاعت کے مطابق کام میں مصروف تھا کہ اچانک کیڑے مکوڑوں سے گھری ایک مسخ شدہ انسانی لاش سامنے آئی ..... یہ ایک انتہائی ناقابل دید منظر تھا جو دیکھنے والوں کی روحوں تک کو' متعفن کر رہا تھا ..... فیصل نے جب یہ منظر دیکھا تو چیخ مار کر پیچھے مڑا ..... اور خوف سے اپنی ماں کو پکارنے لگا ..... میں نے بوری میں بند لاش کے اس بدبودار ڈھیر کو اٹھا کر ایمبولینس میں جا رکھا---- پولیس کو

اطلاع دی گئی اور لاش کو دفنا دیا گیا۔

فیصل اس ہولناک اور بھیانک منظر ..... کو دیکھنے کے بعد کم از کم بیس روز تک شدید بخار میں مبتلا رہا---- اس کی حالت یہ تھی کہ وہ سوتے سوتے ہڑبڑا کر اٹھتا اور پناہ کی آس میں اپنی ماں کے گلے لگ جاتا۔ وہ اس سے بار بار پوچھتی ..... "فیصل بیٹا' اپنی ماں کو بتاؤ' تم نے ابھی ابھی خواب میں کیا دیکھا ہے؟" لیکن فیصل کے پاس اتنی یاد یا قوت بیان کہاں تھی کہ وہ سوتے میں دیکھی گئی کسی چڑیل یا بدروح کا سراپا بتا سکے ..... بلقیس کو اس واقعے کا دکھ بھی تھا اور مجھ سے شدید گلہ بھی' کہ میں بچے کو ساتھ کیوں لے گیا ..... میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا ..... "ہمارے بعد' ان بچوں ہی نے یہ فرائض ادا کرنے ہوں گے۔ زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے' انہیں لٹریچر یا جیومیٹری پڑھنے کی بجائے' میدان عمل میں جا کے سیکھنا ہے۔ ایدھی فاؤنڈیشن کی بقا کسی طور بھی درسی یا کتابی علوم کی محتاج نہیں۔ جس راستے سے میں گزر رہا ہوں' اس کے کانٹوں سے میرے بچوں کو بھی آشنا ہونا چاہیے۔ انہیں روایتی سکولوں کے دھکے دلوا کر برباد نہیں کرنا چاہیے۔ بلقیس' کیا تم چاہو گی کہ بڑے ہوکر تمہاری اولاد' بابو یا منشی کہلائے؟" بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں بلقیس ابھی تک' میرے خیالات سے متفق نہیں تھی .....

اب فیصل نے خوف کے مارے مردہ خانے کے قریب آنا ترک کر دیا۔ وہ اکثر میٹھادر سے دور رہتا---- ڈوب کر مرجانے والی عورتوں کی میتیں' جب پھول کر دیوہیکل بن جاتیں تو بلقیس کے لئے تنہا انہیں غسل دینا بے حد مشکل ہو جاتا اور اسے مددگار خواتین کارکنوں کی ضرورت محسوس ہوتی۔ جل کر مرنے والی عورتیں کوئلے کا ایک ڈھیر بن جاتیں---- کٹے پھٹے وجود' سر الگ' دھڑ ایک طرف' کچلے ہوئے دست و بازو اور ریزہ ریزہ ٹانگیں ..... ایسے لگتا تھا کہ انہیں جانوروں کی طرح ذبح کر دیا گیا ہے ..... یہ سب کچھ روزانہ کا معمول تھا۔ ضروری تھا کہ جتنا جلد ہوسکے' انہیں دفنا دیا جائے اور میرے بچے ہولناک خواب سے بیدار ہو کر' جاگتی آنکھوں سے حقائق کو دیکھیں۔

ناک نقشے اور جسمانی اعتبار سے بڑا بیٹا قطب' میرے زیادہ قریب تھا ..... وہ بھی ہر بات کو جلد از جلد جاننے کے لئے بے تاب نظر آتا---- کسی مسئلہ پر جذباتی یا برہم ہوتا تو میری طرح ایک بات کو تین' تین مرتبہ دہراتا ..... وہ اپنے آپ میں رہنے اور محنت کرنے کا

عادی تھا۔ باقی بچے بھی ایسے ہی تھے۔۔۔ کوئی بھی مشقت سے جی نہ چراتا تھا۔۔۔ شکر ہے کہ ہمارے ہاں' کاہلی اور آرام طلبی کا دور دور تک کوئی تصور نہ تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے حالات کا تقابل' دوسروں سے نہیں کیا۔۔۔ البتہ زینت کبھی کبھار ہنسی مذاق میں خالہ سے کہتی ۔۔۔ "ہم نے تو اس گھر میں مریضوں اور لاشوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔"

بلقیس اپنی بیٹیوں کو ہر سال دو سوتی اور دو ریشمی جوڑے فراہم کیا کرتی تھی۔ تینوں' رابعہ ماں کے ہاں کھانا بنانے اور گھر کی صفائی ستھرائی پر مامور تھیں۔۔۔ صبح سویرے' سارا کام کاج کرکے' بھائیوں کو کھلا پلا کر اور دوپہر کے لئے ان کے ٹفن کیریر تیار کرکے میٹھادر روانہ کر دیتیں تو دوسری شفٹ میں پڑھنے "خالق دینا" گورنمنٹ سکول چلی جاتیں۔ شام ہوتی تو رابعہ ماں تازہ چپاتیاں بناتیں۔ پھر دن کے بچے ہوئے کھانے سمیت' سارے مل جل کر رات کا کھانا کھاتے۔۔۔ کوئی سہیلی انہیں ملنے آجاتی تو رابعہ ماں انہیں ایسی آنکھیں دکھاتیں کہ سہیلیاں چپکے سے کھسک جاتیں ۔۔۔

ایک مرتبہ ہماری بیٹی الماس نے پکاتے پکاتے کھانا جلا دیا۔ بلقیس نے اس کی پٹائی کر دی۔۔۔ میں نے وہی کھانا کھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "بلقیس' یہ کوئی اتنا بھی خراب نہیں۔ اب جیسا بھی پک گیا ہے' ہمیں اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔۔۔۔ اب تم میری بیٹی سے خفا نہ ہونا" ۔۔۔ لیکن بلقیس نے مجھے جھڑک دیا ۔۔۔ "آپ اس معاملے میں مداخلت نہ کریں۔۔۔ آپ کا کیا ہے' آپ تو ہر چیز' چاہے اچھی ہو یا بری' اسے کھا بھی سکتے ہیں اور کھا کر تعریف بھی کرسکتے ہیں۔ جب ان کی شادیاں ہوں گی تو مجھے یقین ہے کہ ان کے خاوند' میرے خاوند جیسے نہیں ہوں گے!"۔

1979ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔۔۔ بھٹو کیا گئے کہ ان کے ساتھ ایک عہد بھی چلا گیا۔ احتجاجا" خود سوزی کی مہم میں ہمارے رضا کار' جلے جسموں کی آگ بجھاتے رہے ۔۔۔ قریب قریب ہر آنکھ اشکبار تھی ۔۔۔ جب یہ سوال اٹھا کہ بھٹو کو دی جانے والی پھانسی کے خلاف امراء نے رد عمل کا کیوں اظہار نہ کیا جو بظاہر ان کے شیدائی تھے تو میں نے کہا ۔۔۔ "یہی لوگ تو ہیں جو سالہا سال سے جھوٹے وعدوں اور جذباتی نعروں کے ہاتھوں بے چارگی کی حالت میں بے سدھ اور خوف زدہ پڑے ہیں۔ کیا یہ وہی غریب لوگ نہیں' جنہیں احتجاجی جلسوں اور ریلیوں میں شامل ہونے کے لئے' بھیڑ بکریوں کی طرح

ہانک کر لے جایا گیا۔ آج ان کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ چپ چاپ اپنے حجروں میں واپس چلے جائیں اور ہونٹ سی لیں ۔۔۔ وقت ان سے خود ہی حساب لے لے گا۔"

جنرل ضیاء الحق نے سماجی بہبود کے کام میں میری کارکردگی کو قابل ستائش جانتے ہوئے سرکاری خزانے میں سے پانچ لاکھ روپے کا چیک بھجوایا جسے میں نے شکریئے کے ساتھ یہ الفاظ لکھ کر واپس کر دیا ۔۔۔ "آپ نے جس انداز میں عملی طور پر میری اور میری بیوی کے سماجی کاموں کی پذیرائی کی ہے' وہ میرے لئے باعث اطمینان ہے لیکن میں چونکہ لوگوں میں خیرات کا شعور اور اعتماد پیدا کرنا چاہتا ہوں' اس لئے کسی قسم کی سرکاری گرانٹ قبول کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ تاہم ایدھی فاؤنڈیشن اس یاد آوری پر آپ کی شکرگزار ہے۔" رقم واپس کر دی گئی۔

فاؤنڈیشن کو کئی بین الاقوامی سطح کے خیراتی اداروں نے بھاری عطیات دینے کی پیشکش کی۔ انہیں بھی معذرت کر دی گئی۔۔۔ ساتھیوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "انشاء اللہ یہ ادارہ' آج سے تیس برس بعد' تیسری دنیا کے غریب ملکوں کو امداد دینے کے قابل ہوسکے گا۔ اگر صحت اور تعلیم کی مدوں پر اٹھنے والے اخراجات کیلئے چار فیصد سرمایہ بھی مختص کر دیا گیا تو یہ اقدام اجر عظیم کا باعث بنے گا۔"

یہ تو خارجی سطح کے بڑے بڑے مسائل تھے جن سے ہم کسی نہ کسی طور پر نبرد آزما تھے ہی لیکن میرے غریب خانے پر' چھوٹے چھوٹے ایسے فتنوں نے سر اٹھا لیا تھا جن کا تدراک ضروری تھا۔۔۔ ننھے فیصل نے دو چار مرتبہ اپنی ماں سے فاؤنڈیشن کے بارے میں پوچھا ۔۔۔ "امی کیا یہ ہماری ہے۔۔۔؟" بلقیس نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا ۔۔۔ "نہیں فیصل بیٹا۔۔۔ فاؤنڈیشن کی اصل مالک ریاست ہے۔ ہم تو اسے محض چلانے میں معاونت کرتے ہیں۔" یہ حقیقت ہے کہ ایک سفید پوش علاقے میں رہائش اور گھرداری پر کم از کم اخراجات نے میری اولاد کو ہمیشہ اپنی حیثیت کے اندر رہنا سکھایا۔ زندگی کے سفر میں اس وقت ایک غیر متوقع موڑ آیا جب ہماری بیٹی کبریٰ نے زندگی کو اپنی پسند کے مطابق ڈھالنا چاہا اور آسائشوں کی طلب کی۔

میرا خیال تھا کہ بلقیس نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ جب بھی کوئی موقع ہوتا' وہ

اسے اعلیٰ سے اعلیٰ ملبوسات میں دیکھنا پسند کرتی اور خاص طور پر عید بقر عید پر وہ کوئی دلفریب لباس پہنتی تو بلقیس بڑے فخر سے کہتی ــــ "کبریٰ' تم کتنی اچھی لگ رہی ہو۔" دوسری جانب زینت اور الماس کا لباس عام طور پر واجبی سا ہوتا ـــــ

بلقیس اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھ کر ہنستی اور کہتی ــــ "اگر تم دونوں نے اپنا وزن کم نہ کیا تو تم سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔" یہ سن کر جب وہ روتیں' شور مچاتیں تو بلقیس انہیں مذاق ہی مذاق میں جھاڑ پلا کر چپ کرا دیتی۔

لڑکیوں کو کچھ ریز گاری یومیہ کے حساب سے سفری خرچ ملتا' جس پر ان کی سہیلیاں طنزیہ کہتیں کہ یہ تو ایدھی کی لڑکیاں نہیں ہیں۔ اس نے تو انہیں لے پالک بنا رکھا ہے ورنہ ایدھی جیسے معروف شخص کی بیٹیوں کو ویسا ہی ہونا چاہئے تھا ـــــ سکول میں ان سماجی طعنوں کے علاوہ صورتحال بھی کچھ ایسی تھی کہ باقی لڑکیاں تو معمول کے مطابق وہ سب کچھ کھاتیں' جو سکول میں برائے فروخت آتا لیکن کبریٰ' زینت اور الماس کے پاس وہی چند سکے ہوتے۔

بتایا گیا کہ کبریٰ اپنی سہیلیوں سے برابری چاہتی ہے اور اس نے الماس کو یہ کہہ کر بیوقوف بنایا ہے کہ وہ ماں باپ کے پاس جا کر اپنے حصے کا پیسہ مانگے' بازار چلے اور عید کارڈ خرید لائے ـــــ الماس نے خوف کے مارے ایسا کرنے سے انکار کیا اور کہا ــــ "ناں بابا میں تو نہیں جاتی۔ امی مجھے مارے گی ـــــ" اس پر کبریٰ نے گرجدار آواز میں کہا ــــ "دیکھو الماس! تم امی کی مار سے شاید بچ جاؤ لیکن میری مار سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا ـــــ" خوفزدہ الماس نے بہن کا کہا دل پر پتھر رکھ کر مان لیا۔

رابعہ ماں' جب بھی گھر سے باہر ہوتیں' کبریٰ باقاعدہ اپنی پڑوسن سہیلیوں کو گھر بلاتی لیکن الماس اور زینت' دونوں یہ سوچ کر الگ بیٹھ جاتیں کہ جو منظر وہ دیکھیں گی نہیں' اسے کاہے کو بتائیں گی ـــــ

الماس نے اپنی ماں کو بتایا ــــ "کبریٰ بہن' گھر کیلئے ایک باورچی اور ڈرائیور کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ کبریٰ کے خواب' ہمارے خیالوں سے بہت مختلف ہیں۔ ہم تو زندگی سے مطمئن ہیں' کبریٰ نہیں۔" زینت نے کہا ــــ "ہمیں اپنے اردگرد لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر اوپر دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا لیکن کبریٰ کی سہیلیاں' اسے اس خول سے باہر نکل کر کچھ اور

بھی دیکھنے پر اکساتی ہیں۔"

زینت نے بلقیس کو بتایا ــــ "کبریٰ سکول کے ماحول سے بہت متاثر ہے۔ وہ ہر کسی کی سنتی ہے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب اسے لڑکیاں کہتی ہیں ــــ "کبریٰ' اگر تم ایدھی کی حقیقی اولاد ہوتیں تو تمہارا عالم ہی کچھ اور ہوتا ـــــ تم ٹھاٹھ سے کار پر بیٹھ کر سکول آتیں اور تمہارے لباس کی چاروں طرف دھوم ہوتی۔" ایک مرتبہ تو اس نے ماں سے یہاں تک کہہ دیا ــــ "امی! میرے' اپنے اور گھر کے حالات تبدیل کر دیں۔" بلقیس نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ جب بڑے گھروں' بنگلوں پر برتھ ڈے تقریبات اور دیگر دعوتوں پر اسے جانے سے روکا جانے لگا تو روٹھ گئی اور اداس رہنے لگی۔ وہ ہمارے درویشانہ طرز حیات میں اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اسی لئے اپنی سہیلیوں کو گھر بلا کر' شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی ــــ یہ سب بچگانہ ذہن ہی تو تھے۔

میرے روبرو تو یہ سب کچھ کبھی نہ ہوا لیکن بلقیس کے تاثرات بتاتے تھے کہ کہیں نہ کہیں' کوئی دھواں سا ضرور اٹھتا ہے ـــــ میں جانتا تھا کہ اس ذمہ داری کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ہی ادا کر سکتے ہیں چنانچہ ہم نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ بلقیس نے کہا ــــ "ہماری بیٹی کبریٰ کے خیالات ہلکے پھلکے ہیں جبکہ آپ کی زندگی کا نصب العین اور عزائم' اس کی سمجھ بوجھ سے بالاتر ہیں۔" میں نے بلقیس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ــــ "پھر اسے باور کرایا جانا چاہئے کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے' وہ دولت یا کسی دنیاوی طاقت کا مرہون منت نہیں بلکہ وہ قربانی ہے جو میں نے غریبوں اور ناداروں کیلئے دی۔" بلقیس نے کہا ــــ "لیکن کبریٰ اور اس کی ہمجولیوں کے پاس یہ شعور کہاں کہ وہ آپ کے خیالات کو جان سکیں۔ وہ تو بس اتنا جانتی ہیں کہ آپ ان کے والد ہیں ـــــ"

بیٹی کا مسئلہ قابل فہم تھا لیکن اسے ایک ماں ہی حل کر سکتی تھی۔ میں نے بلقیس سے کہا کہ اس بارے میں وہ میرے نظریات پر سختی سے عمل کرے بھی اور کرائے بھی' جب تک کبریٰ باور نہیں کر لیتی کہ وہ ایک ایسے فقیر بے نوا کی بیٹی ہے جس نے زندگی بھر دوسروں کے لئے خیرات اکٹھی کی اور جس کی پوری زندگی' ایک کھلی کتاب ہے۔

بعض اوقات اداس ہو کر کہہ اٹھتا ــــ "بلقیس! پریشان ہوں کہ میرے جسم و روح کے انتہائی قریب' میری پیاری بیٹی' مجھے اپنی زندگی کی مثال کیوں نہیں بنا رہی۔ ایسی حالت میں

دور و نزدیک تک پھیلی ہوئی اپنی شہرت کے باوجود' اپنے مقاصد کو نامکمل محسوس نہ کروں تو کیا کروں---!"

بلقیس بھی اداس و پریشان تھی۔ وہ جوانی میں کبریٰ سے مختلف تھی کیونکہ کبریٰ کی پرورش اس جیسی نہیں ہوئی تھی۔ بلقیس نے جو کچھ مجھے بتایا' وہ اس کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھی ...... "وہ بڑا آدمی بننا چاہتی ہے۔ اسے قیمتی زیورات اور اعلیٰ ملبوسات پہننے کا شوق ہے۔ اسے ایک ایسے جیون ساتھی کی تمنا ہے جو مالی طور پر آسودہ ہو"۔ یہ سن کر میرا دل بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس شخص کیلئے یہ بات کتنے بڑے تضاد کی حامل ہے جس نے زندگی کی بنیاد' فقیری پر رکھی ہو۔ میں نے یہ سوچ کر موضوع سے فرار میں عافیت جانی۔ شاید کبریٰ کے پاس بھی' حالات سے سمجھوتہ کرلینے کے سوا کچھ نہ رہ گیا تھا۔

میں نے بلقیس سے کہا ...... "وہ جلد احساس کرلے گی کہ کبھی ہاتھ نہ آسکنے والے خواب بننا' سراسر وقت کی بربادی ہے۔" پھر کبریٰ سے کہتا ...... "کبریٰ' تمہیں مشکلات سے نباہ کرنا ہوگا۔ تمہاری زندگی' اک ایسا گورکھ دھندہ ہے جسے وقت اور حالات کے ساتھ تم خود ہی سلجھا لوگی۔"

اب گھر میں ایک اور ہی ڈرامہ شروع ہوچکا تھا۔ فیصل آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی سے اپنے بالوں کے طرح بہ طرح سٹائل بنانے لگا۔ وہ کمال انداز میں گھوم گھوم کر اپنے قدبت کا مشاہدہ کرتا اور پوز بنا کر خیالی روپ دیکھنے کی مشق کرتا رہتا۔ ان مناظر کا آنکھوں دیکھا حال' بلقیس نے بتایا۔ وہ خود بھی پریشان تھی۔ ...... "ڈرتی ہوں' فیصل کہیں فلمی ہیرو نہ بن جائے۔" ان الفاظ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تاہم یہ سوچ کر میں نے فیصل کے رویئے سے بے نیازانہ آنکھیں بند کرلیں کہ ...... کمسنی میں لڑکے ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ پختگی کی عمر تک پہنچے گا تو خود ہی سنبھل جائے گا۔

بچوں سے ہٹ کر' سماجی بہبود کے کام سے دلچسپی رکھنے والے رضاکاروں کو فاؤنڈیشن کے طریق کار کے مطابق زینہ بہ زینہ تربیت دے کر ماہر بنا دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں میرے ساتھی' پورے سسٹم کو انگلیوں پر گن کر بتا سکتے تھے۔ جن کارکنوں نے میرے ہمراہ قدم بہ قدم کام کیا تھا' سڑک کے کنارے کھڑے ہونے اور مردہ جانوروں کو اٹھانے میں کسی قسم کی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انتہائی مشکل حالات میں' پولیس بھی جب

تپتی ریت پر پاؤں دھرنے سے گریز کرتی تو فاؤنڈیشن کے کارکنان' ازخود دوڑے جاتے اور مسخ شدہ لاشیں' گٹروں اور گڑھوں سے اٹھا لاتے۔ اس طرح خدا ترس افراد کی ایک کھیپ سامنے آگئی' اس کے باوجود میرے ساتھ کام کرنا دشوار تھا۔ میری سخت مزاجی اور مزید بہتر کارکردگی کے مطالبے کے باعث کسی کا میرے ساتھ' دلجمعی اور ثابت قدمی سے چلتے رہنا' کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ تو صرف اسی صورت ممکن تھا کہ ہمسفر ساتھیوں کے عزائم پختہ اور اعصاب مضبوط ہوں اور میرے مشن سے متفق ہوں۔

میں نے کئی مواقع پر اعلان کیا کہ ایدھی فاؤنڈیشن قوم کی امانت ہے اور میرے کسی بچے کو کسی دوسرے ایدھی رضاکار پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ ادارے سے متعلق سب نے کھل کر بات کی۔ بعض اوقات میرے ساتھی حیران رہ جاتے کہ غریبوں اور ناداروں کے لئے تو میں ایک فقیر ہوں لیکن کارکنوں میں سخت گیر مشہور ہوں۔ ایسا کیوں؟ یوں سوچنے والوں کو جواب دیتے ہوئے کہا ...... "کسی ادارے کے سربراہ کے پیش نظر ہر ایک کا مفاد ہونا چاہیے۔ کسی تنظیم کو چلانے والا' بہتر نتائج کے لئے شور نہیں مچائے گا تو ادارے اور کارکنوں کی ترقی رک جائے گی۔ کارکنوں کو یہ تاثر ملے کہ کوئی بھی واقعہ' زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک یاد رکھا جاسکے گا تو غلطیوں پر غلطیاں شروع ہو جائیں گی۔ حکم صرف سنا جائے اور اس پر عملدر آمد نہ ہو تو نتیجہ صفر ہی نکلتا ہے۔"

اپنے خیالات کے ابلاغ کے لئے میٹھادر کی تمام اندرونی دیواروں کو گجراتی زبان سے بھر دیا۔ ان میں سے کچھ کی اہمیت' عبوری اور ہنگامی تھی جیسے اچانک رونما ہونے والی کوئی اطلاع۔ بیرون ملک سے آئے لوگوں کو ان تحریری ہدایات کا مطلب سمجھاتا۔ ریڈیو' ٹیلیویژن اور اخبارات تو تشہیر میں لگے ہی رہتے ہیں لیکن مجھے نیک مقصد کیلئے' دیواریں کالی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ایک تجربہ کار ڈاکٹر کسی مریض کیلئے لکھے گئے اپنے پہلے نسخے کو دیکھ کر نہ صرف ہنس دیتا ہے بلکہ اسے اپنی حماقت پر رونا بھی آتا ہے۔ ایسی ہی عبارات کا ایک جھنڈ دیواروں پر لکھا نظر آتا تھا۔ یہ خیالات بہت گہرے ہیں کیونکہ ان کا تعلق گلی محلے کے آدمی سے ہے' یہ بڑے دماغوں کے وہ نظریات نہیں جن پر کوئی شخص بھی عمل نہیں کرتا--- میں وہی کچھ کہتا ہوں جس پر انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر آسانی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔

ادارے میں ایک ایسے نظم و ضبط کی ضرورت تھی جو خوشامد' بیکار گفتگو اور گپ بازی کے رجحان پر قابو پاسکے۔ تمام رضاکار شاف کی اطلاع کیلئے ایدھی سنٹروں اور ایمبولینس گاڑیوں پر سادہ مگر واضح ہدایات لکھ کر چپکا دی گئیں۔ بعض اوقات جب کارکنوں کے ایک گروپ سے پوچھتا کہ کیا تمہیں دی گئی ہدایات یاد ہیں؟ تو جواب میں کئی آوازیں میری سماعت سے آٹکراتیں--- "حساب کتاب کی کتابوں کو صاف ستھرا رکھا جائے--- کوئی رضاکار اس وقت تک اپنی ڈیوٹی نہیں چھوڑے گا جب تک اس کا متبادل اس کی جگہ آنہیں جاتا--- دیر تک کام کرنے کی صورت میں اس کی ڈیوٹی کو' اضافی سمجھا جائے گا---" اتنے میں ایک اور جوشیلی صدا آتی ... "فون کال یا وائرلیس پیغام کی صورت' جواب میں اپنے سنٹر کا کون سا نمبر بتاؤ گے؟ عطیات کو اس وقت تک رجسٹر نہیں کیا جا سکتا جب تک فاؤنڈیشن کے طے شدہ اور واضح طور پر بتائے گئے اصولوں کے مطابق عطیہ وصول نہ کیا گیا ہو۔" دائیں طرف سے ایک ہاتھ اٹھتا ... "جناب یہ تو سارا یادداشت کا کھیل ہے۔" ایک اور آواز آتی ... "کام کے دوران ایک دوسرے سے فاصلے پر رہو۔ آپس میں بحث و تکرار سے گریز کرو--- وقت ضائع کرنے والے دوستوں کو کام کی حدود سے دور رکھو--- وہ شخص جسے ادارے سے نکالا جا چکا ہو' اسے اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دو--- سادگی توقیر بڑھاتی اور غربت کا مقابلہ کرتی ہے---" ایک کے بعد دوسری آواز ... "تمام ہدایات کو وقتاً" فوقتاً" جاری ہونے والے گشتی مراسلوں میں پڑھ لیا کرو--- ایدھی فاؤنڈیشن کی حدود میں مذہبی اور سیاسی مناظروں سے اجتناب برتا جائے---"

اس دوران' میرے اور عزیز کے درمیان نظریاتی اختلافات کچھ اس شدت سے رونما ہوئے کہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مزید رہ کر کام کرنا دشوار ہو گیا جس کے نتیجے میں ہم صلح صفائی کے ساتھ جدا ہو گئے اور ایدھی ٹرسٹ سے متعلق دستاویز کچھ ضروری ترامیم کے ساتھ مجھے دوبارہ لکھنا پڑی۔

1982ء میں جنرل ضیاء الحق نے ملک کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کے لیے مجلس شوریٰ (کابینہ) کا اعلان کیا۔ صدر ضیاء' اس پوزیشن میں نہ تھے کہ ماضی کی متنازعہ حیثیتوں کو پھر سے اصلی حالت میں لے آتے اور ان کا نفاذ بھی کر دیتے--- انہوں نے جب سماجی بہبود کی مد میں سے مجھے اپنی مجلس شوریٰ کی رکنیت کا اعزاز پیش کیا تو میں نے

اس باوقار پیشکش کو یہ کہتے ہوئے معذرت کے ساتھ مسترد کر دیا ... "ایک تو میرا روایتی سیاستدانوں کی کسی صف سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور دوسرے یہ کہ اپنے کام میں مگن رہنے والا آدمی ہوں۔ آپ کی موقر اسمبلی کے بڑے بڑے لوگ ایک فقیر کی بو کو اپنے قریب بیٹھے ہوئے کس طرح برداشت کریں گے---" لیکن ضیاء الحق نے بے حد اصرار کیا اور مجھ سے وعدہ بھی--- کہ وہ سماجی بہبود کے فروغ میں بھرپور تعاون کریں گے۔

1962ء کے دوران' بنیادی جمہوریت کی ممبر شپ کے تجربات سے مجھے حکومت اور عوام کے درمیان رکاوٹوں کا بخوبی علم ہو چکا تھا۔ حاکم و محکوم کے مابین یہ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ سماجی بہبود کے حوالے سے' اسے طے کرنا انتہائی مشکل تھا۔ 1970ء کے انتخابی معرکے کے دوران میرے مدمقابل امیدوار کے ساتھ' میمن برادری کے مضبوط اتحاد کے باوجود چند ووٹوں سے میری شکست ظاہر کرتی ہے کہ لوگوں نے سماجی بہبود کے تصور کو بیک قلم مسترد نہیں کیا تھا۔ اس دوران میں نے حکومت کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ کام کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مجھے یہ خوش گمانی بے وقوف تو نہ بنا سکی تاہم میں نے ضیاء کی مجلس شوریٰ میں شمولیت اختیار کر لی۔

میں ایک روز اپنے خرچ پر بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد جا پہنچا اور راولپنڈی کے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل میں قیام کیا' فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور راولپنڈی سے اسلام آباد تک بذریعہ بس سفر کر کے پہلے پارلیمانی اجلاس میں شرکت کی۔ جب میں پارلیمینٹ کی پرشکوہ عمارت کے افتتاحی دروازے پر آیا تو مجھے دیکھ کر کچھ فوجی افسران' پذیرائی کے لئے دوڑے چلے آئے--- آتے ہی ایک چاق و چوبند مہماندار کی طرح مجھ سے پوچھا ... "ایدھی صاحب! آپ کہاں تھے؟ ہم نے آپ کے قیام کا باقاعدہ انتظام کر رکھا تھا اور بے چینی سے آپ کے منتظر تھے۔" پھر انہوں نے مجھے ان خصوصی سہولیات و مراعات سے آگاہ کیا جن سے اراکین شوریٰ استفادہ کرتے ہیں--- "آپ کا مفت قیام و طعام' سب حکومت کی ذمہ داری ہے۔ آپ ہمیں اپنے آرام و آسائش کے مواقع دیں---" میں نے سوچا کہ یہاں مفت خوروں کے لئے--- ہر شے فری ہے--- میری عاجزی نے مجھے یہ کہنے کا حوصلہ دیا ... "جناب آپ کے اخلاق و آداب کا شکریہ ... میں زندگی بھر عیش و عشرت سے دور رہا ہوں ... دل میں اس کی کبھی تمنا بھی پیدا نہیں ہوئی ... حکومت پر کسی

قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔۔۔ جو کمرہ میری حیثیت کا تھا' اس میں قیام پذیر ہوں اور یہاں تک آمد و رفت کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ۔۔۔ بس ایک اچھا ذریعہ ہے۔ میں اکانومی کلاس کا ٹکٹ لے کر کراچی واپس بھی جا سکتا ہوں"۔۔۔ افسران مصر تھے کہ میں کسی اچھے ہوٹل یا ایم این اے ہوسٹل میں قیام کروں' کار پر سفر کروں۔ پسند ہو تو لمبی گاڑی ..... وہ کہنے لگے "ایدھی صاحب! مجلس شوریٰ کے ممبر کی حیثیت سے یہ سب کچھ آپ کا استحقاق ہے۔۔۔ چلئے زیادہ نہ سہی' کم از کم اسلام آباد کی حد تک تو ہماری مہمان نوازی کو قبول کیجئے کیونکہ یہاں آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

یہاں کے رویوں میں کرپشن کے جراثیم دکھائی دیئے۔۔۔ ممبران کی آؤ بھگت کے لئے جو۔۔۔ جادوئی قالینیں انہوں نے فرش راہ کی تھیں' انہوں نے تمام اراکین کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ لوگوں نے اپنے سینے چوڑے کر لئے تھے کہ جب یہاں سے واپس جائیں تو ان کا قد کاٹھ پہلے سے مختلف لگے۔ سرکاری حکام کے سامنے بات بات پر جھکنے اور کورنش بجا لانے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہمارا واسطہ ماضی کے اس نو آبادیاتی نظام کی باقیات۔۔۔ سے آن پڑا ہے جب برصغیر کے لوگوں نے اپنے انگریز آقاؤں کے سامنے اس قسم کا ذلت آمیز انداز اختیار کر رکھا تھا۔

وہ کمرہ جسے معزز ایوان کے نام سے پکارا جاتا تھا' منتظر تھا ایک ایسے شخص کا جو میٹھادر کی تنگ و تاریک گلیوں سے چلا تھا......میں ربڑ کے سلیپر پہنے ایوان میں داخل ہوا تو میرا سراپا کچھ یوں تھا کہ۔۔۔ کاندھے پر آویزاں کینوس کا ایک تھیلا' خاکی ملیشیا کا پاجامہ جس کا رنگ قمیص سے بھی زیادہ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔۔۔ چلتے وقت بلقیس کا مشورہ تھا کہ کم از کم پرانی قمیص تو بدل ڈالو۔۔۔ میں نے بلقیس کا کہا تو مان لیا لیکن یہاں پر اتنے سارے خوش پوش افراد کے اجتماع میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ممکن ہے کہ میرے نئے ساتھیوں میں سے کسی کو میری ظاہری حالت پسند نہ آئی ہو تاہم کسی نے بھی ایسا تاثر نہ دیا بلکہ کئی حضرات میرے ساتھ مصافحہ کرنے آئے اور مجھے عزت و تحسین سے نوازا۔۔۔ مجھے ایسا لگا کہ سب نے میری خدمات کا واشگاف اعتراف کیا ہے۔

خیالات و افکار کے اس جھمیلے کو الگ کرتے ہوئے میں نے ایوان حکومت کی اس بلند و بالا چھت کو دیکھا' انتہائی قیمتی چوبی کام سے منقش دیواروں پر نظر ڈالی' زمین سے کئی فٹ

اوپر بنائی گئی سپیکر کے لئے مخصوص نشست پر نگاہ کی اور ان دو چار میز کرسیوں کو دیکھا جو حکومتی اور حزب مخالف کے اراکین کیلئے کبھی مختص تھیں اور جن کی۔۔۔ اب کوئی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی۔۔۔ میں نے تیز تیز نگاہوں سے ادھر ادھر جھانک کر دیکھا کہ ممکن ہے' حکومتی منصوبوں سے متعلق کوئی کاغذی کام۔۔۔ ہو رہا ہو لیکن بے سود۔۔۔!

سارا دن' ملک سے وفاداری اور اپنی ذات سے ماوراء عوام کی خدمت گزاریوں سے متعلق وزیروں کی حلف برداریوں میں گزرا۔۔۔ آخرکار جنرل ضیاء الحق نے ایوان سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران اپنی بنائی گئی شوریٰ کے تحت' قوم کی خدمت کیلئے سب کی رضامندی کا شکریہ بھی ادا کیا۔۔۔ یہ سوچ کر میرا دم گھٹنے لگا۔۔۔ کہ میں نے تو محض ایک تجرباتی مرحلے سے گزرنے کیلئے اس پوزیشن کو قبول کیا تھا۔۔۔ ورنہ میں کہاں اور یہ جنجال کہاں۔۔۔!!

جنرل ضیاء کی تقریر سنتے ہوئے میں نے سوچا کہ کیا واقعی حالات تبدیل ہو چکے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر..... عزائم کیا ہیں۔۔۔؟

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ایک غیر حقیقی سطح تک ہی کر رہے ہیں جبکہ مسائل ان کی سوچ سے بھی زیادہ گہرے تھے۔ میں یہ جان کر حیران ہوتا جب مجھے ان کی باتوں میں کبھی کبھار خلوص بھی نظر آتا۔ شاید وہ پوری نیک نیتی اور سچے دل سے ملکی حالات کو سدھارنا چاہتے ہوں۔۔۔

زخم ایک مرتبہ کھل جائے تو ان گنت مسائل بہتے ہوئے بے قابو لہو کی طرح روگ بن جاتے ہیں۔ مرض کی بنیادی تشخیص کسی ماہر طبیب کا ہی کام ہے جبکہ علاج معالجے کے لئے بے حد و حساب ادویات اور مکمل صحت یابی وقت چاہتی ہے۔۔۔ جنرل ضیاء تقریر کر رہے تھے تو میرا ذہن سابقہ حکمرانوں کی طرف لوٹ گیا۔ تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے حوالے سے' کسی حکمران کے خیالات' مفادات سے ٹکرا کر غیر موثر ہو جاتے ہیں۔

ایوان سے باہر آ کر میں نے وزیر خزانہ سے کہا وہ ملک کہ جہاں ٹیکس چوری کی رقوم اور قومی بجٹ کے سرمائے میں کوئی فرق نہ ہو' وہاں انتہائی موثر اصلاحات کی ضرورت ہے۔ مغرب میں لوگ ٹیکس کو اپنی ڈھال۔۔۔ کے طور پر ادا کرتے ہیں کیونکہ سہولتوں کی شکل

میں' اس ادا شدہ ٹیکس کی واپسی کا یقین ہوتا ہے--- چونکہ ہمارے ہاں ایسا کوئی امکان نہیں' اسی لئے لوگ ٹیکس ادا نہیں کرتے۔

بعدازاں کام کاج کی زیادتی کی بناء پر اسلام آباد کے دو چار ہی چکر لگاسکا۔ میں نے حکومت کی جانب سے مقرر کردہ سیکرٹری کو صاف صاف بتا دیا کہ میں نہ تو کسی تقریب رونمائی میں جاؤں گا' نہ ربن کاٹوں گا اور نہ ہی کسی قسم کی تقریبات میں شرکت کروں گا۔ سیکرٹری کو حکم ملا تھا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ رہے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے کسی قسم کے رسمی آداب کی ضرورت نہ تھی--- میں کھلی کتاب ہوں' جو چاہے مجھے پڑھ سکتا ہے۔ مجھ جیسے شخص کے حالات میں' نوکروں چاکروں اور نائب قاصدوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں سرکاری ملازم نہیں۔ میں تو اپنے انداز کی ایک زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے کوئی دعوت نامہ نہ بھیجا جائے۔ میں اپنی حیثیت کے سوا' کسی دوسرے حوالے سے کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔

میں تو آج تک کسی دوست کو بھی اپنے گھر نہیں لے گیا۔ لوگوں کی مشکلات کا ایک ہی حل ہے کہ وہ سادہ کھائیں' سادہ پہنیں اور کام کریں--- میں نے ان الفاظ کے ساتھ اسے کہا کہ ..... "اب تم سے اگلی ملاقات اسلام آباد میں ہوگی۔"

میرے ان رویوں کا سامنا تو میرے مخالف گروپوں کے لئے بھی دشوار تھا جنہوں نے میری کل وقتی مخالفت کو قابل عمل نہ سمجھتے ہوئے آخرکار ترک کر دیا۔ لوگ جب گہری نیند سو رہے ہوتے' میں کام کاج میں سرگرداں رہتا۔

صدقات و خیرات کے حوالے سے منعقدہ ایک تقریب میں جب میں نے کہا کہ خدا نے مسلمان حکمرانوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ صاحبان استطاعت سے زکواۃ طلب کریں۔ میرے نزدیک زکواۃ غریب آدمی کا ٹیکس ہے لہٰذا اس کی وصولی بطور جہاد ہونی چاہئے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ حاضرین میں ایک شخص نے فخریہ انداز میں ایدھی فاؤنڈیشن کو پانچ لاکھ روپے کے عطیے کا اعلان کر دیا۔ اس نے جس تمکنت سے اعلان کیا' مجھے وہ سیٹھ لوگ یاد آگئے جو نمائشی حوالے سے انہی ڈراموں کے ماہر تھے لہٰذا میں نے اس کی پیشکش مسترد کر دی--- کچھ دنوں کے بعد اس شخص نے بذریعہ ڈاک چیک بھیج دیا' میں نے اسے ایک طرف رکھتے ہوئے ساتھیوں سے کہا ..... "بہت جلد یہ شخص اس چیک کی واپسی کا مطالبہ' اس معذرت

کے ساتھ کرے گا کہ یہ سب کچھ تو محض نمائشی تھا۔" پورے ایک ماہ بعد اس نے وہی کیا جو اتفاق سے میں نے کہا تھا--- حیرت ہے کہ جب میں اس کا ارسال کردہ چیک لفافے میں بند کر کے واپس کرنے کو تھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ چل بسا ہے۔

افغان جہاد کی آڑ میں' نہ صرف یہ کہ ملک بھر میں مہلک ہتھیاروں کی بھرمار ہوئی بلکہ اس کی وجہ سے ہیروئن جیسے بدنام زمانہ کاروبار کو بھی فروغ ملا جس نے زندگی سے بیزار لوگوں اور غربت کے ہاتھوں ناچار افراد کو وقت سے پہلے' موت کی وادی میں دھکیلنے کا اہتمام کیا۔ مغربی ممالک نے زندگی کی قاتل اس علت کو ختم کرنے کیلئے اربوں کھربوں روپے خرچ کر ڈالے لیکن نتیجہ صفر رہا۔ میں نے رضاکاروں کو اس مصیبت عظمیٰ سے جنگ کرنے کا طریق کار بتایا جو دل سے اس مہم میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے کہا ۔ "پہلا موثر اور کارگر علاج یہ ہے کہ نشے کے عادی افراد کی قوت ارادی کو مستحکم کیا جائے' اس کے سوا بہتری کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ اس وقت تک یہ سب بیکار ہے جب تک ہم ان لوگوں کو' اچھے مستقبل کی نوید نہیں دیں گے۔"

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ سعودی عرب' ملائشیا اور سنگاپور کی طرز کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے منشیات کی ترسیل کے تمام ممکنہ راستے بند ہو سکتے ہوں ۔ یا پھر سیدھی گولی--- اور جرم کی صورت میں سزائے موت کا خوف---!

ہزاروں کی تعداد میں نشے کے عادی افراد کو علاج معالجے کے بعد آزاد کر دیا گیا تھا لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ہمارے پاس اپنی سابقہ قابل رحم حالت میں بار بار آنا شروع ہوگئے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ فکر معاش کا بوجھ سہارنے لگے--- ان میں سے کئی ایک تو معاشرے کے معزز لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ باقی نفسیاتی بیمار تھے اور کوشش کے باوجود اپنے مسائل حل نہیں کرپا رہے تھے--- یا پھر ان کے ماضی میں رونما ہونے والا کوئی سماجی المیہ انہیں سنبھلنے نہیں دے رہا تھا۔

انسداد منشیات کے ایک اہلکار سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ۔ "جب نشہ آور ادویات جگہ جگہ دستیاب ہوں تو ان کے استعمال پر پابندی' قطعی طور پر غیرموثر اور بے معنی ہے۔ اسے تو جتنا روکیں گے' یہ اور پیدا ہوگی۔ کوئی قانونی قدغن' اس زہریلے ناگ کا راستہ نہیں روک سکتی۔ صرف شعور کی بیداری ہی اس کا تریاق ہے۔ بے پرواہ لوگ' پابندیوں

کے باوجود' اس حیات سوز نشے کا پتہ لگا ہی لیتے ہیں۔"

فاؤنڈیشن سٹاف' کچھ ایسے پرجوش کارکنوں پر مشتمل ہے جو ادارے کے تمام ذیلی دفاتر کے لئے میرے تجویز کردہ طریقوں کو سرعت کے ساتھ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ان لوگوں نے آبادکاری اور بحالی کے کاموں میں بے حد گرمجوشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی شبانہ روز محنت نے ایدھی فاؤنڈیشن کو توانا کر دیا۔ اس کے اثرات لحہ بہ لحہ بیداری کی صورت میں نظر آنے لگے۔ انہوں نے ذاتی مفادات پر انسانی خدمت کے فروغ کو ترجیح دے کر مجھے بھی سرخرو کیا۔ آج ہزاروں افراد' انہی خطوط پر چل کر ناداروں' بیکسوں اور زندگی کی آسائشوں سے محروم لوگوں کی مدد کر رہے ہیں---- میں جب انہیں پوری تندہی کے ساتھ خوش دلانہ کام کرتے ہوئے دیکھتاہوں تو شکر بجا لاتا ہوں کہ مجھے میری محنتوں کا ثمراور اجر' دونوں مل گئے ہیں۔ ان احساسات کا اظہار بلقیس کے سامنے بھی کیا ..... "ان لوگوں کی لگن کے پس منظر میں ہمیں ایک عظیم سبق ملتا ہے---- زمانہ ہوا جب گلیوں محلوں میں لوگ مجھے گالیاں دیتے تھے اور میں سیٹھوں کی معاشرتی عداوتوں کے سامنے تنہا کھڑا تھا---- آج یہی لوگ سماجی خدمت کے راستے پر میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ بلقیس! تم نے دیکھا کہ ایماندارانہ کارکردگی نے خیرات کے تصور کو کتنا بلند کر دیا ہے۔"

فاؤنڈیشن سٹاف نے میرے' بلقیس اور تنظیم کے ساتھ ہمیشہ وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ کارکنوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہو جاتا تو مجھے اس کی باقاعدہ اطلاع دی جاتی---- میں اس قسم کی لڑائیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ دنگا فساد کرنے والے کارکنوں کو میں نے صاف کہہ دیا ..... "اس جدال میں ادارے کو نہ گھسیٹا کرو۔ خود اچھے برے کی تمیز کرنا سیکھو۔ اس مسئلے کو یہیں فوراً ٹھپ ہو جانا چاہئے کہ مزید تکرار سے کام میں حرج ہوتا ہے۔"

جب بھی فراغت نصیب ہوتی' میں اپنے ساتھیوں کو درپیش حالات کی سنگینی کے متعلق بتاتا رہتا ..... "آج غریبوں کو غیرشعوری طور پر انتہائی بے دردی کے ساتھ سینما بینی' چائے اور سگریٹ نوشی جیسی فضول خرچیوں کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ویڈیو کیسٹ کا کرایہ بڑھ گیا ہے تو اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نہ فلم دیکھیں' نہ زیر بار ہوں۔ بے جا خواہشات کا تعاقب نہ کیا جائے تو افراط زر اور مہنگائی پر قابو پانا چنداں دشوار نہیں۔"

ہمارے خاندان میں' شادی کے ایک پروگرام سے میری وہ یادیں لوٹ آئیں جنہوں

نے مجھے پہلے ہی افسردہ کر رکھا تھا۔ اب جو رشتہ آیا' وہ زینت کے لئے تھا اور بلقیس نے مجھے زور دے کر کہا کہ میں لڑکے والوں سے جا کر مل لوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا---- "وہ اگر' اپنے بیٹے کی شادی زینت سے کرنا چاہتے ہیں تو انہیں میں کاہے کو ملوں؟" بلقیس نے ازراہ مذاق مگر شیریں لب و لہجے میں لڑکے والوں سے کہا ..... "میرے شوہر بہت مصروف آدمی ہیں۔ مہربانی کر کے آج ان کی غیرحاضری محسوس نہ کریں۔ وہ ایسا کسی گھمنڈ سے نہیں کررہے' ان کے پاس تو زیادہ وقت دوسروں کے لئے ہی ہوتا ہے۔"

میں جس قدر جیب خرچ زینت کو دیتا رہا' وہ اس نے چھپا کر رکھے۔ آج وہی بچت' اس کے کام آگئی۔ رابعہ ماں اور خالہ نے مل کر زینت کا لباس عروسی تیار کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ لباس تیار کرکے پہلے ہی سسرال والوں کے ہاں بھیجا جاچکا ہے۔

جس روز شادی تھی' صبح ہی صبح میں نے اپنے لئے روٹی لپیٹی' اسے پلاسٹک کے سفری تھیلے میں ڈال کر کاندھے پر لٹکایا اور چلنے لگا۔ جانے سے پہلے میں نے بلقیس سے ہنستے ہوئے کہا ..... "بلقیس' شاید تم سمجھتی ہو کہ میں اس تقریب سے فرار کا کوئی بہانہ تلاش کرنے جا رہا ہوں---- مسئلہ یہ ہے کہ میں تو دوسرے گھرانوں کی شادیوں میں بھی اس قسم کے ہنگامے' شور اور ناچ تماشے کو بلاجواز سمجھتا ہوں' چہ جائیکہ یہ اپنے گھر میں ہو۔ روایتی شادیاں' قبیلے برادری کے سامنے محض جھوٹی اور کھوکھلی شان و شوکت کے اظہار کا نام ہے۔ زینت کے لئے بھی یہی بہتر ہوگا کہ وہ سادگی سے پیا گھر سدھار جائے۔ ہم لوگ گانے بجانے اور پیسہ برباد کرنے کے مشاغل بھلا کیوں کریں۔"

بلقیس نے جواب میں نشاط و غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا ..... "میں آپ کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے سے باز آئی۔ اب میرا کم از کم مطالبہ یہ ہے کہ آپ مہربانی فرما کر صرف آج کیلئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ ہم روئیں یا گائیں' یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے---- ہمارا اپنا درد سر---- ان تمام باتوں سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں---- پلیز' جس طرح ہم آپ کے کاموں میں دخل نہیں دیتے' آج آپ بھی نہ دیں۔"

میں نے زینت کو سرخ اور درخشاں لباس میں دیکھنے کیلئے محض ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور تیزی کے ساتھ ایمبولینس چلاتا ہوا گھر سے غائب ہوگیا۔ میں نے اپنی شادی پر بھی ایسے ہی کیا تھا---- دوسرے روز جب واپس لوٹا تو ہر چیز نارمل تھی---- وہی خاموشی اور وہی



عبدالستار ایدھی ..... دکھی انسانیت، معذور بچوں کی محبت کے گھیرے میں

اداسی!!

زینت کی رخصتی کے کچھ عرصہ بعد، ہم نے خالہ کے بیٹے اور زینت کے بھائی الطاف سے کبریٰ کی نسبت طے کردی۔ اتفاق رائے سے طے پایا کہ رخصتی تین برس کے بعد ہوگی--- فیصلے کے بعد، بلقیس نے کبریٰ کو یقین دلاتے ہوئے کہا ــ "بیٹی غم نہ کرو، لڑکا اچھا ہے، تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ وہ ہم میں سے ہے، تمہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی۔" کبریٰ اس دوران چپ سادھے بیٹھی رہی--- الطاف ایک بینک میں ملازم تھا۔ کبریٰ نے ہماری خواہشات پر سر تسلیم خم کرلیا تھا۔ بلقیس نے مجھے اطمینان دلایا ــ "بے شک کبریٰ، الطاف کو قابل فخر نہیں سمجھتی لیکن وقت کے ساتھ، وہ اس سے نباہ کرنا سیکھ جائے گی--- ایسا ہی ہوتا ہے!"

میں نے دعا کی ــ "پروردگار، میری بچی کی زندگی پر آنے والے لمحوں کو آسان کر دے۔" لیکن میرے دل کی کسک نے مجھے اندر ہی اندر جتلا دیا تھا کہ--- ایدھی، ایسا نہیں ہوگا..... میری قمیض پر پڑے بوسیدہ داغ بھی یہی عندیہ دے رہے تھے۔

باب ہشتم

خون آلود قمیض

1982ء میں انڈونیشیا کے صدر سوہارتو کراچی آ رہے تھے، مجھے ان کے استقبال کی دعوت موصول ہوئی۔ مجھے اچنبھا سا ہوا۔ بلقیس سے بات ہوئی تو اس نے کہا ...... "ممکن ہے، انڈونیشیا کے صدر نے آپ کے کام کی بابت سن رکھا ہو اور وہ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہوں۔ جانے میں کیا حرج ہے؟"

بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر، ٹھیک وقت پر ائیرپورٹ پہنچ گیا۔ سکیورٹی افسر نے دعوت نامے کا جائزہ لینے کے بعد، وی آئی پی انکلوژر تک میری راہنمائی کی۔ سب لوگ منتظر تھے، میں بھی مصافحہ کرتے ہوئے ان میں گھل مل گیا۔ صدر سوہارتو کا جہاز بخیر و خوبی اترا۔ میزبان، رن وے کی طرف چل دیے۔ رسمی آداب کے مطابق ہم سرخ قالین کی اطراف میں متوازی قطاروں کی صورت، اپنی اپنی جگہ پر مودبانہ کھڑے ہوگئے۔ قالین، جہاز سے ڈائس تک بچھا ہوا تھا۔ انڈونیشیا اور پاکستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔

نصف گھنٹے کے انتظار نے مجھے بے چین کر دیا اور سوچا کہ --- یہاں کیا کر رہا ہوں! یہ سب کچھ، وقت کا زیاں محسوس ہونے لگا۔ مہمانوں کے لئے میرے دل میں عزت کی کمی نہیں تھی لیکن ان کی خاطرمدارات یا استقبال کیا میرا کام تھا؟

اس بے چینی و بیزاری میں میری توجہ ڈائس کے کونے پر کھڑے چند پروٹوکول افسروں کی جانب گئی۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے، سر کھجاتے اور گال سہلاتے، جیسے کوئی مسئلہ حل کرنا چاہ رہے ہوں۔ ان میں سے ایک آنکھ بچا کر مجھے دیکھنے لگا، دوسرے نے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں کہا ...... "ایدھی صاحب! میں آپ سے جو کچھ کہنے والا ہوں، اس کے لئے پیشگی معافی کا خواستگار ہوں--- پروٹوکول کے ایسے مواقع پر، لباس کا خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کو یا تو یہ لباس تبدیل کرنا پڑے گا یا پھر---" وہ یہ کہہ کر ندامت سے، زمین کو دیکھنے لگا--- "معاف کیجئے جناب، دوسری صورت میں آپ کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ میں معذرت طلب ہوں۔"

اس وقت تک میں نے خود کو مختلف محسوس نہ کیا تھا۔ اچانک پتہ چلا کہ واقعی ایسا



"بچوں کے خواب"

لاوارث نوزائیدہ بچے، ایدھی کی نرسوں کی آغوش شفقت میں

ہے۔ میری آنکھیں فرش پر دور تک سیاہ چمکتے ہوئے جوتوں پر جا پڑیں جو سرخ قالین پر ہیرے جواہرات کی طرح جڑے دکھائی دے رہے تھے۔ سوٹ' ٹائی' واسکٹ--- یہ چیزیں ایک بھرپور منظر کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

ہوائی اڈے سے سرکاری مہمان خانے تک جانے والے تمام راستوں کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا کہ غیرملکی اس ظاہری آن بان کے فریب نظر میں رہ کر پاکستان کے باطنی حالات سے آگاہ نہ ہو جائیں اور جب واپس جائیں تو اس ملک کے ناداروں' محنت کشوں اور غریبوں کی حالت زار سے بے خبر' پاکستان کی خوشحالی کے گیت گائیں۔

میں دیکھنے والی ہر آنکھ کے لئے ایک زخم تھا اور مجھ جیسے فقیر کی موجودگی' نام نہاد خوشحالی کے اس مظاہرے کی نفی کر رہی تھی--- یہ ایک کھوکھلی حقیقت تھی۔

اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا' تمام خیالات چند لمحوں میں بیت گئے۔ میں نے کہا ... "کیا حکومت کو مدعو کرنے سے پہلے میری ظاہری حالت کا علم نہ تھا؟ یا یہ اتنا اہم موقع تھا کہ اس کے لئے نئے کپڑے سلواتا۔" میرا جواب پا کر افسر مہمانداری تذبذب کی کیفیت سے دوچار لوٹ گیا مگر کچھ ہی دیر بعد ایک اور بڑے آفیسر کے ہمراہ دوبارہ آیا اور کہا ... "ایدھی صاحب! میں معذرت خواہ ہوں لیکن پروٹوکول کے ضابطے بہرصورت پورے کرنا ہوں گے۔ قانون کا خیال کسی کا ذاتی مسئلہ نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہمارے ساتھ باہر چلئے۔ انڈونیشیا کے صدر جہاز سے بس اترنے ہی والے ہیں۔"

میں نے امیرکبیر اور خوش پوش لوگوں کی قطاریں دیکھتے ہوئے سوچا کہ ان کے مقابلے میں میری حیثیت کیا ہے؟ جو لوگ اس ڈرامائی صورتحال کو دیکھ رہے تھے' انہیں جتلانے کے لئے میں نے وہاں سے نہ جانے کا اعلان کرتے ہوئے کہا ... "یہ معاملہ اسی وقت طے پا گیا تھا جب آپ نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔" ڈیوٹی پر مامور افسران نے ایک دوسرے کو بے چارگی سے دیکھا اور مزید صلاح مشورے کے لئے چلے گئے جبکہ قطاروں میں کھڑے لوگ خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

جو مسئلہ پریشانی کا باعث بنا' اس کی نوعیت علامتی تھی کیونکہ محنت کرنے والی خاموش اکثریت کی یہاں کوئی نمائندگی نہ تھی جس کی میں ایک زندہ مثال تھا۔ تیس برسوں پر محیط ان تھک اور شب و روز کام کرنے کے بعد بھی میری یہ حیثیت نہ تھی کہ میں ان لوگوں کی

صف میں کھڑا ہونے کے قابل ہو سکتا' جن کا منصبی کام سونے' کھانے اور لوٹ کھسوٹ کے سوا نہ تھا--- افسران واپس آئے تو میں نے سر بلند کر لیا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتے' میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ یہیں رکوں گا۔

سارے ہموطن' میرے دل میں بستے تھے۔ خستہ حال محنت کش کے ہاتھ' ربڑ کے سلیپروں میں بھدے پاؤں' بوسیدہ لباس اور کینوس کا تھیلا جس میں رسید بکیں' ٹوکن اور پنیاں تھیں' یہ سب کچھ کسی ہتک کے قابل تو نہ تھا--- کچھ تکلیف دہ لمحات کے بعد' چند لوگ میری دلجوئی کرنے آئے اور بحالت مجبوری باور کرایا کہ یہاں میری موجودگی ضروری اور قابل فخر ہے۔

بلقیس کو اس واقعے کے بارے میں بتاتے ہوئے جب میں نے امیر و غریب کے مابین حد فاصل پر احتجاج کیا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا ... "آپ کو یہاں بھی وہی قمیض پہن کر جانا چاہیے تھا جو آپ نے ایوان شوریٰ میں جاتے ہوئے پہنی تھی۔ اس کا ضرور اثر ہوتا--- جب تو کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔" میں نے اسے استقبال کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا ... "بلقیس! جگمگاتے جوتوں میں وہ امیر لوگ یوں بندھے کھڑے تھے کہ ان میں ایک قدم بھی آگے پیچھے کرنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے سوچا کہ یہاں تو میرا وقت ضائع ہوا۔" میں نے اسی شام اعلیٰ سرکاری حکام کے نام خط لکھا جس میں آئندہ کوئی بھی سرکاری دعوت قبول کرنے سے پیشگی معذرت کر لی۔

شوریٰ کے تین ہی اجلاسوں میں شرکت کے باعث میرا سکون چھن گیا۔ عملی زندگی میں کام کرتے ہوئے بھی میں مستقل طور پر اس پریشانی کے متعلق سوچتا رہتا جو اسلام آباد کی آمدورفت نے مجھ پر طاری کر رکھی تھی۔ اس قدر مایوس' اداس اور شکستہ دل رہنے لگا تھا کہ ساتھیوں نے میری صحت کے بارے میں فکرمندی سے پوچھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ صورتحال کی وضاحت کرنا پڑی ... "حکومت کچھ بھی نہیں کرتی--- ہر رکن اپنی جعلی کارگزاری کی تازہ بتازہ نذر نیاز ڈالنے آتا ہے اور دعائیں دے کر چلا جاتا ہے--- تمام وقت' تعریف کے لئے لچھے دار الفاظ کے چناؤ اور خوشامد کی دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں گزر جاتا ہے۔ کسی بے معنی بات پر جب ڈیسک بجائے جاتے ہیں تو مستقبل میں قوم کے ذہنی افلاس کا ایک ایسا ڈھانچہ بنتا دکھائی دیتا ہے جس کا تصور

ہولناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔۔۔!"

صورت حال سے گھبرا کر میں نے لبنان کا ویزا حاصل کر لیا۔ احباب نے اس خطرناک علاقے میں جانے سے منع کیا لیکن ٹکٹ کنفرم کرنے، بلقیس کے ہمراہ ایئرپورٹ پہنچا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ایک افسر نے انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ ایک چپڑاسی نے پہچان کر اصرار کیا کہ میں اس کے صاحب کے دفتر چلوں۔ اس پر خلوص پیشکش سے معذرت کرتے ہوئے کہا ـــ "بھائی میں کوئی وی آئی پی نہیں اور نہ ہی مجھے کسی کا احسان لینا ہے۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔" لیکن وہ شخص بھاگم بھاگ اپنے افسر کو خبر کرنے دوڑا جو کچھ ہی دیر میں وہاں آن پہنچا، میرا ٹکٹ بنوایا اور زحمت انتظار کی معذرت چاہی۔

وہ وقت بھی یاد آیا جب میں نے فرانس کے ویزے کے حصول کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے میرے بینک بیلنس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے انہیں بتایا ـــ "ایک گداگر کے پاس سرمایہ کہاں۔۔؟ میں تو اعلانیہ فقیر ہوں ـــ میرے پاس کوئی دولت نہیں۔" انہوں نے ہمیں عمارت کے باہر انتظار کرنے کو کہا جہاں میں اور بلقیس فٹ پاتھ پر بیٹھ کر، دنیاوی رویوں پر گفتگو کرتے رہے۔ بیروت جاتے ہوئے دوبئ رکا، اپنی کرنسی ڈالروں میں تبدیل کرائی اور دمشق جانے والی پرواز سے پہلے کچھ عطیات اکٹھے کئے۔ دستیاب نقدی کے علاوہ میرا زادراہ ایک چادر، کپڑوں کے ایک جوڑے، سفری کاغذات، فیڈر، پنیوں اور کینوس کے تھیلے میں پڑی روٹی پر مشتمل تھا۔ سکیورٹی سے ہوتا ہوا باہر آگیا اور بیروت جانے والی بس تلاش کرنے لگا لیکن بے سود۔۔۔ آخرکار، ہم چار مسافروں نے مل کر ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

دمشق سے نصف گھنٹے کی مسافت پر روکا گیا اور ہمارے کاغذات پر مہر لگائی گئی۔ پھر چل پڑے، تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ایک اسرائیلی چیک پوسٹ پر ہمارے کاغذات کی سخت پڑتال کی گئی۔ مجھ سے شناختی کارڈ طلب کیا گیا لیکن میرے پاس تو پاسپورٹ پر ثبت ویزے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہودی افسروں نے مجھے گاڑی سے اترنے کو کہا اور ٹیکسی ڈرائیور کو چیخ کر چلے جانے کا حکم دے دیا۔ میرا تھیلا قبضے میں لے کر فرش پر ایک طرف بٹھا دیا اور دو مستعد سپاہی سٹین گن تانے میری نگرانی پر متعین کر دیئے گئے۔ دو اور افسران میرے کاغذات اور سامان

کی چھان بین میں مصروف ہوگئے۔ میری جامہ تلاشی نہیں کی گئی تھی اس لئے ڈالر محفوظ رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد، یہودی کپتان کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اسے "ریڈ کراس" "وائی ایم سی اے" اور "سینٹ جونز" کی تعریفی اسناد دکھائیں لیکن اس کے سپاٹ چہرے پر کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ اسے اتفاق ہی کہا جائے گا کہ ان میں سے انگریزی سمجھنے والے ایک ڈاکٹر کو میرے کام کے متعلق، روٹری کلب کا تراشہ مل گیا۔ ڈاکٹر نے کپتان کو وہ تراشہ دکھایا اور بتایا کہ یہ تو ایک بے ضرر فقیر ہے۔ کپتان نے چلاتے ہوئے عربی زبان میں کوئی حکم صادر کیا جس کی تعمیل میں دونوں مسلح سپاہی مجھے نزدیکی پہاڑی پر لے گئے اور ـــ ایک ہولناک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ خوفزدہ تو نہ تھا لیکن بھوک، بہت ستا رہی تھی۔ گھنٹوں بعد انہوں نے ایک سیب لا کر دیا۔ خدشہ تھا کہ جس طرح بشام میں سردی نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا، وہی تکلیف یہاں نہ ہو جائے۔ پتھر کو تکیہ بنایا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا ـــ چھتیس گھنٹے گزر گئے تو جن یہودی فوجیوں نے، مجھے مجرم سمجھ کر پکڑا تھا، بے خطا جان کر چھوڑ بھی دیا۔

آزاد ہوا تو نماز ادا کرنے قریبی مسجد کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک کونے میں دھرے آٹے کے تھیلوں پر نظر پڑی۔ میں نے مسجد کے خادم سے روٹی کا تقاضا کیا۔ جواب ملا کہ "معافی"۔۔۔ کھانے پینے کی کوئی امید نہ تھی۔ خوش قسمتی سے خادم واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹماٹر اور بڑی سی چپاتی تھی۔ آدھے ٹماٹروں کے ساتھ میں نے ایک چوتھائی روٹی کھائی اور بقیہ کھانا لپیٹ کر تھیلے میں رکھ لیا۔ اسی خادم کی مدد سے بذریعہ ٹیکسی بیروت چل پڑا۔ ایک گھنٹے کا سفر، بیروت کی گرین لائن چیک پوسٹ پر ایک مسمار شدہ عمارت کے قریب جا کر ختم ہوا۔ فلسطین، فرانس، اٹلی اور لبنان کی مشترکہ سکیورٹی فورس نے آگے جانے کی اجازت دے دی تو میں نصف میل کا فاصلہ مزید طے کر کے مغربی بیروت میں داخل ہوگیا۔ پوچھتے پوچھتے وائی ایم سی اے ہوسٹل تک پہنچا تو وہاں تالے لگے تھے۔ دو گلیاں آگے چل کر ایک شخص کو دیکھا جو ایک تباہ حال ہوٹل کے سامنے زمین پر بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا ـــ "کہاں قیام کروں۔۔۔" اس نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا ـــ "تم کہیں بھی ٹھہر سکتے ہو۔ سب کچھ کھلا اور مفت ہے۔۔۔"

خستہ عمارات اور اجڑے ہوٹلوں کو دیکھ کر ایسے لگتا تھا کہ ـــ یہ کوئی آسیب زدہ

قبرستان ہے۔ کوئی بھی شخص ویران اور سنسان گلیوں سے گزرتے ڈرتا۔ ہر شے گرد آلود اور خاک خاک سی نظر آتی تھی۔ بہرحال ایک شخص نے مجھے پاکستانی قونصل خانے پہنچا دیا جہاں ڈیوٹی پر مامور ایک بوڑھا فوجی ملا۔ جب میں نے اپنا تعارف، بحیثیت رکن شوریٰ کرایا تو انہوں نے میری ظاہری حالت دیکھتے ہوئے تسلیم نہیں کیا اور کہا ۔۔۔ "ایسے لوگ تو امریکہ اور یورپ جاتے ہیں، یہاں کیا کام؟" میں نے اپنا پاسپورٹ اور کاغذات پیش کئے جنہیں بغور دیکھنے کے بعد میری آمد کا مقصد دریافت کیا۔ میں نے بتایا تو وہ پہلے سے کچھ زیادہ شک میں مبتلا نظر آنے لگا۔ مجھ سے ایک رجسٹر پر دستخط کرائے اور ان کا موازنہ پاسپورٹ پر کئے گئے میرے دستخطوں سے کیا۔۔۔ کچھ نہ ملا تو حیرت سے مجھے دیکھا اور ایک نشست پر بیٹھنے کو کہہ دیا۔

جو کچھ میسر تھا اسے ہم دونوں نے مل کر کھایا پھر وہ ۔۔۔ ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور کو لینے چلا گیا۔ اس امر پر اتفاق رائے ہوگیا کہ اگر میں پیٹرول کی ادائیگی کر دوں تو وہ میرا گائیڈ بن جائے گا۔ ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ شیعہ، سنی، فلسطینی اور دروز قبائل پر مشتمل فوجی لائن آف کنٹرول کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا گیا تھا لیکن اسرائیلی سرحد کے قریب آباد دروز ملیشیا نے دشمن کے ساتھ مل کر سازش کی، پھر اسرائیلی راکٹوں کے اچانک حملے نے تمام لوگوں کو حیران کر دیا۔ بعدازاں فلسطینی مجاہدوں نے شیلہ اور صابرہ کی جانب سے، اندر ہی کنٹرول لائن پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس معرکے میں ایک گھر بھی سلامت نہیں بچا۔ شیلہ اور صابرہ کیمپ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ چھوٹے چھوٹے ان دونوں قصبوں کی حالت انتہائی خراب ہے۔۔۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے آہ و بکا کرتے میری جانب لپکے۔ چند بزرگ خواتین، قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ میرے لئے اس جگہ دفتر قائم کرنا مشکل تھا کیونکہ لاکھوں روپے بھی اس کے لئے ناکافی تھے۔ اتنا ہی کر پایا کہ ہر متاثرہ خاندان میں ڈالر کی شکل میں رقم تقسیم کر دی۔ وہ لوگ آبدیدہ ہوگئے۔ یہ معلوم کرکے میرا دل بہت افسردہ ہوا کہ کوئی بھی عرب بھائی ان کی دادرسی کو نہیں پہنچا تھا۔ میں نے ان سب سے، پاکستان کے حق میں دعا کرنے کو کہا۔

اگلی صبح، ریڈکراس کے دفتر گیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے سفارتخانے کا پتہ نوٹ کرتے ہوئے بتایا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے، جب بھی ضرورت پڑی مجھے طلب کرلیا جائے

گا۔ اسی روز بم دھماکے میں سات بچے جاں بحق ہوگئے۔ تیل کی دولت سے مالامال عرب ممالک کا کوئی نمائندہ رضاکار موجود نہ تھا۔ جنگ سے مجھے نفرت تھی اور یہی سوچا کرتا کہ ۔۔۔ جس ذہن کو استعمال کرکے انسان چاند تک جا پہنچا ہے ہم اسے بروئے کار لاکر امن عالم کے لئے بھی کچھ نہیں کر پا رہے! لوگ مہلک بیماریوں کے علاج کے لئے سرگرداں ہیں اور انہیں وہ روگ دکھائی نہیں دیتا جو قوموں کو اپاہج بناکر صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہے۔۔۔ یہ کیسا تضاد ہے؟

عربوں کی تاریخ نفاق سے بھری پڑی ہے۔ شاید ان کی سوچ اور بصیرت کا محور، اقتدار ہی رہا ہے۔ میں نے معمر سپاہی اور اس کے ساتھیوں سے کہا ۔۔۔ "مغرب نے لوگوں کو ٹیکس کی ادائیگی پر آمادہ کرکے خاطرخواہ ترقی کرلی۔ اللہ تعالیٰ نے مشرق وسطیٰ کو تیل کی دولت سے نوازا ہے۔ بدقسمتی سے حکمرانوں کی اہلیت ہی اس قدر تھی کہ امن قائم کرنے، فوجی اخراجات گھٹانے اور غریب ممالک کی حالت بہتر بنانے کی بجائے مٹھی بھر لوگ تنازعات میں الجھ گئے۔"

میں نے بیروت کے گرد و نواح میں پانچ روز بسر کئے۔ وہاں پانی، بجلی اور راشن کی بحالی کی خبریں جھوٹ پر مبنی تھیں۔ یہ سراسر دشمنوں کا پروپیگنڈا تھا۔

پاکستان واپس پہنچا تو شوریٰ کے اگلے اجلاس کی دعوت موصول ہوئی۔ سیاست میرے بس کا روگ نہیں، اس کی ایک مرتبہ پھر تصدیق ہوگئی۔ جو لوگ وہاں جمع ہوتے، ان کا کام محض وقت ضائع کرنا تھا اور جن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا، انہیں یہ نقصان بہت اچھا لگتا تھا۔ میری بس، پارلیمنٹ کی عمارت کے باہر رکی۔ عین اسی وقت مجھے گمان ہوا کہ شاید یہاں دوبارہ آنا ممکن نہ ہو۔۔۔ برآمدوں سے گزرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ان دیواروں کے بیچ، کیا کچھ نہیں کیا جاسکتا لیکن اس جگہ کو کتنا بے مصرف بنا دیا گیا تھا ۔۔۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔ "اگرچہ یہ سب کچھ بدلنا تمہارا منصب نہیں لیکن اوپر سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ انقلابی عمل کو بنیاد سے اوپر جانا چاہیے۔"

آخرکار 12 جولائی 1984ء کا وہ دن آہی گیا جب میں معززایوان میں تقریر کے لئے اٹھا۔ جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھی ہمہ تن گوش تھے کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ شاید میں گذشتہ تیس برسوں کے مصائب کا تذکرہ کروں گا یا پھر حکومتی ٹولے کا

ایک حصہ بن جانے پر شکریہ ادا کروں گا--- یا شاید میں یہ بھی کہوں کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد ہم محب وطن ہاتھوں کی حفاظت میں آگئے ہیں اور قدرت نے ہمیں خدمت خلق کا موقع فراہم کیا ہے--- یا پھر یہ کہ ہم نے برائی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا ہے لیکن ایسا نہ تھا..... میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

جب بولنا شروع کیا تو میرے الفاظ کی تندی و تیزی ..... تصنع اور بناوٹ سے مرصع دیواروں کو چیرتی چلی گئی لیکن حیرت ہے کہ جو لوگ میرے سامنے بیٹھے تھے' ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

میں نے کہا--- "آپ نے اسلامی اصولوں کے تحت یہ شوریٰ تشکیل دی ہے لیکن حضرت علیؓ خالی زمین پر سوتے اور سوکھی روٹی ..... کھاتے تھے۔ عربی زبان کا لفظ شوریٰ تو حکومت کا متبادل ہے لیکن طریقہ کار اس کی نفی کر رہا ہے۔" میں مسلسل بولے چلا جا رہا تھا ..... "جہاں انسانی حقوق اور تعلیم و صحت کی سہولیات کا سرے سے وجود ہی نہ ہو اور محنت کشوں اور کسانوں کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ ہو' وہاں شوریٰ کیا معنی رکھتی ہے؟ آپ کن خیالات میں سرگرداں ہیں؟ کیا آپ نے مساجد کو اسلامی عدالت انصاف یا ناخواندہ افراد کے لئے مکتب بنایا؟ کیا آپ ٹیکسوں سے موصولہ رقوم کو ترقیاتی کاموں کے لئے استعمال کر رہے ہیں؟ کیا آپ بیت المال میں سے غریبوں' ناداروں اور بے دست و پا افراد کی صوبائی یا ضلعی سطح پر آبادکاری کر رہے ہیں؟ کیا آپ محدود قرض دے کر اور چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کرکے بیروزگاری کم کر رہے ہیں؟ اگر آپ ترقی اور تعمیر نو کے لئے بیرونی ممالک سے قرضے مانگ رہے ہیں تو اس گداگری کے لئے ..... مذہب کو نعرے کے طور پر کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح نظام میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ اب سچائیوں کی مزید وضاحتوں کا وقت نہیں رہا کیونکہ آپ کے لئے تو ہر چیز ناممکن ہے۔ ڈنمارک اور ناروے کی مثال آپ کے سامنے ہے' جہاں کبھی بحری جہازوں کے گزرنے کا مناسب راستہ نہ تھا' آج یہ ممالک' فلاحی ریاستیں بن کر ہمارا منہ چڑا رہے ہیں ..... میں ایسے ہی نظام کے لئے جنگ لڑ رہا ہوں۔"

میں کہتا رہا....."اس ملک کو مدد کی ضرورت ہے ..... ایک ایسی مدد جو اس کے ماضی و حال کو سدھار دے۔ خلق خدا کو ظالمانہ حد تک نظرانداز کیا جا چکا ہے۔ شاید ایک دن وہ

دیوانہ وار انھیں اور ان دیواروں کو ڈھیر کر دیں جنھوں نے ان کے مستقبل کو' سالہا سال سے اسیر کر رکھا ہے۔ میرے الفاظ کو اپنے پلے باندھ لو اور عبرت پکڑو---"

میں نے ساعت بھر توقف کیا اور پھر بولنے لگا--- "اگر آپ' اسلامی نظام کی بات کرتے ہیں تو آیئے میں آپ کو مغرب کی طرف لئے چلوں' جہاں غیر شعوری طور پر اس نظام کو اپنایا جا چکا ہے--- جس طرح اسلام خیرات کی تلقین کرتا ہے اس کا اہتمام ایک اجتماعی فلاحی ریاست ہی کر سکتی ہے۔ اداروں نے ہمیں ہیرا پھیری کی طرف دھکیل دیا ہے۔ مزید ادارے بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اختتام سے پہلے میں نے انہیں متنبہ کیا ..... "اگر آپ عوام کو دیوار تک دھکیل دیں گے تو وہ آپ کو مسترد کر دیں گے۔ جابرانہ طریقے' دہشت گردی پر منتج ہوتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں سے پرامن بات چیت کا آغاز کرنا چاہئے۔"

میں نشست پر بیٹھ گیا اور حاضرین پر خاموشی چھا گئی۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر چکا تھا۔ شوریٰ پر ایک معنی خیز سکوت میرے لئے سوہان روح بنتا جا رہا تھا لہٰذا میں وہاں سے چل دیا۔

ایک موقع پر' میں نے جنرل ضیاء الحق سے کہا تھا ..... "1905ء میں مغربی ممالک اس سے بدتر حالت سے دوچار تھے لیکن ستر اسی برسوں میں انہوں نے انسانی دکھوں کا مداوا کرنا سیکھ لیا تھا۔ ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟"

میرے نظریات سے جنرل ضیاء کو کسی حد تک اتفاق تھا لیکن اتنے بڑے مسائل پر سوچ بچار کیلئے شاید انہیں طویل وقت درکار تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ اسمبلی میں میری تقریر کے بعد ایک رکن اسمبلی نے جرنیلوں کے ایک گروپ کے سامنے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ..... "اگرچہ ایدھی تعلیم کی کمی کے باعث' ملکی سیاست اور بین الاقوامی امور کا ادراک نہیں رکھتا تاہم وہ ایک جذباتی مگر جی دار انسان ہے---"

کراچی جاکر' دوستوں کو شوریٰ اجلاس کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا ..... "ایوان اقتدار میں مجھے کوئی چیز ڈھنگ کی نظر نہیں آئی لیکن ..... ایک تجربہ کار اور ماہر سرجن کی طرح میں نے لاحق مرض کے کئی علاج ڈھونڈ نکالے ہیں۔ زہرآلود زخموں پر پٹی باندھ کر لہو کے وقتی بہاؤ کو روکنے کی بجائے ان کا تریاق تلاش کرتا رہا ہوں۔"

1951ء کے بعد سے دفتر کا ٹیلیفون قریب قریب گھنٹے آدھ گھنٹے بعد ضرور بجتا تھا۔ تیس

برسوں کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ کوئی بھی لمحہ ٹیلی فون کی گھنٹی سے خالی نہ رہا...... یہ مصروفیت تقریباً" ہر شے بھلا دیتی۔

ایوان صدر سے ایک سینئر افسر مجھے ملنے میٹھادر آئے اور کہنے لگے ..... "ایدھی صاحب' صدر مملکت نے آپ کو نیازمندانہ آداب کہا ہے---- ان کا خیال ہے کہ آپ کسی وجہ سے پریشان ہیں---- وہ اس کی وجہ جاننے کیلئے بے تاب ہیں۔" میں نے بھی مودبانہ جواب دیا ..... "مجھے کوئی پریشانی نہیں لیکن جس بیدردی سے لوگ فلاحی نظام کی نفی کرتے ہیں مجھے تو اس کی فکر ہے۔ کسی سے شکایت نہیں نہ ہی اپنے دل میں کسی کے خلاف کدورت رکھتا ہوں' لیکن پاکستان کے نام پر---- مفت خوروں کی ذاتی تشہیر اور اس سے حاصل کردہ مفادات سے متنفر ہوں۔ غرباء کیلئے گندم' اناج اور چاول کی قیمتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ صدر صاحب کیوں چاہتے ہیں کہ میں ان مسائل کو شوربے کی آنکھ سے ہی دیکھتا رہوں؟"

خاموش ہوا تو ملٹری سیکرٹری' احترام سے جاتے ہوئے بولے ..... "آپ کا مشورہ میں صدر صاحب تک پہنچا دوں گا کہ پاکستان ایک فلاحی ریاست بن سکتا ہے"۔ وہ شخص بہت چالاک---- میرے اندازے سے بھی زیادہ چالاک نکلا۔ دوران گفتگو اسے جذبات قابو میں رکھنے کی پوری مہارت حاصل تھی---- وہ اتنا حوصلہ مند آدمی تھا کہ اپنے ساتھ---- میرا غصہ بھی پی گیا۔ میں یہی بات کہنا چاہ رہا تھا کہ پاکستان کو فلاحی مملکت بنائے بغیر کوئی بھی حکومت کرنے یا اسے مستحکم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف یہ کہ ایسا مقصد قابل حصول ہے بلکہ آسان بھی ہے۔ بشرطیکہ حکومت اپنی سلامتی اور حرص کے دائرے سے باہر نکل کر سوچے۔ بلقیس اور اپنے رفقاء سے ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا..... "میرا جس بات پر ایمان ہے وہی میں نے کہا۔ امید ہے کہ صدر صاحب ..... سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوں گے۔" بلقیس میری زندگی کے متعلق بہت فکر مند تھی' کہنے لگی ..... "انہوں نے بھٹو کو نہیں چھوڑا تو آپ کو کیسے چھوڑ دیں گے؟" میرا جواب تھا ..... "میں ان کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ میں ہجوم کو مشتعل نہیں کر سکتا۔ مجھے پاگل سمجھ کر وہ نظرانداز کر دیں گے۔" اور ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے مجھے تنگ کیا نہ ہی میرے متعلق زیادہ پریشان ہوئے۔ میری تقریر کا بھی کسی نے نوٹس نہ لیا' نہ اس بات کا چرچا ہوا کہ میں شوربے

چھوڑ چکا ہوں۔ نہ ہی انہوں نے مجھے کوئی اہمیت دی اور نہ ہی انہیں احساس تھا کہ میں کس سطح پر کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس طرح میرا کام مزید سہل ہوگیا۔ وہ مجھے ایک خبطی سوشل ورکر سمجھتے رہے۔ جیسا کہ ان میں سے کسی نے کہا ..... "وہ تو صرف لاشوں کو غسل دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی میں الجھا رہے گا۔" میں خوش تھا کہ سماجی مشن کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ میرا کام بغیر کسی مداخلت کے چلتا رہے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد صوبہ سندھ میں شاذ و نادر ہی امن و امان رہا۔ 1983ء میں سندھ کے لوگوں نے اپنے سیاسی لیڈروں کی قیادت میں بحالی جمہوریت کے لیے صدائے احتجاج بلند کی۔ سینکڑوں بے گناہ مارے گئے اور کئی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنے۔ ایک بار پھر ہم نے مرنے والوں کی تدفین کی اور زخمیوں کو' ہسپتالوں میں پہنچایا۔ اسی زمانے میں نسلی اور لسانی جماعتوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا۔ مقامی آبادی اور مہاجرین کے مابین درمیان خطرناک تصادم کے امکان سے حکومت غافل تھی۔ اختلاف کے کانٹے پھیلنا شروع ہوگئے۔

ارباب اختیار کو بارہا خبردار کیا لیکن حسب معمول کسی نے توجہ نہ دی۔ لاوا پک رہا تھا جسے طویل عرصے تک دبائے رکھنا ممکن نہ تھا۔ سوچتا تھا کہ آنے والی حکومتیں بھی اپنے اقتدار کو دوام دینے میں مگن رہیں گی اور مصالحت کے اہم کام پر کسی کی توجہ نہیں ہو گی اور اس وقت تمام سیاسی مذاکرات اور سمجھوتے بے کار ثابت ہوں گے۔ میرا کام تو کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں میں نسلی فسادات کے زخمیوں کو امداد پہنچانا تھا مگر حالات و واقعات' سنگین تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

میں نے جنرل ضیاء سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو اتحاد رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ہتھیاروں کی کھلے بندوں دستیابی' تعصبات کو فروغ دے گی۔ ہمارے عوام غریب اور سادہ لوح ہیں۔ نجات صرف اجتماعی فلاح میں ہے۔ باقی سب کچھ ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔

سماجی میدان میں کئی لوگوں کے کود پڑنے سے' قربانی کی کھالوں کے لیے کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ اس میں سیاسی عوامل کا دخل زیادہ تھا۔ اس سے قبل' کچھ ہی لوگوں کا اس طرف دھیان تھا۔ برسرپیکار گروپوں کو سمجھانے کی کوشش کی ..... "آپ کو اپنی تمام تر توانائیاں قومی امور اور اجتماعی حکمت عملیوں پر مرکوز کر دینی چاہئیں ورنہ آپ خود کو تنہا کر کے کسی بند

گلی میں جا پہنچیں گے۔ نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں برآمد ہوگا جس کا خمیازہ پوری قوم بھگتے گی۔" انہوں نے مجھے جواباً" یہی کہا ..... "ہمیں کسی کی نصیحت کی ضرورت نہیں۔"

یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ میں نے بڑی بڑی برادریوں کو گروہی اور طبقاتی سیاست ترک کرکے قومی دھارے میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اس طرح متوسط طبقے کو متحد کرکے پاکستان کا مستقبل بہتر بنایا جاسکتا تھا۔ صحافیوں کو میں نے بتایا ..... "1951ء میں خود میں نے میمن عصبیت کو محسوس کرتے ہوئے اس زنجیر کو توڑ دیا تھا۔ مہاجرین اور آبادکاروں کا اجتماعی ڈھانچے سے الگ ہونا مصیبت بن جائے گا۔ ننانوے فیصد آبادی ایک جیسے ظلم کا شکار ہے۔ لیڈروں کو چاہئے کہ وہ عوام کی راہنمائی ایک مثبت قومی مقصد کی جانب کریں۔" کراچی کے تشدد بھرے ماحول میں افواہوں کا بازار گرم ہوگیا۔ خوف و ہراس کی ایسی فضا پیدا کر دی گئی تھی کہ کئی علاقوں میں مساجد کو مقفل کر دیا گیا اور نماز کا سلسلہ موقوف--- انتظامیہ سے میرا یہی کہنا تھا کہ اگر وہ امن و امان کا مسئلہ حل نہیں کرسکتے تو لوگ تحفظ کی فراہمی کے لئے کس کے پاس جائیں۔

کئی حلقوں سے دھمکیوں کے باوجود میں نے محافظ رکھنے سے انکار کر دیا۔ میری زندگی پر خدا کے سوا کسی کو اختیار نہیں۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ موت کا ڈر' کام سے گریز کو جنم دیتا ہے اور زندگی گزارنے کا یہ ڈھب نہیں--- "باڈی گارڈ" ان لوگوں کیلئے ہوتے ہیں جو مصیبت کے وقت شہرت حاصل کرنے پہنچ جاتے ہیں اور ہجوم کے غضب سے ڈرتے ہیں۔

ادھر' افغان مجاہدین سے باآسانی حاصل کردہ ہتھیار لے کر' ڈاکو اندرون سندھ جمع ہو رہے تھے۔ انہوں نے بھی دہشت گردی کا آغاز کر دیا تھا۔ مجھ پر ایک اور الزام لگا دیا گیا کہ ڈاکوؤں کو روکنے کیلئے ایدھی ان کی مذمت کیوں نہیں کرتا--- انہیں کیوں نہیں روکتا؟ مجھے اس بات سے سخت کوفت ہوئی۔

مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں پولیس اور ڈاکوؤں کے بیچ پہنچ کر میں لاؤڈ سپیکر پر یہ اعلان کرتا ..... "میں ایدھی ہوں۔ لاشیں اٹھانے اور زخمیوں کو لے جانے آیا ہوں"۔ فائرنگ فوراً" رک جاتی اور جونہی گاڑی وہاں سے روانہ ہوتی' گولیوں کا تبادلہ پھر سے شروع ہو جاتا۔ قریب ہی دوسری ایمبولینس میں لوگوں کو ڈال کر میں دوبارہ اپنی ویں میں بیٹھ کر مزید زخمیوں کو لانے چلا جاتا۔

انتظامیہ کا کہنا تھا کہ میں ان لوگوں کو اس طرز زندگی سے منع کیوں نہیں کرتا؟ کیا میں ان سے خوفزدہ ہوں؟ میں سوچتا کہ یہ سب کچھ سماجی ناانصافی کی پیداوار ہے۔

میری زندگی میں تقدیر کی ستم ظریفی' دکھ اور امید' کبھی کبھار ایک ساتھ آجایا کرتے تھے۔ ماہ رمضان میں افطاری کے وقت گھر جاتے' میں نے ایک گاڑی کے پیچھے پناہ لئے ہوئے مسلح افراد کو دیکھا۔ گلی کی دوسری جانب ایک جیولری شاپ کی چھت پر ایک اور گروپ موجود تھا۔ دونوں میں گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ ایمبولینس ایک طرف کھڑی کر کے صحیح اور غلط کی پرواہ کئے بغیر میں گاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ کلاشنکوف تھامے ایک آدمی نے مجھے پہچان کر چلاتے ہوئے کہا "ایدھی چلے جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔" میں بھی گولیوں کی بوچھاڑ میں چلایا۔ "میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تم لوگ فائرنگ بند نہیں کرو گے--- ایک دوسرے کو قتل کئے بغیر بھی یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیسے"--- لیکن میری بات سننے کیلئے شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسی اثناء میں چھت سے دو آدمی گر پڑے۔ وہیں سے ایک آدمی چلایا "ایدھی بیٹھ جاؤ"--- ساتھ کھڑے ایک آدمی نے مجھے کھینچ کر نیچے بٹھا دیا۔ میرے گرتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کا سینہ چیر گئی۔ وہ میرے اوپر گر گیا۔ میری قمیض' اس کے لہو سے تر ہو گئی۔

پانچ افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ کچھ فرار ہو گئے اور کچھ لوٹے ہوئے زیورات سمیت گرفتار کرلئے گئے۔ میٹھادر میں ان کی تدفین سے پہلے میں لاشوں کو ہسپتال لے گیا۔

کھارادر میں میرے خون آلود کپڑے دیکھ کر بلقیس چونک گئی۔ "کیا ہوا آپ کو؟ آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" کوئی جواب دیئے بغیر میں نے ہاتھ پیر دھوئے اور قمیض اتار کر بنیان پہن لی۔ بلقیس اپنے سینکڑوں سوالوں کا جواب طلب کر رہی تھی۔ میں کیا بتاتا---! آہستہ آہستہ وضو کرتا رہا' پھر بیٹھ گیا۔ "مجھے کچھ کھانے کو دو' میں نے ابھی تک روزہ نہیں کھولا۔ شدید بھوک لگی ہے۔" کھانا ختم کر کے میں نے ٹیک لگا لی اور بلقیس کو روداد بتانے لگا ..... "آج میرے اوپر جانے کی باری تھی لیکن قاتلوں نے خود ہی میری حفاظت بھی کی اور ہلاک بھی ہوگئے۔" واقعہ سنانے کے بعد میں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ ..... "میری زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔ وہ سب سے بہتر محافظ ہے۔" اگلی صبح جائے وقوعہ دیکھنے وہ خود گئی۔ انسانی گوشت کے لوتھڑے اس وقت بھی چھت سے لٹک

رہے تھے۔ جن دو آدمیوں نے میری جان بچائی تھی' مر چکے تھے ۔۔۔

ظالمانہ نظام نے ہر شعبے میں انسانی فطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ تھوک کا کاروبار کرنے والوں نے معیاری سامان اپنے گوداموں میں جمع کرکے مارکیٹ کو تیسرے درجے کی مصنوعات سے بھر دیا تھا۔ نایابی اور قلت کی صورت میں وہ اپنا مال' بلیک مارکیٹ میں بیچتے بلکہ بہتر معیار کی مصنوعات اس سے بھی مہنگے داموں فروخت کرتے۔

بعدازاں وہ اپنی حرام اور ناجائز کمائی کو حلال سمجھنے کی خود فریبی میں مبتلا ہو کر صدقہ' نیاز اور خیرات دیتے۔ دوسری جانب ڈاکو یہ سمجھتے کہ اس کمائی میں ان کا حصہ بھی ہے۔

پولیس مقابلوں میں مارے جانے والے ڈکیتوں کی میتوں کو ٹھادر لاکر پورے احترام کے ساتھ دفنا دیا جاتا۔ ایک انتہائی خطرناک ڈاکو کشمیرا نامی کو کٹی ہوئی ٹانگ سمیت اس کے عزیز و اقارب ہمارے ہاں لائے تو اس کے لئے مصنوعی ٹانگ کا بندوبست کر دیا گیا۔ پھر ایک روز سیکوریٹی پولیس کے سینکڑوں افراد کی نگرانی میں چھنائی ڈاکو کی لاش برائے تدفین لائی گئی۔ پولیس نے احتیاطاً" پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔۔۔ کسی نے کہہ دیا کہ چھنائی بہت برا آدمی تھا۔۔۔ بلقیس نے یہ سن کر کہا ۔۔ "کسی ماں نے' کسی ڈاکو کو جنم نہیں دیا۔ اسے ایسا بنانے میں سماج کا ہاتھ ہے کیونکہ سب سے بڑے لٹیروں کو خود قانون کا تحفظ حاصل ہوتا ہے"۔۔۔ بہت سے ڈاکوؤں نے مجھے کبھی نہ دیکھا تھا تاہم میں ان کی صفوں میں "ایدھی بابا" کے نام سے مشہور تھا۔ وہ جب کبھی مجھے پہچان جاتے تو بڑی عقیدت کا اظہار کرتے۔

اندرون سندھ ڈاکوؤں نے مورچے سنبھال کر پورے علاقے کو محصور کر لیا۔ جب ان ڈاکوؤں کے جنگل در جنگل لگائے گئے ٹھیکری پہروں اور خبرداری کی پوسٹوں کے قریب سے ہماری ایمبولینس وینوں کا گزر ہوتا تو یہ کہہ کر۔۔۔ چھوڑ دیا جاتا کہ یہ ایدھی بابا کی گاڑیاں ہیں! ایسے لوگوں کے پاس نہ تو کھانے کو کچھ تھا اور نہ اتنا پیسہ کہ وہ اپنی جوان لڑکیوں کی شادیاں تک کر سکیں۔ حکومت کے کل پرزے' ان خطرناک اور نازک مسائل کو حل کرنے میں قطعی طور پر غیرموثر نظر آ رہے تھے۔

جز وقتی چور' بیروزگاری کے نتیجے میں ابھرتے ہیں۔ مجبوری کی حالت میں سرزد ہونے والا جرم بعد میں ان کی عادت بن جاتا ہے۔ یہ لوگ جوا کھیلتے ہیں' کسی حد تک نشہ آور

دوائیں بھی استعمال کرتے ہیں' آبرو سے کھیلنا بھی ان کا مشغلہ ہے اور جب تھوڑا بہت پیسہ بھک سے اڑ جاتا ہے تو وہ چھوٹی موٹی چوریوں کی جانب راغب ہو جاتے ہیں۔ آخرکار بچوں سمیت سارا خاندان' چوری چکاری کے دھندے میں ملوث ہو جاتا ہے۔۔۔ میں لوگوں سے کہا کرتا ۔۔۔" پیشہ ور گداگروں کو کچھ نہ دیا کریں۔ یہ لوگ سیمنٹ کے پائپوں اور فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں' سورج طلوع ہونے سے پہلے اٹھتے ہیں اور گاڑیوں میں سے ویل کپ اور کیسٹ ریکارڈر چوری کر لیتے ہیں۔ جو لوگ ان کے پل جھپکتے روپ بہروپ سے متاثر ہو جاتے ہیں' ترس کھا کر انہیں پیسے بھی دیتے ہیں۔ اگر آپ ان سے کہیں کہ آئیں اور ہمارے ساتھ گلیوں کی صفائی کریں تو وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ جب تک زکوۃ آپ کے سرمائے میں سے نکالی نہیں جاتی وہ اس وقت تک آپ کی جمع پونجی کا حصہ بنی رہتی ہے۔ حقوق العباد کا یہ تصور نہیں کہ اسے لوگوں سے عاجزانہ مانگا جائے بلکہ حکم خداوندی تو یہ ہے کہ جو لوگ اس کی ادائیگی سے گریز کریں ان سے زبردستی لیا جائے۔ اس بارے میں علماء سے فتویٰ لیا جاسکتا ہے۔۔۔ سرکاری محصولات پر بھی غریبوں کا حق ہے جس سے انحراف ڈاکہ زنی کے مترادف ہے۔ گلیوں میں روشنی کے کھمبے' سرکاری شفا خانے اور دیگر فری خدمات' ان سب کیلئے عوامی عطیات کی ضرورت ہے کیونکہ ٹیکس اور زکوۃ لگ بھگ ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ مغرب میں سماجی بہبود کے سارے کام' لوگوں پر عائد کردہ محصولات سے نمٹائے جاتے ہیں۔"

اکثر اوقات میں نے بلقیس کو مانگنے والی لڑکیوں اور عورتوں کے نرغے میں دیکھا۔ وہ بھکاریوں سے کہتی ۔۔۔ "تم لوگ اپنی حالت درست کیوں نہیں کرتے؟" پڑھے لکھوں سے کہتی ۔۔۔ "آپ مہربانی فرما کر ان پڑھوں کو کچھ لکھا پڑھا دیا کریں۔ بظاہر یہ چھوٹی سی کوشش' قوم کے عظیم تر مفادات کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔"

1985ء میں جب مارشل لاء کو لگے نو سال ہو چکے تھے۔۔۔ حالات و واقعات کی سنگینی اور سیاسی بے چینی نے جنرل ضیاء الحق کو غیرجماعتی انتخابات کرانے پر مجبور کر دیا۔۔۔ زیادہ اضطراب صوبہ سندھ میں تھا۔ اس کے نفسیاتی علاج کیلئے ایوان نے محمد خان جونیجو کو پاکستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ جنرل ضیاء الحق نے سامنے سیاسی حکومت کو رکھا اور پیچھے' چیف آف آرمی سٹاف کا منصب بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یوں پورے گیارہ

برس' فوجی قیادت اور سویلین صدارت کی کرسیوں پر بیک وقت براجمان رہے۔

آخر ہماری بیٹی کبریٰ کی رخصتی کا دن بھی آن پہنچا۔ یہ سوال کہ اس کا ہونے والا شوہر الطاف غریب آدمی ہے اور اس کا باپ ایدھی ایک امیر کبیر شخص'--- اس کی شادی کے آخری لمحات تک موضوع سخن بنا رہا--- کبریٰ کی شادی پر بھی زینت کی شادی جیسی رسومات دہرائی گئیں--- بتایا گیا کہ خالہ اور رابعہ ماں نے کبریٰ کے جہیز کی تیاری میں راتیں جاگ کر گزار دیں جبکہ الماس اور زینت نے عروسی جوڑے کی سج دھج اور دلفریب سجاوٹ کیلئے کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کیا۔ دروازے کے عین پہلو میں' ایک روایتی دلہن کے چمکتے دمکتے ملبوسات سے بھرا اٹیچی کیس رکھا تھا۔ کبریٰ کے دونوں بھائی قطب اور فیصل انتظامات میں مصروف کبھی گھر کے اندر اور کبھی باہر' بے تابانہ آجا رہے تھے--- ہر چیز اپنے اپنے مقام پر تھی لیکن ہیجان بھی تھا---!

بلقیس نے بتایا کہ الطاف کے کچھ دوست' قطب اور فیصل سے مل کر الطاف کی شادی کا جشن منانا چاہتے ہیں--- آرائش پھیل کر میرے کمرے کی دہلیز تک آچکی تھی۔ میں گھر میں ایک ڈھولکی بھی دیکھ رہا تھا جس کی آہنگ اور تھاپ پر لڑکیوں نے شادی بیاہ کے گیت تیار کئے تھے--- رابعہ ماں سارے گھر والوں کے بیچ فاتحانہ انداز میں بیٹھی تھیں کہ ان کے پوتے کے ساتھ' ان کی نواسی بیاہی جا رہی تھی--- انہوں نے میرے سامنے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ ہی دیا ... "ایدھی دیکھا تم نے--- دونوں کس قدر خوبصورت اور بھلے دکھائی دے رہے ہیں۔" ایسے موقع پر دعاؤں کے ساتھ' خوشی کا اظہار کیوں نہ کیا جائے۔ شاید ہر طرف یہی احساس تھا لیکن میں درد کی کیفیت سے دوچار تھا۔ رابعہ ماں کی خوش گمانی اور ہر طرف دھکم پیل کے باوجود' اندر ہی اندر سرسراتے کسی غم کی صدا بھی سن رہا تھا۔ شاید بیٹی کی رخصتی پر ایک روایتی اداسی' یا پھر شاید اس لئے کہ کبریٰ نے عروسی جوڑے کی بجائے اپنے وجود کو ادھورے خوابوں سے بھی ڈھانپ لیا تھا--- کچھ تو تھا!

میں نے زینت کی طرح کبریٰ کو بھی سرسری دیکھا--- اس نے پاؤں تک شادی کا خصوصی سفید لہنگا پہن رکھا تھا۔ مہین نقاب سے جھلکتا اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے ہوبہو بلقیس' میٹھادر کے دفتر میں میرے سامنے کھڑی ہو۔ پر کبریٰ جن حالات میں نئے گھر کو سدھار رہی تھی' وہ ان حالات سے بہت مختلف تھے جن کے تحت اس کی ماں میرے گھر آئی

تھی--- میں احساس کی اس دکھن کے ساتھ یکدم پیچھے مڑا اور ان لڑکوں میں جا شامل ہوا جنہوں نے دولہا کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

کبریٰ رخصت ہونے لگی تو بلقیس ہر قسم کی رسمی تسلیوں اور رواجی دلاسوں کی پرواہ کئے بغیر بے پناہ روئی--- اتنی زیادہ کہ اس کی آنکھوں سے بہنے والا ہر آنسو اپنی بیٹی کے تابناک مستقبل کیلئے جیسے دعا بن گیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر بلقیس سے کہا ... "میں کبریٰ کی خوشیوں اور اس کے بہتر مستقبل کیلئے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں رہے شاد و آباد رہے--- لیکن اگر اس کے خیالات کسی وجہ سے متزلزل ہو گئے اور اس نے اپنی سوچوں کی سمت بدل لی تو میری عمر بھر کی کمائی ضائع ہو جائے گی۔"

بلقیس الطاف کو پسند کرتی تھی لیکن اس کے جذبات' خوشگوار مستقبل کی ضمانت نہیں ہو سکتے تھے۔ شاید اسی لئے میں نے بلقیس کو واضح طور پر کہا کہ وہ کبریٰ کو سادگی کی تلقین کرے تاکہ وہ انسانی خدمت گزاریوں کی طرف لوٹ سکے۔ میرا ایمان ہے کہ اس کے اندر ہی وہ سب کچھ موجود ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میری بیٹی کبریٰ' میرے مشن سے والہانہ پیار کرتی ہے۔

مفاد پرست لوگوں کی مخالفت کے باوجود' پرنٹ میڈیا نے میری کارکردگی اور مشن کو تحریری طور پر سراہنا شروع کر دیا تھا لیکن کچھ صحافی ابھی تک میرے رقیبوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو تشہیر سے میری عدم دلچسپی کو غرور سے تعبیر کرتے تھے۔

اتنا فالتو وقت نہ تھا کہ پبلسٹی کا محتاج محض بن کر رہ جاؤں۔ میں سمجھتا تھا کہ ذاتی تشہیر سے رونما ہونے والے مضمرات' اصل کاموں سے فرار کے راستے پر لے جاتے ہیں۔

احباب نے مشورہ دیا کہ مجھے سماجی کاموں کے حوالے سے کبھی کبھی خبروں میں بھی رہنا چاہیے لیکن میں نے قطعی انکار کر دیا ... کیونکہ پبلسٹی کے ہاتھوں نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ میڈیا میں موجود بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بونوں کو طویل قامت ثابت کرنے کے ماہر ہیں۔ ہم ہر روز اخبارات میں اونچے خیالات' دلفریب عزائم اور خوشنما دعوؤں سے متعلق بیانات پڑھتے ہیں لیکن عملی طور پر کچھ بھی سامنے نہیں آتا۔ حکومت اگر مسائل میں گھرے

ہوئے عوام کے لئے کچھ کرتی ہے تو ٹھیک' ورنہ احتجاج اور شورش ..... اسی طرح اگر میں دکھی انسانوں کی خدمت کرتا رہا تو بہتر ورنہ ذاتی تشہیر' رسوائی کا سبب بن جائے گی لہٰذا اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔

اخباری رپورٹر میرا انٹرویو لینے آتے تو انہیں یہی کہتا کہ ابھی میرا کام اس قدر نہیں کہ اسے پریس فورم پر لایا جائے۔ اس مرحلے پر کسی بھی اخباری کالم کی حیثیت ایک خوشامد کے سوا کیا ہوگی۔ لیکن اتنی ساری وضاحتوں کے باوجود صحافیوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔

اس تمام تر صورتحال کا مداوا وہی پرانا طریقہ تھا جب میں سر راہے کھڑے ہو کر چلتے مسافروں سے صدقات لیا کرتا تھا۔ روکھی سوکھی پر قناعت کی عادت ہمیشہ مجھے اپنی اصل یاد دلاتی رہی اور ہر حال میں جھوٹی آن بان کے سامنے سینہ تانے کھڑا رہا---- بڑی بڑی قیمتی کاروں کو چلانے والے ڈرائیور یا مالکان بھی مجھے دیکھ کر رکنے لگے۔ جو کچھ ان کے پاس ہوتا' میری جھولی میں ڈالتے گزر جاتے۔ اگر کوئی رسید طلب کرتا تو خوشی ہوتی کہ لوگوں میں معاشرتی شعور بیدار ہو رہا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے مجھے بطور خاص' میڈیا کی آنکھوں سے اوجھل رہنا پڑا۔ یہ تک معلوم نہ تھا کہ کونسا اخبار ہے اور کس کا ہے۔

بعض اوقات جب مجھے ایدھی سنٹروں کی دیکھ بھال کیلئے جانا ہوتا یا کوئی ارضی' سماوی افتاد آ پڑتی تو کسی نہ کسی صحافی سے ٹاکرا ہو ہی جاتا اور کچھ ایسے سوالات کئے جاتے کہ جواب میں مجھے ایک زبردست تقریر کرنا پڑتی۔

کوئی ساتھی مجھے انٹرویو کی ترغیب دیتا---- تو میرا ایک ہی جواب ہوتا کہ جب شہرت کے پیچھے بھاگ کر لوگوں نے اپنے مقاصد کی مٹی پلید کرلی ہو تو خودنمائی کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات یہاں تک کہا جاتا کہ ..... دکھ بیان کرنے کے بجائے اپنی اور ادارے کی تعریف کی جائے لیکن میں اس کے منفی نتائج سے باخبر تھا۔ میرے خلاف کچھ لکھا جاتا تو بھی پرواہ نہ کرتا ... چہ جائیکہ اپنے حق میں لکھے جانے والے قصیدے پڑھ کر اکڑتا پھروں۔ بلقیس کبھی اپنی یا میری تعریف پر مبنی کوئی اخباری تراشہ لاکر دکھاتی تو اسے بھی تنبیہہ کرتا ..... "ذاتی سربلندی کا احساس' خودفریبی میں مبتلا کر دیتا ہے جسے ایک لغزش ختم کرکے رکھ دیتی ہے۔ لوگ میرے بارے میں جھوٹ لکھ کر' ساری زندگی سچ کا دفاع کرنے پر مجبور کر دیں گے۔"

اسی سال حبشہ گیا۔ صومالیہ میں آٹھ روز تک قیام کیا۔ یہاں پاکستان کے مقابلے میں زیادہ غربت کے آثار نمایاں نظر آتے تھے ..... کسی اصلاحی تنظیم کی اجازت نہ تھی۔ ادیس ابابا کا ہوٹل چھوڑا تو میرے تھیلے میں عطیات کی رقوم تھیں۔ دو مقامی جوانوں کو میرا بڑھاپا دیکھ کر مغالطہ ہوا کہ وہ آسانی سے سب کچھ چھین لے جائیں گے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا لیکن جواباً" ان کی وہ پٹائی ہوئی کہ انہیں اپنی جانیں بچاتے بنی ....

حبشہ کے اکثر باشندے' سماجی طور پر پسماندہ تھے---- عام آدمی کو بے پناہ معاشی مشکلات کا سامنا تھا---- اشیائے خوردونوش کے مقابلے میں نقل و حمل کے اخراجات زیادہ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امدادی اشیاء اٹھائے نہ جانے کے باعث بندرگاہوں پر پڑی ... سڑتی گلتی رہتی تھیں---- عالمی سطح پر ہتھیاروں پر زور نے تجارتی اداروں کو بھی سنگ دل بنا دیا تھا---- میں اجاڑ اور ویران ماحول میں سڑک کے ایک طرف آزردہ کھڑا مسلمان گھرانے کی ایک شادی میں اخلاق باختہ حرکات دیکھ رہا تھا .... چمکتی دمکتی اور بجی سجائی کاروں کے ایک جلوس کے سامنے بینڈ بج رہا تھا۔ ایک فوٹوگرافر تصویریں اتار رہا تھا---- میں اس منظر سے گھبرا گیا اور حبشہ چھوڑنے سے پہلے وہاں کی ایک فلاحی تنظیم کو دس لاکھ روپے کا عطیہ دے کر پاکستان آگیا---- میرا تاثر یہی تھا کہ گولیاں چلانے یا سخت گیر طریقے سے کبھی بھی اصلاحی نتائج برآمد نہیں ہوتے---- صرف مٹھی بھر ارباب اختیار کے کھانے پینے کا بندوبست ہو جاتا ہے ... مسائل کا کارگر مداوا اسی صورت ممکن ہے کہ قتال و جدال کی بجائے باہمی گفت و شنید سے کام لیا جائے .... اسی روز افغان مجاہدین کا ایک گروپ ہمارے دفتر آیا اور استدعا کی کہ ہم غازی بن چکے ہیں' حج پر جانے کے لئے ہماری مالی امداد کی جائے ..... جب وہ لوگ چلے گئے تو میرے ساتھیوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے تبصرہ کیا ... "اب انہوں نے مسائل حل کرنے کا یہ طریقہ بھی ایجاد کر لیا ہے' چہ خوب۔"

کبریٰ کسی سے ذکر تو نہ کرتی لیکن اسے دیکھ کر صاف پتہ چلتا کہ وہ ابھی ازدواجی مسائل سے گزر رہی ہے---- الطاف بھی بظاہر کسی بات پر شاکی نہ تھا ... وہ بینک سے فراغت کے بعد کے اوقات میں رات گئے تک شادیوں کی وڈیو فلمیں بنایا کرتا۔ کبریٰ کے خیال میں اس کا کام اور زندگی' دونوں بے مقصد و بے معنی تھے۔ اس نے الطاف کو سمجھایا کہ مجھے غربت تنگ نہیں کرتی---- میں نالاں ہوئی ہوں تو تمہارے اس کام سے جس کی

مسافت تو ہے، منزل نہیں ۔۔۔ جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو احساس ہوا کہ جو کچھ کبریٰ اپنے خاوند سے توقع کر رہی ہے اس کا حصول تو میرے اندیشوں سے بھی زیادہ محال نکلا ۔۔۔

اپنی مدد آپ ۔۔۔ کی سکیم پر عمل پیرا ہو کر سینکڑوں خواتین کارکن ایدھی مراکز میں انتظامیہ کا ایک حصہ بن کر کام کر رہی تھیں ۔۔۔ انہیں باقاعدہ اپنے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے مواقع فراہم کئے جاتے تھے لیکن عمر میں ذرا بڑے بچے اس مقصد کے لئے مخصوص یگانہ مراکز میں پڑھتے بھی تھے اور رہتے بھی تھے۔ لڑکیاں کام کرتے جوان ہو جاتیں تو ان کی شادیاں کر دی جاتیں ۔۔۔ ایسی شادیوں سے قبل، بلقیس آنے والے رشتوں کی خود چھان بین اور لڑکوں سے انٹرویو کرتی۔ بات طے ہو جاتی تو بیاہی جانے والی لڑکیوں کے عروسی جوڑے اور دیگر اشیاء بالکل اپنی بچیوں جیسے تیار کرتی اور انہیں عزت آبرو کے ساتھ نئے گھروں کو رخصت کرتی ۔۔۔ شادی کے بعد یہ لڑکیاں اپنے شوہروں کے ساتھ ایدھی سنٹر آکر عقیدت و احترام کے ساتھ بلقیس سے ملاقات کرتیں ۔۔۔

کچھ افراد نے تجویز دی کہ کسی بھی کثیر الاولاد ماں کو اپنے ایک دو بچے خالی گود والی ماؤں کو دے دینے چاہئیں۔ بلقیس یہ سن کر کہنے لگی ۔۔۔ "بات تو ٹھیک ہے لیکن کوئی ماں اپنے جگرپاروں کو اپنے وجود سے کیوں کر الگ کر سکے گی؟"

بعض امیر لوگ انتہائی خوبصورت بچوں کو لے پالک بنانے کی تمنا لے کر ہمارے پاس آتے تھے ۔۔۔ یہ جان کر دکھ ہوتا کہ وہ محض نمائشی طور پر بچہ گود لینا چاہتے ہیں۔ جب وہ کورا جواب لے کر چلے جاتے تو میں آہ بھر کر کہتا ۔۔۔ "ایسے آئے تھے جیسے کھلونوں کی دکان سے چابی والا کھلونا ۔۔۔ خریدنے آئے ہوں۔"

خواتین کے ٹریننگ پروگرام کے حوالے سے ہزاروں خواتین رابعہ ماں کی کوششوں سے خودکفیل ہو چکی تھیں۔ ہمارے پاس آنے والی لڑکیاں اکثر و بیشتر ان پڑھ ہوتیں اور انہیں برتن دھونے یا دیگر گھریلو کام کاج کے سوا کچھ نہ آتا۔ نرسنگ کے پیشے میں ٹریننگ ان کے اچھے مستقبل کے لئے بہترین متبادل صورت بن گئی ۔۔۔ پرائیویٹ ہسپتال بھی گاہے بگاہے ہم سے ماہر نرسوں کی خدمات طلب کرتے ۔۔۔ بلقیس ان کے کوائف کی باقاعدہ تصدیق کرتی اور ایدھی نرسنگ کارڈ دے کر انہیں فیلڈ میں روانہ کر دیا جاتا۔ کچھ لڑکیوں نے اپنے کلینک کھول لئے تھے اور کام کو بہتر خطوط پر چلانے کے لئے ڈاکٹر مقرر کر رکھے تھے جو

مریضوں کو باہر جا کر بھاری فیس ادا کرنے کے اضافی اخراجات سے بچانے کا وسیلہ بن گئے ۔۔۔ یہ لڑکیاں کمپنی سے کم نرخوں پر ادویات خرید لیتیں اور انہیں کھلی مارکیٹ سے کم قیمت پر فروخت کرتیں ۔۔۔ یہ جان کر بے حد مطمئن تھا کہ لڑکیوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور اپنی مدد آپ کا شعور پیدا ہو رہا ہے ۔۔۔ لوگ بوقت ضرورت ہماری نرسوں کو گھروں میں بھی بلوا لیتے ۔۔۔ غریب خاندانوں سے تعلق رکھنے والی نرسوں کو عزت و احترام کے ساتھ، خدمت کے عوض بطور شکرگزاری، تحائف بھی مل جاتے۔ رابعہ ماں، کارکردگی پر سراہے جانے سے بے حد خوش ہوتیں۔ ایک بار انہوں نے بتایا ۔۔۔ "آج سوات کی رہنے والی ایک خاتون کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے جس سے خوش ہو کر اس کے شوہر نے نرس کو سونے کی بالیاں، جاپانی ریشمی سوٹ اور مٹھائی کا ڈبہ لا کر دیا ۔۔۔ نوزائیدہ لڑکے کی دادی نے بھی اسے دو سو روپے بطور انعام دیئے ۔۔۔" لڑکیاں جہاں محنت کر کے اپنے نان نفقہ کا آبرومندانہ انتظام کرتیں، وہاں غریب خاندانوں کی عورتیں بھی ولادت ۔۔۔ پر اٹھنے والے ہزاروں روپے کے اخراجات سے بچ جاتیں۔

کاؤنٹروں پر عطیات وصول کرنے کے لئے محنتی، دیانتدار اور منتظم خواتین کو مامور کر دیا گیا۔ ہنگامی حالتوں سے نمٹنے کے لئے فاؤنڈیشن کو سندیافتہ کارکنوں کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بم دھماکوں کے ہر لحظہ منڈلاتے ہوئے غیریقینی خطرات کی صورت میں خواتین نے زیادہ جرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایسے مواقع پر جب ٹرسٹ کی نرسیں سفید یونیفارم میں ملبوس، بڑے حوصلے سے ہمارے آگے چلنے پر اصرار کرتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ ذہنی تبدیلی کے خوشگوار آثار بڑی تیزی کے ساتھ نمودار ہو رہے ہیں۔

حدود آرڈیننس کے نفاذ نے مراعات یافتہ اور نادار طبقات کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا تھا۔ شوہر، سسرال والے یا دیگر مخالفین، جرم کوئی بھی کرے، حدود آرڈیننس کے تحت عورتوں کو دھر لیا جاتا اور کسی چشم دید گواہی یا برموقع شہادت کے بغیر انہیں زنانہ جیلوں میں بھیج دیا جاتا ۔۔۔ خصوصی استحقاق رکھنے والے افراد ایسی حالتوں میں سے کسی اذیت کے بغیر صاف گزر جاتے۔

گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکیاں واپس اپنے گھروں میں لوٹ جانے پر آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ گیارہ، بارہ برس کی کم عمر لڑکیوں کو سمجھا بجھا کر ۔۔۔ روزانہ میرے پاس بھیجا جاتا کہ وہ

اپنی عمریں زیادہ بتائیں تاکہ انہیں سنٹر سے جلد از جلد فارغ کر دیا جائے۔ کوئی انہیں لینے آئے تو اداکاری کرتے ہوئے رونا دھونا مچائیں ـــ لیکن یہ فارمولا کبھی کارگر نہ ہوا ـــ ایسی حالت میں ان لڑکیوں کی عمروں' گھروں کے پتے اور دیگر کوائف سے متعلق دستاویزات طلب کی جاتیں۔ میں ان لڑکیوں سے اکثر کہتا ـــ "دیکھو' تمہارا مستقبل ـــ تمہاری سہیلیاں نہیں' تمہارے والدین ہی تمہیں ایک بہتر زندگی اور تحفظ فراہم کرسکتے ہیں" ـــ ملک بھر میں ہزاروں لڑکیاں بلوغت کے بعد ان کے خاندانوں کے حوالے کی جاچکی تھیں لیکن دو تین فیصد کے سوا' بیشتر افراد ایسے تھے جنہوں نے گم شدہ لڑکی کی کوئی پولیس رپورٹ نہ کی اور اپنی ممکنہ رسوائی کے مارے خاموش اور غم زدہ بیٹھے رہے ـــ کچھ والدین نے یہ کہہ کر ان لڑکیوں کو واپس لینے سے انکار کر دیا کہ راتوں کو یہ دیواریں پھلانگ کر ـــ بھاگ جاتی ہیں اور پھیل جانے والی خبر کے بعد ہم ان کے فرار کا کوئی جواز پیش نہیں کرسکتے ـــ انہیں سمجھایا جاتا کہ ـــ "جوان بچوں پر اتنی شدید پابندی بھی درست نہیں۔ اسلام اخلاقی حدود کے اندر رہ کر ایک قابل عمل تحفظ فراہم کرتا ہے۔

ایسی لڑکیاں اور عورتیں جنہیں زناکاری کی بنیاد پر جھوٹے الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا تھا' فاؤنڈیشن نے ان کی بے گناہی کی شہادتیں فراہم کیں اور کوشش کی کہ وہ اپنے مخالف گروپوں کے روبرو بیٹھ کر ان کی سنیں اور اپنی سنائیں ـــ ایسی حالت میں ہماری حیثیت دونوں اطراف کے مشترکہ وکیل جیسی ہوتی جس کے پیش نظر اصلاح احوال کے سوا کوئی دوسری منفعت نہ ہوتی ـــ مرضی کی شادی یا اتفاق رائے سے طلاق کے حوالے سے عورتوں پر کوئی قدغن نہیں ـــ بیشتر والدین سے کہا جاتا ـــ "والدین' نادان بچوں پر اپنی مرضیاں ٹھونستے ہیں تو وہ بھی ضد و انتقام میں آکر دوسری شادیاں کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ کسی بھی ازدواجی تنازعہ کو آپ کی نیک خواہشات ہی ختم کرا سکتی ہیں۔"

غمزدہ والدین کو زمانے کی نئی تبدیلیوں سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کرتا تو ان خیالات کو چودہ سو برس سے پہلے کی فرسودہ روایت جان کر یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا جاتا کہ یہ نظریات بیسویں صدی کے لئے موزوں نہیں ـــ!

میں سمجھتا ہوں کہ فلاحی ریاست کے بغیر اسلامی تعزیرات کا تصور عبث ہے۔ یہی بات ہائی کورٹ کے ایک جج سے کہی ـــ "آپ ایک مرغی چور کے ہاتھ کیسے کاٹ سکتے ہیں جبکہ و

بھوکا بھی ہے۔ آپ ایک ایسے معاشرے میں چار غیرجانبدار' بے خطا اور خالص گواہوں کے بغیر آبروریزی کا قضیہ کیسے حل کرسکتے ہیں؟ آپ کسی کو سزا کیسے دے سکتے ہیں جبکہ جرم کے ارتکاب سے پہلے اس پر انصاف کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہوں۔"

اس ملک میں قریب قریب ستر فیصد عورتیں' شادی کے ابتدائی اذیت ناک دور کے بعد' اپنے پیچھے چھ یا سات بچے چھوڑ کر مر جاتی ہیں ـــ غربت و افلاس کے ہاتھوں ناچار باپ' انہیں ہماری نگہداشت میں دے جاتے ہیں ـــ کچھ ایسی عورتوں کو بھی مبینہ الزامات کے تحت جیل بھیج دیا جاتا جو دوچار معصوم بچوں کو پال رہی ہوتیں۔ انہیں کیسے گوارا ہوتا کہ وہ خود تو جیل چلی جائیں اور ان کے بچے گلیوں میں پامال پھریں ـــ اس طرح وہ معصوم اور پھول سے بچے بھی اپنی ماؤں کے ساتھ جیلوں میں مدتوں چکیاں پیتے رہتے ـــ میں نے اس بارے میں ہوم سیکرٹری سے کہا کہ جب تک ان کی مائیں قیدی ہیں' ان بچوں کو ہماری نگرانی میں دے دیا جائے لیکن انہوں نے معذرت کر دی کہ ـــ مائیں اپنی اولاد کو جدا کرنے پر راضی نہیں۔

جیلوں میں زندگی کی تمام ممکنہ سہولتوں کے بغیر جوان ہونے والے بچوں کا بیرونی دنیا سے رابطہ نہ ہونے کے باعث' انہیں پھلوں کے نام تک نہیں آتے تھے۔ باہر آکر یہی بچے بڑے بڑے جرائم میں ملوث ہوکر تباہ کاریاں لاتے ہیں تو انہیں چور' مجرم اور قاتل کہا جاتا ہے۔ ہم ان سے اور توقع بھی کیا کرسکتے ہیں کہ وہ کیا بنیں گے ـــ! کوئی ہے جو ان کا مستقبل سنوارنے کا جتن کر رہا ہے؟ ایسی قوم کا انجام کیا ہوگا جس کی جڑوں کو کال کوٹھڑیوں میں کچل دیا گیا ہو ـــ جرم و خطا کے احساس سے عاری یہ بچے' ان اندھیروں سے نکل کر باہر آئیں گے تو راج بھی ایسے ہی لوگوں کا ہوگا ـــ حالت یہ ہے کہ آج ہزاروں بچے' تنگ و تاریک گلیوں میں رینگتے پل بڑھ رہے ہیں۔ کئی سخت گیر پولیس اہلکاروں سے بھی کہا ـــ "ماحول کے ہاتھوں ستائے ہوئے ناپختہ ذہن' سختی قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور ان کے والدین گھبرا کر انہیں ہمارے سپرد کر جاتے ہیں ـــ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

المیہ یہ ہے کہ نہ تو کبھی مسائل حل کئے گئے' نہ ہی کسی قسم کی اصلاحات نافذ ہوئیں ـــ اس بارے میں حکومت کو بھی مشورہ دیا تھا کہ اگر ہائی کورٹ کے جناب چیف جسٹس'

مہینے میں ایک بار' مختلف جیلوں کا اچانک دورہ کیا کریں تو مقدمات سے متعلق کئی ایسے انکشافات ہوں گے جن کی روشنی میں وہ اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اصلاح کر سکیں گے ..... لیکن وہی روایتی جواب ملتا کہ اس سلسلے میں ایک اور کمیٹی بنائی جا رہی ہے۔

لڑکوں کی بحالی کے مراکز' نوجوان خود ہی چلا رہے تھے۔ وہ برتن صاف کرتے' کھانا پکاتے' کپڑے دھوتے اور انہیں استری کرتے۔ وہ آہستہ آہستہ کپڑوں کی سلائی' لکڑی اور ابتدائی الیکٹرک انجینئرنگ کے کاموں میں مہارت حاصل کر رہے تھے۔ وہ خود ہی ایدھی مرکز کا فرش' کھڑکیاں اور گٹر صاف کرتے اور کوڑا کرکٹ جلا کر ضائع کر دیتے---- یوں صفائی کے بارے میں ادارے کا مقرر کردہ معیار برقرار رکھتے۔

مطمئن تھا کہ آغاز کار میں جن بچوں کی نازیبا حرکات سے تھوڑی بہت پریشانی پیدا ہوئی تھی' اب ختم ہو رہی تھی۔ نظم و ضبط کی پابندی اور اپنی مدد آپ ..... کے تصور نے انہیں سادہ اور باوقار راستوں پر گامزن کر دیا تھا۔ ہزاروں بچے' باعزت شہری کی حیثیت سے اپنے گھروں کو لوٹے---- لیکن نچلے طبقے کے ایک ہی کمانے والے کے کاندھوں پر بے پناہ مالی بوجھ آن پڑا۔ لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں اور ذہنی امراض کے مراکز میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا جس سے قابل رشک نتائج مرتب ہوئے۔

1986ء کے دوران' ڈھاکہ میں ایک عبوری امدادی مرکز کا افتتاح کیا گیا۔ ایک ایمبولینس گاڑی بھی فراہم کر دی گئی۔ بنیادی مقصد سیلاب زدگان کی امداد تھا ..... ساتھ ہی کراچی میں لسانی فسادات کے متاثرین کی بحالی کا کام بھی جاری تھا۔ اسی سال' جنگ آزادی لڑنے والے فلسطینیوں نے جب ایک امریکی ہوائی جہاز اغوا کرکے کراچی کے ہوائی اڈے پر اتارا تو ان کے اس اقدام نے پاکستان کو نادیدہ مشکلات سے دوچار کر دیا---- صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر ائیرپورٹ جانے کے لئے ایمبولینس میں جا بیٹھا تو بلقیس نے ممکنہ خطرات سے خبردار کیا۔ اس کے خیال میں فلسطینیوں کو میرے بے لوث کام کا کوئی علم نہ تھا۔ کہنے لگی ..... "اگر انہوں نے لاعلمی میں آپ کو نشانہ بنایا تو آپ کا سارا مشن ختم ہو جائے گا"---- ننھے فیصل نے بھی ماں سے میرے ساتھ چلنے کی سماجت کی لیکن بلقیس نے اسے جانے سے روک دیا---- مجھے یقین تھا کہ فیصل جس انداز سے میرے ساتھ جانے کی

ضد کر رہا ہے' وہ بھی اسی راستے پر مجھ سے آن ملے گا۔

ایئرپورٹ کی جانب جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ بلقیس نے چلنے سے پہلے مجھے کس قدر حیران کن مشورہ دیا تھا ..... لیکن میں نے اپنی جان کی حفاظت کو کبھی ترجیح نہ دی۔ حالات و واقعات کی سنگین تر صورتوں میں بھی' اگلی صف میں ہی رہنے کی کوشش کی---- مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب ناتک واڑہ کی ایک بوسیدہ عمارت میں سے بجلی کی ننگی تاروں نے خطرناک صورتحال پیدا کر دی تو وہاں موجود انتظامیہ کے ذمہ دار افراد نے مجھے محتاط رہنے کو کہا لیکن میں بے دھڑک اندر چلا گیا اور ایک بوڑھی اماں کو بازوؤں میں سنبھالے باہر نکلا۔ یہ حوصلہ اور جذبہ' خالق حقیقی کا عطاکردہ تھا جس نے ناگہانی موت کے خوف پر حاوی ہونے میں میری مدد کی۔ افسوس کہ اس حادثے میں اس بزرگ خاتون کی بیٹی اور تین نواسیاں جاں بحق ہوگئیں تھیں جنہیں میں نے قبرستان میں اپنے والد کی لحد کے قریب دفنا دیا۔

کراچی کے ہوائی اڈے پر پاکستانی حکام اور فلسطینی ہائی جیکروں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے اور ہم سب لوگ بے چین کھڑے نتائج کا انتظار کر رہے تھے ..... امریکی جیٹ جہاز کو ہائی جیکروں کی تحویل میں 24 گھنٹوں سے اوپر ہو چلے تھے۔ کچھ کرنے کی تحریک ہوئی---- وین کو پھرتی سے چلاتے' مغوی جہاز کی طرف بڑھا۔ ایئرپورٹ پر کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کیلئے تیار' مشین گنوں کے منہ کھل گئے۔

اندھا دھند حفاظتی فائرنگ کے باعث مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ زخمی اور مردہ مسافر' جہاز کے دروازے سے گرتے پڑتے زندگی کی جانب لپک رہے تھے ..... بہت سے مسافر خوف کے مارے بے ہوش تھے۔ سب کو ہسپتال لے جایا گیا---- اس سانحہ میں بائیس افراد لقمہ اجل بن گئے۔

بے گناہ انسانی جانوں کے اتلاف نے ماحول کو مکدر کر رکھا تھا اور اس کا احساس دل شکن بھی تھا---- اس سارے المیئے میں سیاست دانوں کی کارگزاری یہ تھی کہ انہوں نے پریس رپورٹروں اور ٹیلی ویژن کے کیمرہ برداروں کا ایک جم غفیر' جائے حادثہ پر روانہ کر دیا۔ انہوں نے اپنی بساط اور فہم کے مطابق آنکھوں دیکھا حال لکھا اور مردہ اجسام کی تصویریں اتاریں تاکہ اخبارات کا پیٹ بھر سکے ..... رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کی اس فلم بندی نے

کام کی رفتار ست کر دی ... مرنے والوں کی اشیاء' ملبوسات' اٹیچی کیس اور دیگر ساز و سامان امریکی اور بھارتی سفارت خانوں کے سپرد کر دیا گیا۔۔۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کراچی ائیرپورٹ پر رونما ہونے والے اتنے عظیم سانحہ کے دوران' صرف ایدھی فاؤنڈیشن کو اجازت ملی کہ وہ امدادی کاموں میں اپنا کردار ادا کرے ...

اس درد انگیز کہانی کا ایک مختصر باب' بلقیس کی زبانی معلوم ہوا۔ ہوش آنے پر ایک ہندو لڑکی نے اسے بتایا..... "ائیرہوسٹس نرجا نے ہمت کرکے جہاز کا دروازہ کھولا تو ظالموں نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور اس کی لاش اسی دروازے سے باہر پھینک دی جو اس نے زندگی کے لئے کھولا تھا ..." جب اس عظیم اور فرض شناس لڑکی کی بے جان لاش بھارت لے جائی جا رہی تھی تو بلقیس بے پناہ روئی۔ اس نے "نرجا" کی تصویریں' ایک جانباز لڑکی کی علامت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں۔

مجھے دھڑا دھڑ موت کی دھمکیاں مل رہی تھیں اور کام میں ہر وقت مگن رہنے کے باعث' اپنے دونوں بیٹوں فیصل اور قطب کی دیکھ بھال بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ دونوں نے امریکہ میں کبریٰ کے پاس جانے کی خواہش کی تو بلقیس نے مخالفت کی ... مجھے ان کے امریکہ جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا' میری دلیل یہ تھی کہ جو معروضی حالات رونما ہو رہے ہیں' خدشہ ہے کہ قطب اور فیصل بھی ان کی رو میں بہہ نہ جائیں۔۔۔ کیونکہ رقیبوں کی نظر میں میرے دونوں بیٹے ہی ہدف تھے جنہیں نقصان پہنچا کر میرے مشن کے راستے میں کانٹے بکھیرے جا سکتے تھے۔

قطب نے امریکہ میں ایک کریانے کی دکان پر کام شروع کر دیا اور ہمارے یہاں کے جاننے والے افراد کے ساتھ ایک فلیٹ میں مشترکہ رہائش رکھ لی۔۔۔ فیصل بھی اورلینڈو میں میرے ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں جا کر رہنے لگا' جہاں زیادہ بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگ رہتے تھے۔ وہاں گھروں کے مابین بھی اتنے فاصلے تھے کہ لوگ کم ہی ایک دوسرے سے ملتے تھے ... مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر دوست اور ان کی اہلیہ کی شفقت کے باوجود فیصل کو گھر کی یاد بے طرح ستا رہی تھی۔۔۔ وہ میٹھادر میں گلیوں کے مشاغل اور شور شرابے کو ترس گیا تھا اور رات بھر انہیں یاد کرکے روتا رہتا تھا۔ کسی مدرسے میں جانے سے پہلے گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹاتا اور شام کو کھانا پکانے کی مشق کرتا۔۔۔ رات کو ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھ کر

ٹیلی ویژن پر خبریں سنتا اور دستاویزی پروگرام دیکھتا۔۔۔ اور ڈاکٹر سے انگریزی زبان سیکھتا ... میں اور بلقیس یہ جان کر بہت ہنستے کہ حضرت یہاں سے تو امریکہ گئے تھے کہ وہاں شغل میلہ ہو گا لیکن افسوس کہ وہ تو انتہائی لائق فائق لوگوں میں جا پھنسے ... ہم دونوں لڑکوں کو اپنے یہاں سے کچھ بھی نہیں بھجواتے تھے۔ انہیں خودکفالت کی تربیت دی گئی تھی کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور اپنے وسائل میں زندہ رہنے کی عادت ڈالیں ... بلقیس اس وقت خوشی سے جھوم اٹھی جب قطب نے اسے فون پر بتایا ... "امی ... میں اپنی ساری بچت آپ کو بھجوا رہا ہوں۔"

ریل گاڑی میں ایک معذور اخبار فروش کی تصویر اتار کر میں نے ایک سرکاری اہلکار کو دکھاتے ہوئے تجویز دی کہ ... ہاکروں کو بھی کسی خصوصی درجے کے تحت لانے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ان کے اچھے کاموں کو سراہے ... معذور افراد سے بھی کہتا رہتا ہوں ... "اگر تم اپنے وجود کو خود سنبھالا نہیں دو گے تو کوئی دوسرا بھی تمہاری مدد کے لئے نہیں آئے گا۔" میں نے اپنے لڑکوں کو بھی سمجھایا کہ اچھے کاموں کو ہمیشہ دیر تک یاد رکھا جاتا ہے ... کچھ لوگ ابھی تک نہیں بھولے کہ آج سے تقریباً" نصف صدی پہلے میں نے کسی کی ماں کو عزت کے ساتھ دفنایا تھا۔۔۔ یا کسی کے باپ کی میت' عمارت کی پانچویں منزل سے اتار کر لایا تھا ...

1988ء کا وہ بدنصیب سال تھا جب راولپنڈی کا اوجھڑی کیمپ' نامعلوم وجوہات کی بنا پر بھڑک اٹھا۔۔۔ قیامت صغریٰ تھی کہ شاید وقت سے پہلے بپا ہو گئی تھی ... اطلاع ملتے ہی دس لاکھ روپے لے کر' راولپنڈی جانے کے لئے کراچی ائیرپورٹ پہنچ گیا ... ایک سکیورٹی گارڈ نے میرے بیگ میں پڑی ہوئی بھاری رقم بھانپ لی۔ مجھے ایک طرف لے گیا اور پوچھا ... "بابا' اتنی رقم کہاں سے لائے ہو؟" میں نے جواب دیا ... "گداگر ہوں۔۔۔ یہ روپے لوگوں نے مجھے بطور عطیہ دیئے ہیں۔" کافی لے دے ہوئی۔ آخرکار مجھے چھوڑ دیا گیا۔۔۔ راولپنڈی آکر دیکھا کہ دھماکوں سے بے پناہ جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔۔۔ کئی لوگ تو ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئے۔۔۔ گھر برباد اور لوگ سرگرداں۔۔۔ دھماکے شروع ہوئے تو معمول کے مطابق سکول لگے تھے ... ہراساں بچے ... حواس باختہ والدین' اپنے گھر کا پتہ دوسروں سے پوچھ رہے تھے ...! زمین و آسمان کے درمیاں شعلے۔۔۔ گاڑیاں چلاتے لوگ' فٹ پاتھوں پر

پاپیادہ پناہ کے لئے بھاگتے ہوئے بچے' پہلوؤں میں نوزائیدہ بچوں کو چھپائے بے بس عورتیں' سرکاری ملازمین' دکاندار' ٹھیلے والے' مزدور ــ کون تھا جو موت کو قریب تر نہیں دیکھ رہا تھا ــ یہ انتہائی گھمبیر اور عبرت آموز منظر تھا لیکن افسوس کہ ہم سے اس کے دیکھنے کا حوصلہ تک چھین لیا گیا تھا۔

ایدھی فاؤنڈیشن کے رضاکاروں کی فوج ہمہ تن مامور اور فرض شناسی سے بھرپور جذبات کے ساتھ زخمیوں' بم دھماکوں کے صدمات سے دوچار' خوفزدہ افراد اور زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اسلام آباد میں صنعتی نمائش کا پورا علاقہ ایک کیمپ میں تبدیل ہو چکا تھا...... میں نے ٹی وی انٹرویو میں کارکنوں کے پرجوش جذبہ اظہار کے بعد کہا...... "شاید آج سے میری ضرورت نہیں رہی۔" میرے ایک پرانے نوجوان رفیق کار ڈاکٹر قاضی تمام کاموں کی نگرانی کر رہے تھے۔

اوجھڑی کیمپ سانحہ میں جاں بحق ہونے والے بڑے لوگوں کی موت اخباروں' ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مشتہر کی گئی' سرکاری سطح پر ان کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا' تعزیت کے پیغام پہنچائے گئے ــ لیکن غریبوں نے جس گمنامی میں زندگی گزاری تھی' اسی بے نام حالت میں دفنا بھی دیئے گئے ــ جنرل ضیاء الحق نے سانحہ اوجھڑی کیمپ کی پاداش میں محمد خان جونیجو کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا ـــ واللہ اعلم

تنظیم کی وسعت نو سے متعلق بڑے بڑے منصوبے بنائے جانے لگے ـــ تمام صوبوں سے خطیر صدقات موصول ہو رہے تھے ـــ ایدھی مراکز کے سامنے صدقہ دینے والوں کی لمبی لمبی قطاریں دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ لوگوں میں خیرات کا شعور جاگ اٹھا ہے ــ کئی صاحبان ثروت نے تو اپنی زندگی میں ہی' حصے کی جائیدادیں خیرات کر دی تھیں۔ رسیدات پر عطیات کی واپسی کی یقین دہانی کے باوجود' کبھی کسی نے واپسی کا مطالبہ نہ کیا' سوائے ان بنگلہ دیشی مہاجرین کے جن کا سب کچھ لٹ گیا تھا ـــ

بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیاں اس بات پر حیران تھیں کہ کیا طریقے اپنائے گئے کہ ایدھی فاؤنڈیشن ایک انتہائی مستحکم اور قابل اعتماد ادارہ بن گیا۔ یہ معلوم کرکے انہیں اور بھی حیرت ہوئی کہ ہمیں کہیں سے بھی کوئی سرکاری یا نیم سرکاری امداد نہیں ملتی۔ جہاں بھی

جاتا' جو کچھ بھی کرتا' ایک کاروباری میمن ذہن' ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ـــ انہیں بتایا کہ محض نیکی اور شرافت ہی کسی کاروبار میں کامیابی کی ضامن نہیں' احتیاط' تجربہ اور لگن بھی ضروری ہے۔

ایک ایمرجنسی نمٹا کر میٹھادر واپس آ رہا تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑے پریشان ہجوم دیکھا ـــ پوچھنے پر بتایا گیا ..... "آج دوپہر سے پہلے ایک ماں اپنے دو بچوں کو کھیلتا چھوڑ کر ڈسپنسری میں دوا لینے گئی ــ کہ ایک بچہ گٹر میں گر گیا۔ بچے کے والد کوئی جج ہیں جن کے اثر و رسوخ کے باعث کافی لوگ بچے کو نکالنے میں لگے ہیں ــ دوپہر سے شام ہوگئی ہے' ابھی تو کچھ پتہ نہیں ــ" فوراً مرکز میں اطلاع دی کہ ضروری ساز و سامان لے کر امدادی پارٹی جائے حادثہ پر پہنچ جائے۔ خود مین ہول پر کھڑا ہوگیا اور دس قدم پیچھے ہٹ کر ایک جگہ نشان لگایا کہ یہاں سے کھدائی کی جائے ــ فرش کھودا گیا ــ خدا کی قدرت کہ لڑکا زندہ سلامت گہرے گٹر کی ایک جانب ہراساں کھڑا تھا ـــ باہر نکالا گیا تو سارے مجمع پر پہلے تو سکوت چھا گیا ــ پھر اچانک لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے ــ "ایدھی سائیں فقیر ہے ..... ایدھی زندہ باد۔" تمام ٹریفک رک چکی تھی' لوگ کاروں سے اتر اتر کر آتے اور عقیدت سے میرے ہاتھ چومتے ـــ ان ضعیف العقیدہ اور مصیبت کی گھڑی میں دور کھڑے تماشا دیکھتے رہنے کے عادی لوگوں سے کہا ..... "میں نہ تو پیر فقیر ہوں' نہ بزرگ۔ ایک عام آدمی ہوں جسے انسانی خدمت کا جذبہ گھٹی میں ملا ہے۔" سارا واقعہ گھر آکر بلقیس کو سنایا تو اس نے کہا ..... "وہاں لوگ تو اور بھی تھے لیکن بچے کو موت کے منہ سے زندہ نکالنے کی سعادت آپ کیلئے مقدر تھی ..... آپ گٹروں کے آقا جو ٹھہرے ....."

بلقیس کو دیکھا تو ایسے لگا کہ ان برسوں نے اسے کچھ زیادہ ہی متین بنا دیا تھا ـــ نہ وہ پہلے والی شوخیاں' نہ ہنسی مذاق ..... وقت' سب کچھ تبدیل کر رہا تھا۔ اس کی خاموشی بھی شفاف' پراعتماد اور فیصلہ کن ہو چکی تھی ــ لیکن اس کی مسکراہٹوں کے سدابہار رنگ کبھی دھندلے نہ ہوئے۔

..... داڑھی کی وجہ سے لوگ مجھے "مولانا" تو کہہ ہی رہے تھے...... پر اب میں "مولانا ابو" بن چکا تھا...... یہ سارے نام' میری خواہشات کے بغیر...... خود بخود وجود میں آچکے تھے۔ پتہ نہیں کیوں؟

باب نہم

مولانا ابو

1986ء میں فلپائن حکومت نے سماجی خدمات کے اعتراف میں' اپنے ملک کا سب سے بڑا اعزاز ..... "میگا سے سے" ..... مجھے دینے کا اعلان کر کے ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا..... بتایا گیا کہ یہ ایشین نوبل پرائز کے برابر ہے۔ فلپائن جا کر ایوارڈ وصول کرنے کے بارے میں بلقیس سے مشورہ کیا ..... "انعامات کا کیا ہے' ہم جس قدر کام کرتے جائیں گے' انعامات تو ملتے ہی رہیں گے"۔ لیکن بلقیس نے میرے خیالات سے عدم اتفاق کرتے ہوئے کہا ..... "آپ بھی عجب آدمی ہیں۔ جب بھی آپ کے کام کو قومی یا عالمی سطح پر سراہا جاتا ہے تو جھٹ منفی رویہ اختیار کر لیتے ہیں ..... یہ تو بڑی عزت کی بات ہے کہ ایک پاکستانی کو اچھے انسان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ اس سے انکار تو نہیں کر سکتے ..... اس کا تعلق صرف آپ سے نہیں' آپ کے وطن سے بھی ہے۔" میں چونکہ بلقیس کی اس فطری کمزوری سے واقف تھا کہ سیروسیاحت کا اسے بے پناہ شوق ہے لہٰذا مطمئن ہو کر خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

آخرکار ہم دونوں' کپڑوں کے دو دو جوڑے ساتھ لئے فلپائن چل پڑے۔ حسب معمول میں نے روایتی تھیلا کاندھے پر ڈالا اور ربڑ کے سلیپر پہن لئے۔ بلقیس نے بھی ضرورت کی چند اشیاء' پلاسٹک کی ایک ٹوکری میں رکھ لیں۔ میں نے کہا ..... "اپنے کچھ ڈھنگ کے کپڑے تو رکھ لو اور برسوں پرانا ہینڈ بیگ بھی بدل لو"۔ لیکن بلقیس نے صاف انکار کر دیا اور کہا ..... "میں تو وہی کچھ ساتھ لے جاؤں گی جو ہمیشہ یہاں بھی اٹھائے رکھتی ہوں۔ میرا شوہر دکھاوے کے لئے اپنا حلیہ تبدیل نہیں کرتا تو میں کیوں کروں؟"

فلپائن پہنچے تو دو سرکاری مہمانداروں نے امیگریشن کاؤنٹر پر ہمارا استقبال کیا۔ کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو ایک چاق و چوبند بینڈ' ہماری آمد کو نغمات میں ڈھال رہا تھا۔ ایک نوجوان فلپائنی گروپ نے پھولوں کے ہار پہنائے اور شاہانہ حکومتی گاڑی میں بٹھا کر فائیوسٹار ہوٹل کے پرکشش و آرام دہ کمرے میں ٹھہرایا۔ بلقیس کہنے لگی ..... "دیکھئے ..... باہر کے ملک نے ہمیں کتنی عزت دی ہے۔" پھر وہ اطلس و کمخواب جیسے

شفاف اور نرم بستر کو دیکھتے ہی اس پر دراز ہو گئی اور کہا ..... "زندگی بھر نہ سوچا تھا کہ سونے کے لئے اتنا گداز بستر بھی ہو سکتا ہے۔" بستر سے اٹھنے والی مہک نے اسے مدہوش سا کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں ہوٹل والوں نے سب جگہ گلاب کا چھڑکاؤ کیا تھا جس کے باعث چاروں اطراف مہک رہی تھیں۔ بلقیس نے کمرے میں موجود ہر شے کو بغور دیکھا اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ فرجوں میں پڑی بوتلیں' ڈھیروں اقسام کے چاکلیٹ' دمکتے فانوس' جھومتے پردے' آئینہ نما فرش اور کھڑکی سے لپکتے دلفریب مناظر..... بلقیس کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا ..... میں نے اس کے ردعمل سے کان اور آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانے میں کپڑے دھوئے اور انہیں سوکھنے کے لئے گیلری میں لٹکا دیا۔ ایک پاکستانی مہماندار نے بتایا کہ کپڑے دھونے کے لئے لانڈری موجود ہے' آپ نے یہ کیا کر دیا ..... جواب میں بلقیس نے ازراہ تفنن کہا ..... "ہم لوگ بانٹوا شہر کے علاقے دھوبی باڑہ کے رہنے والے ہیں۔ اپنے کپڑے اپنے ہاتھ ہی سے دھوتے ہیں۔"

شام آئی تو ایک فلپائنی لڑکی ہمیں ریہرسل کرانے گرینڈ ہال لے گئی جہاں انعامات کی تقریب منعقد ہونا تھی۔ وہاں چھ دیگر ممالک کی نمائندگی کرنے والے ڈاکٹرز' پروفیسر اور سماجی کارکن بھی موجود تھے۔ ہمیں سٹیج پر آویزاں بہت بڑے پردے کے پیچھے لے جایا گیا اور ہم سٹیج پر بلائے جانے کے لئے اپنی باری اور اپنے وطن کے قومی ترانوں کا انتظار کرنے لگے ..... ترانے کے اختتام پر ہر ایک ایوارڈ یافتہ کو ڈائس تک جانا ہوتا۔

ریہرسل کے بعد ہوٹل واپس پہنچے تو مہمانوں کے لئے انواع و اقسام کے کھانے دیکھ کر بلقیس ششدر رہ گئی۔ ایک ہی پلیٹ میں سلاد اور سبزیوں کو اس سلیقے سے سجایا گیا تھا کہ بلقیس بے اختیار مجھ سے سرگوشی میں کہنے لگی ..... "گھر جا کر خود بھی ایسی پلیٹ سجانا اور لڑکیوں کو بھی سکھانا چاہتی ہوں۔"

توپوں کی گھن گرج میں سلامی اور فلپائن کے قومی ترانے کے ساتھ تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ پاکستان کا قومی ترانہ بجایا گیا تو خوشی سے آنکھیں بھر آئیں۔ ان آنسوؤں میں پاکستان کی عظمت کا تصور بھی دمک رہا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی ایک ساتھ سٹیج پر گئے جہاں طلائی تمغوں کے ساتھ منیلا شہر کی چابی اور بیس ہزار ڈالروں سے بھی نوازا گیا۔

تقریب کے شرکاء کے سامنے میں نے اردو میں تقریر کی۔ مترجم ہمراہ تھا۔ میں نے

معزز سامعین پر اجتماعی سماجی بہبود کا اپنا مشن واضح کیا۔ پھر ایک معمولی انسان کی حیثیت سے اپنے اس عزم کا اظہار بھی کیا جس کے تحت پاکستان کو ایک فلاحی ریاست کے روپ میں ڈھلتے دیکھنے کے لئے ایک ایسا ملک جو تیسری دنیا کے لئے قابل تقلید ہو۔ بلقیس اور میں سٹیج سے اترے تو سارے مجمع نے کھڑے ہوکر تکریم و تحسین دی۔

اگلے روز وزیراعظم کوری اکینو نے تمام ایوارڈ یافتگاں کو اپنے محل میں ضیافت دی۔ بلقیس، آنکھیں چندھیانے والے فانوس دیکھ کر ایک بار پھر حیران ہوگئی اور دھیرے سے کہا ..... "لگتا ہے کہ ان فانوسوں کو آسمان پر چڑھ کر لٹکایا گیا ہے۔" وزیراعظم اکینو، بلقیس کو گھریلو حالت میں دیکھ کر حیران ہوئی ہوں گی اور اسے پلاسٹک کی ٹوکری اٹھائے عجیب سا لگا ہوگا کیونکہ جب تک تعارف نہیں کرایا گیا، وہ ہمیں مسلسل گھورتی رہیں۔

گھر واپسی سے پہلے ہمیں بنکاک کی شاہی ضیافت میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا، جس کا اہتمام تھائی لینڈ کے بادشاہ نے خصوصی طور پر کیا تھا۔ اس کی نوعیت بھی فلپائن میں دی گئی سرکاری دعوت جیسی تھی۔ ان مصروفیات کے بعد بنگلہ دیش پہنچے۔ ایدھی فاؤنڈیشن کا ڈھاکہ مرکز، تقریباً سارا سال سیلاب جیسی صورتحال سے دوچار رہتا۔ ہماری ایمبولینس گاڑیاں موجود تھیں۔ میں ڈھاکہ سینٹر کی کارگزاریاں چیک کرنے میں مصروف رہا اور بلقیس، موسم برسات کی معروف خشک مچھلی سے لطف اندوز ہوتی رہی جس میں سے کچھ اخبار میں لپیٹ کر اپنے ساتھ کراچی لے آئی۔ ہماری عدم موجودگی میں کام کے انبار لگ گئے تھے جنہیں نمٹانے کے لئے اضافی کاوشیں بروئے کار لانا پڑیں۔ بلقیس نے ساتھی کارکن خواتین کو سفرنامہ سنایا تو سننے والیوں نے اس داستان کو اضافے سے آگے جا سنایا۔ یوں سفرنامے کی حالت ہی کچھ اور ہوگئی۔

اسی سال آرمینیا میں آنے والے زلزلے کے دوران، فاؤنڈیشن کی کارگزاری کے صلے میں سوویت یونین نے مجھے امن انعام دیا۔

کبریٰ کو خدا نے ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام کاشف رکھا گیا۔ بلقیس نے بتایا کہ کریانے کی دکان بند ہونے کے بعد، الطاف ساحل سمندر پر ایک ریستوران میں گھونگھا مچھلی چھیلنے کا کام کرتا ہے۔ تھوڑا فکرمند ہوا لیکن بلقیس نے تسلی دی۔ تاہم محسوس کرتا رہا کہ کبریٰ اور الطاف کی زندگی میں کوئی نہ کوئی جھول ضرور ہے تاہم جو کچھ میرے اختیار سے باہر تھا،

اس کے بارے میں سوچنا لاحاصل تھا۔

ادھر، جنرل ضیاء الحق کے دور میں غیرسرکاری تنظیمیں پورے ملک میں خودرو پودوں کی طرح سر اٹھانے لگیں تو ان کے کارندے ہمارے پاس بھی آنے لگے۔ میں کسی ایسی تنظیم سے ربط و ضبط بڑھانا نہیں چاہتا تھا جس کا وجود عوام سے بالا تھا اور خطیر رقوم سے قائم دفاتر میں افسران کو بڑی بڑی تنخواہوں کے عوض بھرتی کرکے مراعات یافتہ کارندے بنا دیا گیا تھا ..... جو ہوائی سفر اور فائیوسٹار ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے۔ نیک مقاصد کے پیچھے خود نمائی کے عناصر دکھائی نہیں دیتے لہٰذا انہیں واشگاف کہہ دیا کہ فلاح و بہبود کے حوالے سے عیش و عشرت اور مقصد سے سچی لگن، دونوں ایک وقت میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ تو دو کشتیوں میں سواری کے مترادف ہے۔ جس شخص کے دل و دماغ میں کسی نصب العین کا جنون سما چکا ہو، ایسی غلطی نہیں کرسکتا۔

فاؤنڈیشن کی بقا کے لئے، اپنے خلاف گھات میں بیٹھے قبضہ گروپوں سے ہر لمحہ محتاط رہتا۔ اس طرح میری منزل مراد، اور بھی قریب تر ہوگئی۔ اس کے باوجود ہمیشہ چوکنا رہا۔ آج بھی اپنی کفایت شعار طبیعت اور سادہ مزاجی کے مقابلے میں مہم جو طاقتوں کو کارفرما دیکھتا ہوں ..... اگر میٹھادر آفس میں میری زندگی غیر محفوظ تھی تو میرا خاندان رابعہ ماں کے معمولی فلیٹ میں بھی محفوظ نہ تھا۔ حیرت ہے کہ اگر محروم لوگوں کی آخری قطار میں رہ کر بھی میں موت سے اتنا قریب تھا تو ..... یہ لوگ عیش و عشرت کی اگلی صفوں میں کھڑے ہوکر تباہی سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ یہ باتیں جب ایک ممتاز سماجی کارکن کے گوش گزار کیں تو سن کر تسلیم تو کیا لیکن اس کے بعد میرے دفتر کبھی نہ آیا ..... سوچا کہ اگر میں نے جوانی میں مخالفت کے باوجود اسے کھیل تماشا یا مشغلہ نہیں سمجھا تو اب بڑھاپے میں، اپنے نصب العین سے کیسے انحراف کرسکتا ہوں۔

زندگی کے ہر شعبے میں اکثریت نے ذاتی مفاد کے لئے دوڑ لگا رکھی ہے۔ سماجی کارکن بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انہوں نے سجے سجائے گھروں میں آسودہ زندگی اختیار کرلی اور مصیبت کے وقت خدمت پر کمربستہ ہونے کی بجائے، لمبی چھٹیاں لے کر بیرونی ملکوں میں جاکر داد عیش دیتے ..... وہ خود سوئے ہوئے تھے، بھلا دوسروں کو بیداری کا سبق کیا دیتے۔ کچھ لوگوں کی تمنا تھی کہ انسانی حقوق کے علمبرداروں یا سماجی کارکنوں کی حیثیت سے ان کی

عزت کی جائے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دولت و شہرت کے حوالے سے اپنی پہچان چاہتے تھے۔ جب کبھی بے معنی دستاویزات' تصاویر' اخباری تراشے اور پرائیویٹ اداروں کے دستور و منشور پر مبنی کتابوں سے لیس ہوکر میرے پاس آتے تو یہی کہتا ــــ "تم اپنی مدد آپ تو خوب کر رہے ہو' شاید یہی تمہارا مقصد بھی ہے للذا مجھ سے کیا مطلب ــــ میرے نزدیک تو ایئرکنڈیشنڈ دفاتر' شاہانہ ساز و سامان اور اندھے سرمائے کی بجائے صرف خیراتی کام ہے۔ جس طرح خوشامد وقتی طور پر مدہوش کر دینےوالا حربہ ہے' اسی طرح دولت و شہرت بھی کامیابی کی ضامن نہیں بلکہ سچا' کھرا اور بے غرض عزم و عمل ہی منزل تک پہنچنے کا حقیقی راستہ ہے۔"

ان لوگوں سے میری کوئی کاروباری رقابت نہ تھی ــــ لیکن مسائل کے ساتھ گہری وابستگی اور زندگی بھر کے تلخ تجربات نے مجھے ایک لحاظ سے تھکا دیا تھا۔ جب ان کے بے سر و پا منصوبے سنتا تو یہی کہتا ــــ "لوگوں کے پاس تو سفری وسائل تک نہیں' وہ آپ کی مجوزہ بلند و بالا عمارات تک کیسے پہنچیں گے ــــ یا پھر آپ ان کے لئے' قومی سطح پر کسی بڑی ٹرانسپورٹ کا انتظام کر دیں گے؟ ــــ پہلے آپ تنگ و تاریک بستیوں میں جاکر لوگوں سے خود ملیں۔ ان تک اپنی خدمات اور سہولتیں پہنچائیں ــــ محدود مہمات پر وقت اور سرمایہ نہ لگائیں۔ اس سے آپ کو اور دکھی لوگوں کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

کئی سماجی کارکن حضرات سے یہ بھی کہا ــــ "جب تک انسانی حقوق کا تذکرہ ڈرائنگ روموں تک محدود رہے گا' اس وقت تک بنیادی حقوق بھی نہیں ملیں گے ــــ آپ کن حقوق کی لمبی چوڑی فہرست اٹھائے پھرتے ہیں؟ ــــ آج کرۂ ارض پر انسانی زندگی کو جس بنیادی مسئلے کا سامنا ہے' وہ جینے کا حق ہے۔ اگر اسی کے وسیع و عریض بکھیڑوں کے بارے میں سوچا جائے تو شاید کچھ مثبت نتائج بھی نکل آئیں ــــ صحیح معنوں میں بہتری چاہتے ہو تو سیاست اور مذہب کا رخ فلاحی نظام کی طرف موڑ دو ــــ ورنہ سب بے سود۔"

ایک معروف سماجی کارکن نے اپنے کاموں کی تفصیل بتائی تو اس سے کہا ــــ "محدود پیمانے پر اقدامات سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ آپ کی توجہ اہم اور ضروری کاموں سے بھی ہٹ جاتی ہے ــــ اجتماعی کاموں میں صرف ایک ایمبولینس کی کارکردگی آپ کے سامنے ہے جو رنگ و نسل اور علاقے و قبیلے کی پرواہ کئے بغیر پلک جھپکنے میں جائے حادثہ پہنچ جاتی

ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہر سو دیہات کو ایک مرکزی کنٹرول اور نگرانی میں لانے کے لئے وائرلیس سسٹم فراہم ہو جائے۔ پھر ہر پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر مفت طبی سہولیات دستیاب ہوں گی ــــ جہالت ختم ہوگئی تو ہر مسئلہ آسانی سے حل ہو سکے گا۔ ابتدائی تعلیم دینے کا آغاز کیا تھا تو لوگ میرا مضحکہ اڑاتے رہے ــــ اب یہ عالم ہے کہ بہت سے پڑھے لکھے طالب علم اور اساتذہ' فاؤنڈیشن کے پلیٹ فارم سے ناخواندہ افراد کو لکھانے پڑھانے کے لئے تیار ہیں ــــ ارادہ یہی ہے کہ عنقریب پچیس' پچاس اور سو کلومیٹر تک اس' تعلیمی نظام کو پھیلا دیا جائے ــــ آبادی کنٹرول کرنے کے بعد دوسرا بڑا مسئلہ یہی تو ہے۔"جن غیرسرکاری تنظیموں کو حکومت امداد نہیں دے رہی تھی' تعداد میں کم اور غیرموثر تھیں ــــ دوسری جانب' صاحب ثروت سرپرستوں کا یہ رویہ تھا کہ جس تنظیم کے پاس کچھ کرنے کے منصوبے ہوتے' اسے مسترد کر دیا جاتا اور کبھی کبھار کہیں دیانت نظر آتی' اسے امداد کے قابل ہی نہ سمجھا جاتا ــــ صاف ستھری تنظیموں کا برا حال تھا اور انہیں چلانے والے کئی مخلص لوگ گھبرا کر میدان چھوڑ گئے ــــ ان میں سے اکثر نے بعد میں ایدھی فاؤنڈیشن کی معاونت کی ــــ

بڑے سرپرستوں کی نظر میں تھوڑی خیرات اور زیادہ ثواب ــــ کا تصور تھا۔ میرے حصے میں لوئر مڈل کلاس ہی آئی جو نیک مقاصد کے لئے کچھ نہ کچھ خیرات کرتی رہتی تھی۔ مجھے کوئی نہیں کہتا کہ کام کو بڑھایا اور نیٹ ورک کو وسیع کیا جائے ــــ کوئی شخص میری حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ آگے بڑھو ــــ ہم تمہارے ساتھ ہیں' بلکہ مجھے تو کم کام کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے ــــ "ایدھی صاحب' آپ کے پاس تو پہلے ہی بہت کچھ ہے۔"

چند معروف تنظیموں نے میرے خلاف یہ افواہ پھیلا دی کہ ایدھی بھارت اور اسرائیل کا ایجنٹ ہے ــــ وہ کسی امتیاز کے بغیر' سب میں گھل مل کے رہتا ہے ــــ بہت کچھ کہا گیا' کانوں سنی بے سروپا' بے بنیاد افواہیں ــــ چشم دید گواہ بن کر' پورے ملک میں پھیل گئیں۔ کچھ کارکنوں نے لوگوں سے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ تم ایسے شخص کی کیوں امداد کرتے ہو جس نے اپنا ضمیر تک نیلام کر دیا ہے۔ اپنے خلاف یہ سب کچھ سنا تو میں چیخ اٹھا ــــ "اگر ایدھی فاؤنڈیشن میری زندگی میں تباہ ہوگئی تو یہی لوگ کہیں گے کہ اب مددگار خدا کے بعد کون ہے ــــ"

ایک تقریب میں کسی بڑے صاحب نے کہہ دیا ـــ "ایدھی نے پیداگیری کی صنعت لگائی ہے۔" دوسری تقریب میں ایک سیٹھ نے یہاں تک کہا ـــ "ایدھی کو فاؤنڈیشن میں کام کرنے کا کوئی حق نہیں' کسی بڑے تجربہ کار سیٹھ' صنعتکار کو اس کا سربراہ ہونا چاہیے۔" اس پر سیٹھ کے حواریوں نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا کہ ایدھی فاؤنڈیشن کا صدر تو سیٹھ صاحب کو ہونا چاہیے۔

یہ سن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آئی اور کہا ـــ "جو صدر بھی مقرر کیا جائے گا' پہلے تو سب کچھ کھا جائے گا' پھر ایسا بھاگے گا کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا ـــ"

علماء سے کہا ـــ "مساجد کے ذریعے بنیادی مسائل حل کریں' بیت المال قائم کریں' شفاخانے' بیواؤں کے لئے حفاظتی مراکز' ایمبولینس گاڑیوں کے پوائنٹ' ہسپتال اور تعلیمی درسگاہیں بنائیں۔ مسجد سے ہر نسلی امتیاز سے بالا' عدل و انصاف عام کریں۔ افسوس کہ ہر شخص کی اپنی دنیا' اپنی سوچ' اپنے راستے اور اپنی منزلیں ہیں ـــ عام لوگوں کے پاس' رونے کے لئے آنسو بھی نہیں رہے۔"

سماجی کارکنوں سے کہا کہ حقوق العباد کا زیادہ سے زیادہ ابلاغ کریں۔ سیاستدانوں کو باور کرائیں کہ مصائب کا سیاسی حل یہی ہے۔

حالات کی سنگینی ـــ قدم قدم پر رکاوٹیں' حد درجہ کام ـــ اور وہ بھی داد و تحسین کے بغیر' ان سب باتوں نے جہاں میری مشقتوں کو دوچند کر دیا' وہاں میرے ساتھی بھی تیز ہو گئے ـــ مقصد کی تکمیل کے لئے کارکنوں' مزدوروں اور یونیورسٹیوں کے غریب طلباء و طالبات نے میرا ساتھ دیا ـــ وہ جانتے تھے کہ اس میں سب کی فلاح مضمر ہے۔

ایک مرتبہ' والدین اپنے گمشدہ بچے کی اطلاع دینے آئے تو ان کے پاس بچے کی تصویر نہ تھی ـــ میں ان سے کہنے پر مجبور ہو گیا ـــ "تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ اپنے بچوں کی ایک تصویر ہی گھر میں رکھ چھوڑو جبکہ تمباکو نوشی پر ہزاروں خرچ کرتے ہو۔" جب حکومت سے اجازت لے کر اس گمشدگی کی ٹیلی ویژن پر تشہیر کے لئے خود جا کر متعلقہ حکام کو کاغذات دیئے تو دیکھا کہ وہاں ایک اور معروف سماجی کارکن بھی کھڑے ہیں۔ کافی بحث کے بعد اشتہار ٹیلی ویژن پر آگیا اور آدھ گھنٹے بعد بچہ بھی ایدھی سینٹر پہنچ گیا ـــ لیکن اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہی صاحب جو ٹیلی ویژن سٹیشن پر سماجی کارکن کے روپ میں

ملے تھے' فاؤنڈیشن کے دفتر آن دھمکے اور درخواست کی کہ بچہ ان کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ اس کی گمشدگی کی ابتدائی اطلاع انہیں دی گئی تھی ـــ اشتہاری سبقت لے جانے کا رجحان کس حریصانہ حد تک آگے بڑھ گیا تھا۔

اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ساتھیوں سے کہا ـــ "ہمیں ادارے کو استحکام دینے میں چالیس برس لگے ہیں اور اب کہیں لوگوں کو احساس ہوا ہے کہ ہم تسلی بخش نتائج دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر جمعہ جمعہ آٹھ دن ـــ کی زندگی کے حامل ان اداروں کو امید اور شعور کو درہم برہم کرنے کا موقع فراہم کر دیا گیا تو لوگ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے ـــ فاؤنڈیشن نے تو رنگ' نسل' قومیت اور جعلی نام و نمود سے ہٹ کر سماجی بہبود کے کام پر لوگوں کا اعتماد بحال کیا تھا۔ اگر آسودہ حال سماجی کارکنوں کو لوٹ مار اور شہرت کے لئے اس زمین کو استعمال کرنے کا موقع دیا گیا ـــ تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا اور ہمیں فلاحی کام کا نئے سرے سے آغاز کرنا ہو گا ـــ اگر دوسرے ادارے' اشتہاری مقابلہ کر رہے ہیں تو ہمیں اس جھمیلے سے باہر سمجھا جائے۔"

فاؤنڈیشن میں ذہنی معذور افراد کی بحالی کے لئے ایک جامع منصوبہ مرتب کر لیا گیا۔ سوچا کہ جب یہ لوگ پیدائشی بیمار نہیں ہوتے تو بے رحم بیماریوں کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں ـــ اس نتیجے پر پہنچا کہ ولادت کی غیر معمولی نوعیت' بخار کی شدت یا بچپنے کے ابتدائی دنوں میں ماں باپ کی وحشیانہ مار پیٹ سے' بچے خداداد ذہنی صلاحیتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ افسوس کہ لوگوں کے پاس اتنا شعور بھی نہیں ہوتا کہ بچوں کے ساتھ ان کا بے رحمانہ سلوک کیا نتائج مرتب کر سکتا ہے۔

کچھ والدین اپنے پریشان حال بچوں پر حکم چلا کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے جواب میں کوئی سمجھ داری کی بات کریں گے۔ انہیں مسلسل بدمعاش کہہ کر ـــ اور ان کی غیر معمولی حالتوں کو ڈرامہ بازیوں سے تعبیر کر کے' انہیں ہوش و حواس سے پرے دھکیل دیا جاتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں تو ایسے مریضوں کو رسیوں سے باندھ کر گھروں میں قید کر دیا جاتا ہے ـــ آزاد ہوں تو ہوا پھانکتے اور کیچڑ کھاتے پھرتے ہیں ـــ اور کچھ قابل علاج مریضوں کو بھی لاعلاج سمجھ کر برباد کر دیا جاتا ہے۔ گھر میں یہ حال اور باہر ہر شخص ان سے مذاق کرتا ہے' انہیں گالیاں دیتا ہے' مارتا ہے۔ یوں ان بے کسوں پر خدا کی زمین تنگ کر دی جاتی ہے۔

ایک ذہنی مریض کی دیکھ بھال' گھر کے سارے نظام کو متاثر کرتی ہے۔ اگر حکومت کا تعاون نہ ہو' جو اکثر صورتوں میں نہیں ہوتا --- تو لوگ جارحانہ اقدامات کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں --- دارالاماں ایک متبادل صورت ضرور ہے لیکن سرخ فیتے کی رکاوٹوں نے اسے بھی غریبوں کے لئے علاقہ غیر بنا کر رکھ دیا ہے---- لوگوں کے پاس اپنے معذور بچوں کو درگاہوں پر پھینک آنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ یوں بھی ہوا کہ لکھ پتی اولاد' اپنی بوڑھی ماؤں کو---- ناکارہ جان کر ہماری سیڑھیوں پر پھینک کر چلی گئی۔ الزام یہ تھا کہ --- گالیاں دیتی ہے' قالینوں پر تھوکتی ہے' ہمارا ڈرائینگ روم تباہ کر دیا ہے --- ہنگامہ کرتی ہے اور کسی کی بات نہیں مانتی ----!!

وہ افراد جو کئی سال پہلے اپنے پیاروں کو ایدھی مراکز میں چھوڑ جاتے' جانے سے پہلے یہ کہہ کر جاتے --- "اگر ہماری ضرورت ہوئی تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیے گا --- ہمیں فکر رہے گی۔" لیکن فکر تو کجا' بوجھ سر سے اچھی طرح اترا نہیں کہ منہ چھپائے ہمیشہ کے لئے سیڑھیاں اتر گئے۔ جب دیکھتا کہ میتوں پر مگرمچھ کے آنسو بہانے والے تجہیز و تکفین پر اٹھنے والے اخراجات سے جان چھڑاتے ہیں تو مرنے والوں کا کفن دفن خود ہی کر دیتا---- لواحقین آتے تو انہیں مطلع کر دیا جاتا پر ایسا کم ہی ہوا..... ان کو صرف وراثت میں چھوڑے جانے والے حصے میں دلچسپی ہوتی۔

مخالفین کے اس بے سروپا اور رسوا کن پروپیگنڈے نے بھی بہت پریشان کیا کہ ایدھی نامعلوم مقاصد کی تکمیل کے لئے فٹ پاتھوں پر سے نامعلوم اور بدکار عورتوں کو اٹھا لاتا ہے --- ایک صحافی نے اس بارے میں سوال کیا تو میرا یہی جواب تھا --- "میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ ان بیہودہ الزامات کا جواب دوں --- چاہو تو خود چھان بین کر لو --- ذہنی معذور عورتیں تو کرپشن کے قابل ہی نہیں ہوتیں۔ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ --- یہ تو بے حس مرد ہیں جو سڑکوں پر' انہیں جنسی مظالم کا نشانہ بناتے ہیں ---- فاؤنڈیشن نے تو ان ستم رسیدہ پاگل عورتوں کو درندوں سے بچایا ہے۔"

جہاں تک غیر مسلموں کی خدمت کرنے کا تعلق ہے تو --- کون سا دین ہے جو ناداروں کی ضرورتیں پوری کرنے کی ہدایت نہیں کرتا؟ کیا خدا' تمام انسانوں کا رب نہیں' کیا اسے صرف ایک طبقے تک محدود کر دیا جائے؟

آغاز کار میں' ذہنی مریضوں کے علاج سے متعلق بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مریضوں کی تعداد' "بفرزون" ایدھی مراکز کی گنجائش سے بھی بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ کراچی ہائی وے سے ملحقہ پینسٹھ ایکڑ زمین خریدی گئی جس کا نام --- "ایدھی ولیج" --- رکھا گیا۔ تمام بیمار مردوں کو یہاں منتقل کر دیا گیا --- اور "بفرزون سینٹر" کو صرف عورتوں کی پناہ گاہ بنا دیا گیا۔

زندگی میں جتنے کام کئے تھے ان میں مشکل ترین' ذہنی مریضوں کی دیکھ بھال تھی --- عقل و شعور سے محروم افراد' صفائی سے دور بھاگتے تھے۔ ان مریضوں نے بیت الخلاؤں تک کا استعمال چھوڑ رکھا تھا اور معذور عورتوں نے اپنے خصوصی ایام کے دوران ضروری حفاظتی اقدامات بھی ترک کر دیئے تھے --- ایسی حالت میں صفائی کا طبی معیار برقرار رکھنا نہ صرف محال بلکہ ناممکن بھی تھا --- نتیجے میں شدید خارش کے باعث' مریض عورتوں کے جسم زخموں سے چھلنی ہوگئے تھے۔ ڈاکٹروں کی تجویز کردہ دوائیں اور ٹیکے غیرموثر ہوگئے---- ہر نسخہ آزمایا گیا --- لیکن بے سود --- آخرکار گندھک اور کافور کا آمیزہ بنا کر اپنا پرانا طریقہ آزمایا جو کارگر ثابت ہوا----

پہلے ایک ہی وقت میں چالیس پچاس بچوں کو چھت پر جا کر نہلا دیا کرتا تھا۔ اب ہر جمعہ کو فجر کی نماز کے بعد' ایدھی گاؤں پہنچ جاتا جہاں بچے --- مولانا ابو' مولانا ابو! پکارتے میرا انتظار کر رہے ہوتے --- جونہی پہنچتا' باقاعدہ پٹاخوں کے ساتھ میرا استقبال کرتے---- بے پناہ خوشی ہوتی کہ یہ معصوم' بیمار اور معذور بچے دنیا کی ہر شے سے بیگانہ ہیں مگر میرا نام جانتے ہیں---- اس کیفیت کو کبھی کوئی نام نہ دے سکا --- بعض اوقات کچھ بچے' والہانہ مجھے بوسے دیتے' ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ اس کے ساتھ دوسروں جتنا پیار کیا جائے --- اور اتنا ہی پیار اس سے لیا بھی جائے --- وہ سب مجھ تک سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتے --- صورتحال قابو سے باہر ہو جاتی---- ان کی بہتی ناک' ٹپکتی رال اور خطرناک حرکتوں نے ہمیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیا ---

اپنے پائینچے کچھ اونچے کرکے' پرجوش اور ننگے بچوں کو ساتھ لئے نزدیکی کنویں پر جا بیٹھتا۔ ہنستے کھیلتے بچے باری باری میرے پاس آکر' ایڑیوں کے بل سر جھکائے کھڑے ہو جاتے اور میں پانی بھرے لوٹے ان پر ڈالے جاتا---- وہ پانی کی دھار سے بھاگتے بھی اور

بھاگ بھاگ کر اس کے فوارے تلے آکر بھیگنے کی کوشش بھی کرتے ---- جب پانی ان پر گرتا تو سانس کے رکنے اور رک کر پھر چلنے کا ایک چھوٹا سا لمحہ ---- سوچنے پر مجبور کر دیتا کہ اپنی زندگی کی انتہائی عاجزانہ عبادت کے مرحلے سے گزر رہا ہوں ---- محسوس ہوتا کہ خدا سے براہ راست رابطے کا ذریعہ' یہی تو نہیں؟

نہانے کے بعد بچے چھت پر چلے جاتے تو میں ظہر کی نماز میں مصروف ہو جاتا ---- میری حالت دیکھ کر بعض لوگ سوال کرتے ---- "آپ نے تو گندے بچوں کو نہلایا۔ آپ کے کپڑے گیلے ہیں ---- آپ کی نماز نہیں ہوئی۔" یہی جواب دیتا ---- کہ خدا سب کچھ جانتا ہے۔

ذہنی مریض بچوں کے ساتھ' قطاروں میں فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتا--- وہ جس انداز میں بھی کھاتے' انہیں کبھی نہ جھڑکتا ---- بلکہ خوش ہوتا ---- امریکہ اور یورپ کے ذہنی مریضوں سے متعلق ہسپتال دیکھنے کے مواقع ملے۔ پچاس مریضوں کے لئے پچپن افراد پر مشتمل سٹاف تھا لیکن رہائش' تازہ ہوا اور روشنی کے بغیر محدود پیمانے پر تھی۔ اسی کے پیش نظر "ایدھی ولیج" کی تعمیر میں خاص خیال رکھا گیا تھا کہ ہر طرف سے ہوا کی آمدورفت رہے۔ کھلے لان ہیں۔ مریض آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں۔ کیونکہ ذہنی معذور افراد کو وسیع و عریض جگہ اور مناسب خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جس کا کوئی متبادل نہیں---

ایک میٹنگ میں سپروائزروں کے سامنے ان مریضوں کے بارے' اپنا خیال پیش کیا کہ ---- یہ لوگ سڑکوں پر کھلے گھومنے پھرنے کے عادی ہوتے ہیں--- اگر انہیں یہ سب کچھ دے دیا جائے تو زیادہ نگہداشت کی ضرورت بھی کم ہوگی۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے "ایدھی ولیج" اور "ٹیفر زون" میں پانچ پانچ سو فٹ کے وسیع ہال بنوائے تو ان میں جاکر خوشی سے بچوں کے پاؤں نہیں ٹکتے تھے ---- بلقیس کی نگرانی میں' مستورات کے لئے غسل خانے' ایدھی گاؤں جیسے بنوائے گئے تھے۔ ان کی دیواریں اونچی کر دی گئی تھیں کیونکہ بعض ذہنی معذور بچیاں' برہنہ پھرنے کی عادی تھیں--- یہ سب کچھ ذہنی انتشار کے باعث تھا ---- بلقیس گھنٹوں ان کے درمیان رہتی--- ایک پنسل اور نوٹ بک ہر لمحہ اس کے ہینڈبیگ میں موجود ہوتی--- جس میں ضروری یادداشتیں لکھی جاتیں--- لڑکیاں ایک دوسرے کے خلاف شکایات بھی کرتیں جو اسے نوٹ بک میں درج کرنا ہوتیں--- وہ شادی

کے بارے میں خیالی محل تعمیر کرتیں۔ کوئی لڑکی بلقیس سے کہتی --- "فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں--- بلقیس' اگر آپ پسند کریں تو میں فلاں سے شادی کر لوں گی۔" بلقیس جواب میں سینکڑوں سوال کر ڈالتی کہ وہ کون ہے' کہاں کام کرتا ہے' تنخواہ کتنی ہے اور جب بلقیس اتفاق کر جاتی تو ساری لڑکیاں مل کر' شرم و حیا میں ڈوبی دلہن کو مبارک باد دیتیں ---

ایک خوبصورت عورت جو مناسب خاوند کے حصول میں ناکام رہنے پر مخبوط الحواس ہوگئی تھی' اعلان کر دیا ---- "میں سعودی عرب کی ملکہ ہوں' بادشاہ کل مجھے واپس بلوا رہا ہے--- وہ میرا انتظار کر رہا ہے"--- وہ خودساختہ پیغامات' اپنے تصوراتی بادشاہ کو بھیجنے کے لئے بلقیس سے خط لکھنے کا تقاضا کرتی تو وہ خالی کاغذ سامنے رکھ کر اس کی دلجوئی کرتی رہتی ---- ایک لڑکی کا خیال تھا کہ وہ دراصل فلم ایکٹریس ہے۔ یہ سن کر بلقیس حوصلہ افزائی کرتی ---- کہ اسے تو دنیا کی بہترین اداکارہ کا ایوارڈ مل چکا ہے ---- ساری لڑکیاں آگے بڑھ کر اسے پیار کرتیں ---- شاباش دیتیں ---- نعرے مارتیں اور نہ جانے کیا کیا ---- ایک اور ذہنی مریضہ کہتی کہ اس کے بچے ہیں جن کے لئے وہ اکثر تحفے تحائف بھیجا کرتی ہے۔ بعض تو یہاں تک اصرار کرتیں کہ بلقیس ان کی فیملی کو پیسے روانہ کرے ---- کیونکہ بچوں کی فیس پھر سر پر آگئی ہے ---- بلقیس جب کہتی کہ تم نے بچوں کے باپ کی موجودگی میں یہ بوجھ اپنے سر کیوں لے رکھا ہے..... تو عورت اپنے دکھوں کا ایک لمبا بکھیڑا لے کر بیٹھ جاتی۔ ایک عورت نے اپنا سارا سامان اٹھاتے اعلان کر دیا کہ میں اپنی فیملی سے جدا نہیں رہ سکتی--- گھر جا رہی ہوں ---- لیکن افسوس اس کا کوئی گھر نہ تھا اور اس کے تمام رشتے دار سیلاب میں بہہ گئے تھے۔

ایک عورت نے ایک بچہ گود لے رکھا تھا اور کہتی تھی کہ وہ اس بچے کی ماں ہے ---- ایسی ہی اور کئی کہانیاں' بلقیس کے اردگرد پھیلی تھیں --- اور اسے ان بے سروپا کہانیوں کے سارے کردار زبانی یاد تھے۔

بلقیس کے لئے مشکل تھا کہ وہ ان مریض لڑکیوں کو گھمانے پھرانے باہر لے جاسکتی اس لئے تفریح طبع کے لئے چار دیواری کے اندر ہی انتظام کر رکھا تھا --- ورائٹی شو منعقد کئے جاتے ---- ڈرامے ہوتے ---- یوم آزادی اور عیدوں پر پناہ گھر کا ہال باقاعدہ سجایا جاتا ---- خوشنما لباس پہن کر کیک کاٹے جاتے ---- سال میں دوچار مرتبہ انعامی تقریبات کا اہتمام کیا

جاتا ۔۔ ایک انعام ایسی جھگڑالو عورت کے لئے تھا جو جھگڑا نہ کرے ۔۔ ایک انعام تھا اس کاہل کے لئے جو مستعدی سے کام کر دکھائے ۔۔ ایک انعام تھا اس کے لئے جو صفائی کرے ۔۔ انعامات کی تقسیم اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے مظاہروں نے ماحول کو اس قدر خوشگوار بنا دیا تھا کہ سب لوگ گھل مل گئے تھے ۔۔ میرے لئے یہ مشاغل تازہ دم ہونے کا وسیلہ تھے۔

گھریلو ملازم عورتوں اور نوخیز لڑکیوں کی آبروریزی ۔۔۔ درگاہوں میں ان بے چاریوں کی عزت پر اجتماعی حملے ۔۔۔ اور اس کی پاداش میں رونما ہونے والے حیاسوز نتائج' ان مظالم کا مداوا حکومت کی ذمہ داری تھی ۔۔ لیکن کیا حکومت نے ان کی بحالی کے لئے کوئی پروگرام مرتب کر رکھا ہے؟ افسوس کہ اتنا نہیں۔

کچھ لوگوں نے ایک نیوز فورم میں میری تقریر سنی تو میٹھادر کے پتے پر تحریری فتویٰ بھیجا ۔۔۔ "آپ کے خیالات جان کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ مسلمان نہیں" ۔۔ میں نے اس مراسلے کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ چند روز بعد کچھ لوگ تبلیغ کرنے آن پہنچے۔

ایک مرتبہ' ایک مخالف سیٹھ کو کینسر ہوگیا تو اس نے بلوا کر اپنی چارپائی کے قریب بیٹھنے کو کہا ۔۔۔ کہنے لگا ۔۔۔ "جب کوئی سوئی' میرے گوشت میں چلی جاتی ہے تو میں اس کی چبھن سے چلا اٹھتا ہوں ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ گذشتہ برسوں میں تم نے کتنی اذیت سے دوچار ہوکر لوگوں کو سمجھایا ہے اور ان کے دکھوں کی مسیحائی کی ہے ۔۔ آج میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں تاخیر کی" ۔۔ میں نے سیٹھ کو بتایا کہ بابا یہ میرا نہیں' خدا کا کام ہے ۔۔۔ اگر حقوق العباد اور انسان دوستی پیش نظر نہیں تو پھر کیسا کام اور کہاں کا فائدہ ۔۔۔ ایک دوسرے سیٹھ صاحب نے مجھے گھر بلا کر کہا ۔۔ "ایدھی میاں' تم نے دوسروں کے راستے سے کانٹے ہٹاتے ہٹاتے اپنے پاؤں بھی زخمی کر لئے ہیں۔۔۔ یہ لو سوا لاکھ اور جا کے کچھ اپنے لئے بھی کرو ۔۔" لیکن میں نے یہ مالی امداد ۔۔ واپس کر دی۔

کراچی کے پرہجوم بوری بازار میں' یکے بعد دیگرے تین بم دھماکے ہوئے ۔۔ کوئی سرکاری ایجنسی اس آگ میں کودنے کے لئے تیار نہ تھی۔ فاؤنڈیشن کے رضاکار میرے ہمراہ اپنی جانوں پر کھیلتے ہوئے جا پہنچے۔ ہم سب ایک گلی میں بھاگتے جا رہے تھے کہ اگلی گلی میں

ایک اور زور دار بم دھماکہ ہوا۔ انسانی گوشت کے ٹکڑے ہوا میں بکھر گئے۔ کھڑکیوں اور بالکونیوں پر انسانی اعضا لٹک رہے تھے ۔۔۔ پلک جھپکنے میں کئی لوگ' زندگی بھر کے لئے بے دست و پا ہوگئے ۔۔ بھرے بازار میں مارے جانے والوں کو ان کے عزیز و اقارب کے آنے سے پہلے ہٹا دیا گیا۔ میٹھادر میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جن کٹے پھٹے اعضا سے علاقے میں تعفن پھیل رہا تھا' انہیں ایک اجتماعی گڑھے میں دفنا دینے کے احکامات جاری کئے گئے۔

آزمائش کی اس گھڑی میں کاروباری لوگوں نے موت کے خوف سے اپنی دکانیں بند کر دی تھیں۔ گھروں کو آگ کیا لگی' لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگیا ۔۔ یہ ایک عبرت انگیز منظر تھا ۔۔۔ لیکن میں سب کچھ دیکھنے پر مجبور تھا۔

پاکستان کی سیاسی زندگی کے اکتا دینے والے دور کو 1988 میں اچانک ہوائی حادثے نے ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا ۔۔۔ جنرل ضیاء الحق اپنے کئی شہرت یافتہ جرنیلوں سمیت جاں بحق ہوگئے۔ مجھے بے حد دکھ ہوا۔ سینٹ کے چیئرمین غلام اسحٰق خان نے صدارت کے اختیارات سنبھال لئے اور عام انتخابات کے نتیجے میں' نومبر 1988 میں بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم کا منصب مل گیا۔ بظاہر جمہوریت بحال ہو چکی تھی لیکن ۔۔ مارشل لا' اپنے پیچھے غیرقانونی اسلحہ' منشیات' افغان مہاجرین کی بے تحاشا آمد اور لسانی تعصبات جیسے مسائل بطور وراثت چھوڑ گیا۔

الیکشن کے دوران' واشنگٹن پوسٹ کی ایک خاتون وقائع نگار' میٹھادر میں میرا انٹرویو کرنے آئی ۔۔ اسے بتایا کہ ایدھی فاؤنڈیشن کے تمام مراکز' شب و روز کھلے رہتے ہیں ۔۔ وہ حیران ہوئی اور دوسرے مراکز میں فون کرکے میرے دعوے کی تصدیق کرلی ۔۔ اس نے بتایا کہ ایسا مکمل ادارہ تو امریکہ ہی میں ہے ۔۔۔ 115 کی طرح وہاں بھی فون نمبر 911 چوبیس گھنٹے موجود ہیں لیکن جواب دوچار گھنٹیوں کے بعد ہی آتا ہے ۔۔ خاتون صحافی ہمارے کام سے بہت متاثر ہوئی۔

سماجی بہبود کے کام کو وسعت دینے کے سلسلے میں ساتھیوں کی تجویز تھی کہ خدمات کا نیٹ ورک پورے ملک میں پھیلا دیا جائے ۔۔ اسے قابل عمل صورت دینے میں پندرہ سال لگے۔ ارادہ بنا کہ ہر پچیس کلومیٹر پر تقریباً پانچ سو ایدھی مراکز تمام بڑی شاہراہوں اور رابطہ سڑکوں پر تعمیر کئے جائیں ۔۔ ایک سرے سے دوسرے تک لوگوں کو ابتدائی طبی امداد کی تمام

سہولتیں فراہم کی جائیں اور حادثات سے متاثرہ افراد کو فوری طور پر ہسپتالوں تک پہنچایا جائے ۔۔۔ ان سرراہے مراکز میں گھڑی دو گھڑی ٹھہرنے یا رات بسر کرنے والے مسافروں کے لئے قیام و طعام کا مفت بندوبست ہو اور جہاں تعمیر نہ ہوسکے وہاں خیمے لگائے جائیں ۔۔۔ یہ باتیں سننے والے' ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ شاید انہیں یقین نہ آیا تھا لیکن اپنا تو یہی کام ہے جسے بہر طور تکمیل تک پہنچانا تھا۔

دوسرے مرحلے میں اس پروجیکٹ کو دیہاتی اور قصباتی سطحوں تک وسیع کر دیا جائے گا' جہاں ایمبولینس سروس بھی ہوگی' طبی سہولیات کے علاوہ معذور گھر بھی ہوں گے۔ ہر مرکز میں تین ایمبولینس گاڑیاں' چار بستروں پر مشتمل ہسپتال اور ایک ڈسپنسری ہوگی۔ تمام مراکز ایک دوسرے کے ساتھ بذریعہ وائرلیس مربوط ہوں گے۔۔۔ قومی سطح کے اس منصوبے پر اٹھنے والے تمام تر اخراجات کا تخمینہ لگا لیا گیا تھا ۔۔۔

بلقیس کی نگرانی میں' کراچی میں ایک بڑا نرسنگ سکول کامیابی سے چل رہا تھا۔ اس نے تجویز دی ۔۔۔ "مزید زچہ گھر نہ بنائے جائیں۔ بڑی بڑی عمارات کے خرچے ۔۔۔ چوری چکاری اور کاہلی کا تدارک بھی زیادہ سے زیادہ سٹاف رکھ کر کرنا پڑے گا جو کام بھی کرے اور نگرانی بھی ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ سختی کریں گے تو لوگ بھاگ جائیں گے ۔۔۔ جہاں کوئی گاؤں دو سے پانچ سو گھروں پر مشتمل ہے' میٹرنٹی کا کام' مقامی خواتین کو سکھا دیا جائے تاکہ وہ اپنے علاقے کی خدمت کر سکیں ۔۔۔"

ساتھیوں سے کہا ۔۔۔ "کراچی سے ملحقہ علاقوں میں' وہاں کی نوجوان لڑکیوں کو دایہ گیری اور نرسنگ کی ترغیب دی جائے گی کیونکہ بیشتر دیہاتی علاقے زچہ بچہ سہولیات سے محروم ہیں۔ بچے کی ولادت کے دوران کسی زچہ کی وفات افسوس ناک ہے۔ بلقیس نے کہا تھا ۔۔۔ "بعض اوقات انسانی تغافل کے باعث' لوگ موت سے پہلے مرجاتے ہیں" ۔۔۔ اس ضمن میں اتھل' تھر اور چولستان کے علاقوں میں پچیس' تیس برس کی خواتین کو نرسنگ ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے کہا جاچکا تھا۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے ساتھیوں کو بتایا ۔۔۔ "دیکھا جائے تو مجوزہ مراکز کے درمیان پچیس کلومیٹر کا فاصلہ ۔۔۔ امریکہ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ وہاں' ہر دس کلومیٹر کے بعد بڑی شاہراہ سے آپ جدھر بھی گھومیں گے' آپ کو ایک ہسپتال ملے گا ۔۔۔"

اب ماضی کے خدشات پر قابو پایا جاچکا تھا اور اس حد تک پختہ یقین حاصل ہوگیا تھا کہ درست سمت میں ایک قدم بڑھائیں گے تو خدا اسے دوگنا کر دے گا۔ ایسی صورت میں تعلیم' اثر و رسوخ اور سرمائے کی کمی آڑے نہیں آتی۔

اپنے چند ساتھیوں سمیت' بذریعہ ایمبولینس' کراچی سے روانہ ہوگیا۔ بیلا سے سوئی اور سوئی سے پاک افغان سرحد' ڈیورنڈ لائن کے مضافات سے ہوتا ہوا گلگت جاپہنچا ۔۔۔ پاکستان اور بھارت کے مابین متنازعہ برفانی چوٹی سیاچن گلیشیئر بھی دیکھی۔ یوں پورا ملک چھان مارا ۔۔۔ اور چائنا بارڈر سے سندھ کے وسیع و عریض صحرا عبور کرتا واپس آگیا ۔۔۔

سفر کا بیشتر حصہ دلچسپی سے گزرا۔ اس طرح انتظامی بکھیڑوں سے الگ تھلگ کچھ سوچنے کا موقع مل گیا۔ ماں کی وفات کے بعد سماجی بہبود کے متعلق ابتدائی سوالات کا جواب تلاش کرتا تھا ۔۔۔ اب عالمی تاریخ کے حوالے سے دیرپا منصوبے سامنے تھے ۔۔۔ جہاں جہاں اصلاح کی گنجائش تھی' وہاں خلاء پر کرنے کے نئے طریقے سوچتا رہا۔ گھر سے دور' وسیع فضا میں ذہن کھلتا گیا۔ خیالات کے ہجوم کے باعث ایمبولینس چلانا دشوار محسوس ہوا تو گاڑی ساتھیوں کے حوالے کرکے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔

اندرون سندھ کے دورافتادہ دیہات میں ۔۔۔ غربت و افلاس کے باعث' زندگی کی نعمتوں سے بے خبر' پھٹے پرانے لباس میں جھلسے ہوئے چہرے دیکھے ۔۔۔ لوگ سود و زیاں سے بے نیاز تھے۔ نادار زندگی نے ان سے فیصلے کا اختیار بھی چھین لیا تھا۔ سینکڑوں عورتیں اپنی کوکھ میں بچوں کی امانتیں اٹھائے' شدید محنت کرنے پر مجبور تھیں۔ مٹی گارے سے بنے گھر اور کمزور بوڑھے' دونوں ہی جیسے گرنے کو تھے۔ ہزاروں بھوکے ننگے بچے دیوانہ وار پھر رہے تھے۔ دو وقت کی روٹی کو ترستے لاکھوں انسانوں کو دکھ جھیلتے دیکھ کر ایسے لگا کہ ۔۔۔ یہ ان کا مقدر نہیں بلکہ نامہربان وقت کا ستم ہے۔

غیریقینی حالات میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا ۔۔۔ سیاسی ماحول بھی حساس ہوچکا تھا ۔۔۔ ان حالات میں تعمیرنو کے لئے فنڈ جمع کرنے میں مگن رہ کر' بدنامی اور عیب جوئی سے محفوظ رہا جاسکتا تھا ۔۔۔ چنانچہ اپنے آپ کو گاؤں گاؤں' شہر شہر میتیں نہلانے' کفنانے اور دفنانے میں مصروف کرلیا۔

ضروری ادویات سے لیس چھوٹے چھوٹے ایدھی مراکز پر دیہاتی مریضوں کا جمگھٹا

رہنے لگا۔ رضاکار ساتھیوں کو یہی سمجھاتا کہ وہ بھی سیاسی بحث و مباحثوں سے دور رہیں ۔۔ جاگیرداروں نے ناداروں کی خدمت کے اس عمل کو اپنے علاقائی وقار کے منافی جانا ۔۔ جانتا تھا کہ وہ اپنے ردعمل کا ضرور اظہار کریں گے۔ ابھی تو وہ مجھے ایک جذباتی ملنگ ہی سمجھتے ہیں جو چندے جمع کرتا ہے' فقیروں کی خدمت کرتا ہے ۔۔۔ اور میتیں دفناتا ہے۔ شکر ہے کہ شہروں سے پڑھ کر گاؤں آنے والے زمینداروں میں قدرے تبدیلی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شاید ہماری خدمات ان کی نظر میں قابل قبول ہو جائیں۔ یہ سوچ کر اپنا لہجہ دھیما کر لیا ۔۔ اس آس پر کہ لوگ خود ہی اپنے حقوق پہچان لیں اور ان کے حصول میں میرا ساتھ دیں۔

چھ ماہ کے دوران حیدر آباد' سکھر اور مورو میں مراکز کھول دیئے گئے۔ کام میں مزید وسعت کے لئے ملتان' رحیم یار خان' لاہور' فیصل آباد' گوجرانوالہ اور پشاور کے مضافات میں دیہات سے قدرے دور عین قومی شاہراہ پر زمین حاصل کر لی گئی ۔۔۔ ہر مرکز کو ایک ایمبولینس دے کر ٹرانسپورٹ کے معاملے میں خود کفیل کر دیا گیا۔ کام کی رفتار اطمینان بخش تھی۔

توسیعی مراحل کے دوران کئی افراد نے مالی امداد کی پیشکش کی۔ چند کے سوا' باقی نمائش کے خواہاں افراد تھے جن سے معذرت کر لی گئی ۔۔۔ اگرچہ میں' سرمایہ کاری کرنے والے افراد یا اداروں کی بے جا مداخلت اور دیگر مشکلات سے پوری طرح آگاہ تھا تاہم چھوٹے موٹے قرضوں سے ادارے کو سہارا دینا بھی ناگزیر نہ سمجھا۔

ایک ہی ذریعے سے سرمایہ حاصل کرنے کی بجائے' لوگوں کے دلوں میں موجود جذبہ خدمت کو متحرک کرنا چاہتا تھا ۔۔۔ پاکستان کے بارہ کروڑ افراد سے ایک روپیہ ماہانہ لینے کو ترجیح دینا مناسب سمجھا۔

اندرون سندھ دورے میں' ٹھٹھہ سے ایک وفد ملنے آیا ۔۔ جس نے باور کرانے کی کوشش کی کہ ان کے علاقے میں بھی ایک ایدھی مرکز ہونا چاہیے ۔۔ ایک سال بعد کا وعدہ کیا گیا لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں خود وہاں کے حالات دیکھ کر فیصلہ کروں۔

طلوع آفتاب سے پہلے' خشک اور اجاڑ زمینوں میں سے سفر کرتے ہوئے دلفریب مناظر نے متوجہ کیا۔ ٹھٹھہ بستی کی حدود میں داخل ہونے سے چند لمحے قبل ایسے لگا کہ رات کے

اندھیرے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو ۔۔

گاؤں کے عین وسط میں گندے پانی کا ایک خوفناک تالاب تھا جس میں زمانے بھر کی غلاظت کے اردگرد' کچے گھروں کا ایک شہر آباد تھا۔ چلچلاتی دھوپ سے تالاب کی زہریلی بو ہر طرف پھیل گئی۔ تالاب کی سطح سے اڑ اڑ کر گھروں' گلیوں میں جا گھسنے والے مچھروں سے لوگوں کو ملیریا کے متعدی مرض کا ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا ۔۔۔ طبی سہولتوں کا دور دور تک نشان تک نہ تھا۔ درخواستوں کا ایک ڈھیر میرے سامنے لگا دیا گیا جن میں متعلقہ حکام' صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبروں اور وزیروں کے جھوٹے وعدوں سے لبریز جوابات گذشتہ چھ سال سے جوں کے توں پڑے تھے ۔۔۔ میں نے گاؤں والوں سے کہا ۔۔ "ایک شرط پر یہاں کام کرنے کو تیار ہوں ۔۔۔ کہ آپ سب لوگ حکومت پر بھروسہ ترک کر کے ہمارے شانہ بشانہ غلاظت کے ڈھیر اٹھائیں گے اور اپنے سارے معاملات خود حل کریں گے۔" انہیں میرے الفاظ کا یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ ان کے ذہن میں اپنی مدد آپ ۔۔ کا کوئی تصور سرے سے تھا ہی نہیں ۔۔

جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے والے ان زندہ ۔۔ لوگوں کی حالت زار دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھا ۔۔۔ "کیا آپ لوگوں نے کسی چیونٹی کو اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھا کر رینگتے ہوئے نہیں دیکھا جو بار بار گرتی ہے' اٹھتی ہے اور پھر گرتی ہے لیکن اپنی چیز چھوڑ کر ناکام واپس جانے کا نام نہیں لیتی اور آخرکار کامیاب ہو جاتی ہے ۔۔ لیکن سوچتا ہوں کہ تم لوگ کوشش کیوں نہیں کرتے ۔۔۔"

سوچا کرتا تھا کہ خدا جانے ٹھٹھہ میں میری کوششوں کا کوئی اثر ہوا ہوگا یا نہیں ۔۔ کچھ ماہ بعد جب میں ایدھی سینٹر کے افتتاح کے لئے یہاں آیا تو ایک عجب عالم دیکھ کر دیر تک مسکراتا رہا ۔۔۔ پچھلی مرتبہ آیا تھا تو اسے تاریکی نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا لیکن آج تو ہر طرف سے روشنی پھوٹ رہی تھی ۔۔۔ میں نے دیکھا کہ پورے قصبے میں صحت و صفائی کی ایک نویلی سوچ نے جنم لیا ہے ۔۔ زندگی کو اپنے معانی سمجھ آنے لگے ہیں ۔۔ میں نے دیکھا کہ کھیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ' نالیوں سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ہریالی نظر آنے لگی ہے۔ عورتوں نے دھوبی گھاٹ پر بڑے سلیقے سے دھوئے گئے کپڑے لٹکا رکھے ہیں۔ بچے کھیل رہے ہیں اور ان کے پاس بیٹھا ایک کتا بھی اپنی دم کے مور چھل سے

دائیں بائیں جھاڑو دیتا اور کبھی چپ سادھ لیتا ہے۔

لوگوں کو اجتماعی بہبود کی طرف متحرک کرکے ہی مفاد پرست عناصر کی کھڑی کی گئی رکاوٹیں دور کی جاسکتی تھیں۔ میٹھادر سے باہر جاکر سماجی اصلاحات کے کافی وسیع تر امکانات دکھائی دیئے۔

ساتھیوں نے کام کے حوالے سے کبھی میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ شاید اسی لئے جب انہیں سندھ میں ایدھی مراکز کی حد بندی کے لئے بلوایا تو انہوں نے میرے فیصلے تسلیم کئے۔ وہ سماجی بہبود کے وسیع میدان میں کام کرنے پر متحیر بھی تھے اور آمادہ بھی ..... چنانچہ اپنے کچھ روشن خیال دوستوں کی نواب شاہ' لاڑکانہ اور حیدر آباد میں تقرری کے بعد' بلوچستان کی طرف چل پڑا۔

ہمیں خبردار کیا گیا کہ اگر کسی بلوچ سردار کی گاڑی جا رہی ہو تو کسی ایمبولینس کی جرات نہیں کہ وہ کسی غریب کو اٹھائے' سردار کی گرد اڑاتی گاڑی سے آگے نکل جائے۔ کوئٹہ میں مجھے اغوا کرنے اور ایمبولینس چھین لینے کے اقدامات سے یہ کہہ کر ڈرایا دھمکایا گیا ..... "ایدھی صاحب' آپ چونکہ یہاں کے قبائل اور ان کے اثر و رسوخ سے واقف نہیں' اس لئے آپ کو اپنے کاروبار میں ایک مقامی شخص کو شامل کرنا ہوگا۔"

بلوچستان سے ایک میت لے کر سکھر جا رہے تھے تو ہماری ایمبولینس اغوا ہوگئی--- قبیلے کے سردار سے شکایت کی گئی۔ کہا کہ ایمبولینس کل صبح تک واپس کر دی جائے ورنہ لوگوں پر اجتماعی جرمانہ ڈال کر انہیں نئی ایمبولینس خرید کر دی جائے گی ..... تاہم مطلوبہ ویگن عین مقررہ وقت پر ہمیں واپس کر دی گئی۔ بعد میں ایک معزز پارسی نے پورا ایک گھر فاؤنڈیشن کو عطیے میں دے دیا۔ یوں ہم مقامی لوگوں کی کسی بھی ممکنہ دہشت گردی کے خوف سے آزاد ہوگئے۔

بلوچستان کے حالات دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ یہاں کے لوگ دھات اور پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں اپنی بنیادی انسانی ضرورت کا احساس تک نہیں ..... پبلک ٹرانسپورٹ کا نام و نشان نہ تھا--- لوگ دور افتادہ علاقوں سے میلوں پیدل چل کر' بیماروں کو کندھوں یا چارپائیوں پر اٹھا کر لاتے تھے ....

کوئٹہ سے پرے' میلوں کھلے میدان بے مصرف پڑے تھے جنہیں پہاڑوں نے سرحدی

دیوار کی صورت گھیر رکھا تھا۔ لوگ حد درجہ مفلس تھے۔ کہیں کہیں جھونپڑیاں بھی نظر آجاتیں۔ کیچڑ کی بنی ایسی ہی ایک کٹیا میں' ایک سنگدل شخص نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا اور اپنے دو سالہ بچے کو اس کی مقتولہ ماں کے قریب چھوڑ کر بھاگ گیا--- حیرت ہے کہ وہ بچہ اپنی ماں کی میت سے چپکا ..... تین روز تک بھوکا پیاسا زندہ رہا۔ اسے ایدھی سینٹر کوئٹہ لایا گیا ..... قتل و غارت کے یہ ہولناک واقعات' یہاں کا معمول تھے۔

بلوچستان میں خاصے لوگ خیرات و صدقات کے تصور سے قطعی بیگانہ تھے ..... انہیں خداترسی کا سبق پڑھانا بھی محال تھا ..... اس کے باوجود کچھ اساتذہ' ڈاکٹروں اور طلبا کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ گھر گھر جاکر' لوگوں میں سماجی بیداری پیدا کریں--- میرا خیال ہے کہ پورے پاکستان میں بلوچستان وہ واحد علاقہ ہے جہاں سماجی بہبود کے مراکز قائم کرنے میں ناقابل بیان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ملتان کا تاریخی شہر بھی کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔ جہاں کوئی شخص' سلام کا جواب بھی اجرت کے بغیر نہ دیتا تھا ..... اکثر لوگ منافع اور شہرت کے بھوکے تھے--- انہیں بھی ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے لوگوں کی طرح' غربت اور اخلاقی دیوالیہ پن کا سامنا تھا--- بالآخر ملتان میں بھی کام کا آغاز کر دیا گیا۔

سرائیکی پٹی کے لوگ بے حد نرم مزاج اور عاجزانہ عقیدوں کے حامل تھے ..... وہ پیروں' فقیروں اور صوفیا کو مبالغے کی حد تک مانتے تھے ..... میری درویشانہ شکل و صورت دیکھ کر ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ میرے پیروں تلے کی مٹی اٹھا کر آنکھوں کا سرمہ بنالیں لیکن کسی کار خیر کے لئے اپنی جیبوں سے دھیلا تک نکالنے کے روادار نہ تھے ..... ان لوگوں کو صدقہ و خیرات اور اس کی برکات کا کچھ احساس نہ تھا۔ پھر بھی محبت سے انہیں سمجھایا ..... "آپ جو ایک دوسرے کو جھک جھک کر ملتے ہیں' اس میں انسانیت کی کیا بھلائی ہے ....؟ میری تو اس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں کہ میں غریبوں کا خدمت گار ہوں--- اگر آپ میرا سنگ ساتھ چاہتے ہیں تو وہی کچھ کریں' جو میں کرتا ہوں۔"

ایک بار' ملتان کی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے طلبا سے تبادلہ خیال کا موقع ملا تو میں نے کہا ..... "مذہب میں انسانی حقوق کے لئے جدوجہد پر کوئی پابندی تو نہیں۔ اگر سفر کے دوران رونما ہونے والے حادثات یا مسمارشدہ عمارات میں سے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر

ہسپتالوں اور قبرستانوں تک پہنچانا جرم ہے تو کیا فٹ پاتھوں' جنگلوں' صحراؤں اور غیر آباد درگاہوں میں بھوکے ننگے لوگوں کو کھانا کھلانا بھی قابل سزا ہے؟ اگر مذہب نے ذہنی معذوروں اور درد سے کراہتے بیماروں کی دلجوئی سے منع کیا ہے تو میں پھر یہ کام بند کر دیتا ہوں ....."

پچیس کلومیٹر پروگرام ..... کے تحت قائم مراکز' ہیڈ آفس کی ہدایت پر کام کرنے لگے۔ پہلے مرحلے کا آغاز ہوگیا تھا اور دوسرے کا خاکہ ذہن میں تشکیل پا رہا تھا ..... ہم ہر سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گھر..... اور ہر بیس کلومیٹر کی مسافت پر' دیہات سدھار کے مراکز کھولنے کے لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔

ملک کے طول و عرض میں رواں دواں ایمبولینس گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو ہدایات دی گئیں کہ وہ جہاں ہیں اور جو کچھ بھی کر رہے ہیں' ایسے ذہنی معذوروں اور اپاہجوں کو اٹھائیں' جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ انہیں ابتدا میں' مقامی مراکز کے حوالے کیا گیا۔ پھر "اپنا گھروں" میں ٹھہرا دیا گیا جہاں بنیادی سہولتیں دستیاب تھیں۔

پاکستان بھر سے لائے جانے والے بے دست و پا اور مخبوط الحواس مریضوں کے ساتھ مختلف زخمی جانور بھی آنے لگے۔ علاج کے لئے حیوانات کے ماہر ڈاکٹروں کی خدمات لی گئیں اور چھوٹے چھوٹے باڑوں میں ان کے عارضی ٹھکانے بنا دیئے گئے---- جگہ کی قلت نے انہیں جلد آزاد کر دینے پر مجبور کر دیا---- بلقیس نے ایک زخمی بلی اپنے پاس رکھ لی۔ اس نے طے کرلیا کہ چار ایکڑ زمین پر بے سہارا جانوروں کے لئے دارالامان بنائے گی ..... میں نے بلقیس سے کہا ..... "لوگوں کے پاس جانوروں کے مسائل حل کرنے کے لئے بھی بے پناہ وسائل ہیں لیکن کوئی اس جانب توجہ نہیں دیتا۔" اس مقصد کے لئے صوبائی حکومتوں کو درخواستیں دی گئیں تاکہ کم قیمت پر پلاٹ خرید کر بیمار اور زخمی جانوروں کی بہبود کا مستقل بندوبست ہو جائے لیکن بس کاغذی کارروائی .....

عقابوں' چڑیوں' گدھوں' کتوں' بلیوں' گلہریوں' ہرنوں اور بندروں کو محفوظ جگہوں پر بساتے ہوئے ان کی نگرانی پر گونگے' بہرے اور معذور افراد مامور کر دیئے گئے کہ وہ بے زبانوں کا دکھ درد خوب جانتے تھے۔

دوسری جانب ثابت و سالم لوگوں کی حالت دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا کہ وہ ایک بیمار

اونٹ کا علاج کرنے کی بجائے اسے ذبح کرکے کھا لینا مناسب سمجھتے ہیں جبکہ کتوں' بلیوں اور خچروں جیسے جانوروں کو بغیر علاج مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا...... بوجھ اٹھانے والے جانور کو اس وقت تک استعمال کیا جاتا جب تک اس میں زندگی اور توانائی کی آخری رمق باقی رہتی۔ ہمارے سماج میں ایسا ہی ظالمانہ رواج صدیوں سے ہے۔

ایک روز سڑک پر' ان گنت سواریاں اٹھائے ایک تانگے کو جاتے دیکھا۔ آگے پسینے میں شرابور ایک گھوڑا گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔ سواریوں کا ہجوم تھا۔ ہاتھ چھت پر تو پاؤں پائیدان پر ..... بوریئے بسترے اور ٹین کے بکس' گھوڑے کی پیٹھ سے لیکر اس کی پسلیوں تک لٹک رہے تھے---- تھکے ہارے گھوڑے کی ڈگمگاتی چال دیکھ کر کوچوان کی وحشت میں یوں اضافہ ہوتا کہ چابک کی دست درازیاں گھوڑے کو لہولہان کر دیتیں۔ میرے لئے یہ صورتحال ناقابل برداشت تھی۔ تانگہ رکوا کر کوچوان اور سواریوں سے پوچھا ..... "کیا تم لوگوں نے کبھی ایدھی کا نام سنا ہے" ..... جواب تھا کہ جی ہاں ..... کچھ لوگوں نے میرے ہاتھوں کو اپنی محبت بھری گرفت میں لے لیا۔ میں نے کوچوان سے کہا کہ وہ گھوڑے پر سے سارا بوجھ اتار دے---- پھر مسافروں سے کہا ..... "تمہارے سلوک نے بے چارے جانوروں سے زندہ رہنے کا حق چھین رکھا ہے۔ یہ ظلم اور ناانصافی نہیں تو پھر اور کیا ہے؟"

اگرچہ میں نے تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی سب کچھ جاننے کا دعویٰ ہے تاہم تجربات نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی نظریاتی لگن کے لئے ضروری ہے کہ سچائی کو آزاد رکھا جائے۔ یقین ہوا کہ کم از کم تیس برسوں سے پہلے' ایک مثالی فلاحی ریاست کے لئے ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کی جاسکے گی۔ اس کے لئے لامحدود صبرو تحمل کی ضرورت ہے۔ خدا نے چاہا تو یہیں سے ایک ایسا اعلیٰ نظام زندگی رونما ہو گا جس کے فیض سے تیسری دنیا سمیت مختلف اقوام استفادہ کرسکیں گی۔ شاید اس طرح ہم عالمی اتحاد کی ایک جھلک دیکھ سکیں ..... ایک خدا ..... ایک نظام ..... پھر کوئی تنازعہ نہ رہے گا۔ جب تک زندہ رہا' اس فلاحی نظام کے لئے کوشاں رہوں گا۔ مرگیا تو پھر یہ میرا مسئلہ نہیں۔ خدا' میرے بعد ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو کھیتوں میں ہل بھی چلائیں گے اور اناج بھی خود ہی اٹھائیں گے۔

سوچتا رہا کراچی سے سیاچن تک' ملک میں آٹھ انتظامی یونٹوں کے ذریعے' دو سو پچاس

ایدھی مراکز کام کر رہے ہیں۔ قائد اعظمؒ کی جائے پیدائش "کھارادر" کو ان سب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تمام شہر اور ایمبولینس گاڑیاں، وی ایچ ایف اور ایچ ایف وائرلیس سسٹم کے ذریعے، مرکزی دفتر سے مربوط ہیں۔

ہر زون، ایک زونل ہیڈ کی نگرانی میں ہے۔ دیگر عارضی ٹھکانوں اور مراکز کی دیکھ بھال اسی کے ذمے ہے۔ ہر ہفتے کے آخر میں حسابات، سمری رپورٹوں اور اخراجات کے ووچر، زونل چیف کے دفتر سے ہیڈکوارٹر بھیجے جاتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ جانچ پڑتال ہوتی ہے اور ان تمام دستاویزات کا ہفتہ واری آڈٹ بھی ہوتا ہے۔

کام میں استعداد اور تاخیر کے خدشات کے پیش نظر چیکوں، گشتی مراسلوں اور دیگر کاغذات کی مراکز تک ترسیل کے لئے پرائیویٹ کوریئر سروس کی بلامعاوضہ خدمات حاصل کی گئی ہیں جبکہ پی آئی اے نے 250 گرام تک کے وزن پر فری پوسٹل سہولت دے رکھی ہے۔

چھوٹے سے چھوٹے عطیات بھی رسیدیں جاری کرکے وصول کئے جاتے ہیں۔ ایک رسید لوکل ریکارڈ میں رہتی ہے، دوسری ہیڈ کوارٹر، اور تیسری عطیہ دینے والے کے حوالے کر دی جاتی ہے کہ وہ اسے مرکزی دفتر کو پوسٹ کردے۔ اسی طریقہ کار سے ایدھی فاؤنڈیشن نے کرپشن پر قابو پایا ہے۔

عطیات بڑے ہوں یا چھوٹے ۔۔۔ انھیں باقاعدہ فاؤنڈیشن کے مقامی بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔ ان رقوم کو ان علاقوں کی بہبود پر خرچ کیا جاتا ہے جہاں سے حاصل ہوئی ہوں۔ مثال کے طور پر فیصل آباد کے مخیر افراد نے تین ایمبولینس گاڑیاں عطیہ کیں تو ان سے استفادہ بھی وہاں کے لوگوں نے کیا۔۔۔ خودکفیل مراکز، مالی طور پر کمزور مراکز کی امداد کرتے ہیں۔ اگر کچھ عطیات، جنس کی صورت میں آئیں تو انہیں گوداموں میں رکھ لیا جاتا ہے جو بعد میں، حسب ضرورت، باقی مراکز کو تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔

فاؤنڈیشن کے مراکز میں کام کرنے والوں کی تعداد اب بڑھ کر ہزاروں تک جا پہنچی تھی لیکن انتظامیہ پر اٹھنے والے اخراجات انتہائی کم تھے۔۔۔ جزوقتی ہوں یا کل وقتی ۔۔۔ خصوصی رضاکارانہ خدمات کی کئی صورتیں تھیں ۔۔۔ متعدد تنظیمیں، میڈیکل سپلائیز، تکنیکی مہارت، تعمیراتی انجینئرنگ، میڈیکل، قانونی اور مالی امور پر ہماری مددگار تھیں۔ ڈاکٹر اور دیگر

پیشہ ور حضرات بھی ہمارے پاس آتے تھے۔ جن ڈاکٹروں اور سرجنوں کے ذاتی کلینک تھے، وہ بھی معاونت کرتے۔ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لئے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں سے لوگوں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ ان میں کثیر تعداد کا تعلق نچلے یا درمیانے طبقے سے تھا۔

ہنگامی حالات کا تقاضا تھا کہ ایمبولینس گاڑیاں شب و روز متحرک رہنے کے لئے ہر وقت تیار کھڑی رہیں۔ اس مقصد کے لئے، انتہائی ہوشیار ڈرائیوروں کی ضرورت تھی۔۔۔ ایسے امیدواروں کو باقاعدہ ملازمت دینے سے پہلے، ان کی پندرہ روز تک سخت نگرانی کی جاتی۔ ہر ٹرپ کے بعد گاڑیوں کی چابیاں، کاؤنٹر پر جمع کرا دی جاتیں۔ اگلا ٹرپ درپیش ہوتا تو چابیاں دوبارہ ڈرائیوروں کے حوالے کر دی جاتیں۔۔۔ گاڑی چلائے جانے کے اوقات، پٹرول کا حساب اور دیگر کارگزاریوں پر نظر رکھی جاتی۔۔۔ اگر کسی کی خطا پکڑی جاتی تو اسے کوئی دوسرا موقع دیئے بغیر ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا۔ تمام ڈرائیوروں کو ابتدائی طبی امداد اور حادثے کی صورت میں زخمیوں کو سنبھالنے کی باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی۔

ایمبولینس چلاتے ہوئے اکثر میں اس فلاحی کام کے آغاز کو یاد کیا کرتا۔ بچپن میں آبائی شہر بانٹوا کے گلی کوچوں میں تیز پہیہ دوڑاتا ۔۔۔ وہی بھاگ دوڑ ایمبولینس کے وسیلے سے آج بھی جاری تھی۔

اب ایک غریب شخص کی "چھوٹی سی وین" ملک کے طول و عرض میں سرپٹ بھاگتی، پانچ سو ایمبولینس گاڑیوں کے ہمراہ رواں دواں تھی۔ اس کے باوجود ایمبولینس گاڑی کی افادیت ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھی۔ ایدھی ایمبولینس کی ہر جگہ موجودگی، بارہ کروڑ عوام کے لئے ایک کھلا پیغام بنی کہ وہ ہر حالت میں آپ کے لئے مستعد ہے۔

پی آئی اے کو تابوت لے جانے کے لئے بعض اوقات بے حد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔۔۔۔ جب ایک مقتول پولیس اہلکار کی میت کرائے کے جہاز پر فیصل آباد لے جانا پڑی تو میرے ذہن میں ہیلی کاپٹر سروس کے تصور نے پھر انگڑائی لی ۔۔۔ امکانی رپورٹ تیار کی گئی اور ماہر ٹیکنیکل سٹاف مامور کر دیا گیا۔ آخر کار ایک پائپر ائیرکرافٹ خرید لیا گیا۔ 1988 کے دوران پاکستان میں متعین امریکی سفیر نے ۔۔۔ یو ایس ایڈ ۔۔۔ کی وساطت سے ایک ہیلی کاپٹر پیش کیا۔ یہ عطیہ اس لئے قبول کیا گیا کہ غیر مشروط تھا۔

1988 تک لاوارث میتیں دفنانے کے لئے پاکستان کی سب سے بڑی تدفین سروس ۔۔۔

قائم کر دی گئی۔ ملک بھر کے بڑے شہروں کی بلدیہ عظمیٰ نے مرجانے والے بے نام و نسب افراد کو دفنانے کا سالانہ ٹھیکہ فاؤنڈیشن کو دے رکھا تھا۔ جو لوگ کفن' دفن یا تابوتوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے تھے' ان کے لئے فری سروس تھی۔ غیر مسلموں کی صورت میں' مقامی گرجاگھروں اور مندروں کی وساطت سے یہ کام ان کے مذہبی عقیدوں کے مطابق نمٹایا جاتا تھا۔ کچھ انتہا پسند عناصر نے اعتراض کیا کہ غیر مسلموں کو سروس کیوں دی جا رہی ہے۔ اس احمقانہ سوال کا جواب کیا دیا جاسکتا تھا ...... کیا آئندہ کوئی بچہ چھت سے گر کر مر جائے تو اسے اٹھانے سے پہلے اس کا مذہب پوچھنا ہوگا؟

1989 میں پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف نے مجھے ناشتے پر یاد فرمایا۔ ان کی بھیجی گئی گاڑی کی بجائے' اپنی ایمبولینس پر جانے کو ترجیح دی۔ وزیراعلیٰ نے میری باتیں پوری توجہ اور غور سے سنیں۔ میں پاکستان کو سماجی' فلاحی ریاست بنائے جانے کے امکانات پر بات کرتا رہا۔ ان کی مثبت سوچ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ممکن العمل تجویز دی کہ سیاسی نشوونما بھی فلاحی ریاست میں ہی ہوتی ہے اور قوم کی سلامتی و یکجہتی بھی سماجی بہبود کی مرہون منت ہے۔ بقاء کا یہی ایک راستہ ہے۔ ملکی افرادی قوت کو چھوٹی صنعتیں لگا کر بیروزگاری کم کی جائے۔ معیشت پر قابو پانے کے لئے روپے کی گردش کم کی جائے اور تمام تر کاروبار کے لئے "چیک" کا دستاویزی نظام رائج کیا جائے۔ میں نے وزیراعلیٰ نواز شریف کو یہ بھی بتایا کہ ماہانہ تنخواہ کی بنیاد پر ایک ہی شفٹ پر اکتفا کرنا' ترقی پذیر قوم کے مفاد میں نہیں۔ ترقی کیلئے ایک کی بجائے تین شفٹیں اختیار کرنا ہوں گی ...... ہم سب جانتے ہیں کہ صحت' ایک ناگزیر مسئلہ ہے۔ ہسپتالوں کی نسبت دیہی علاقوں میں' گھر گھر طبی سہولتیں پہنچانے کے لئے ماہر ڈاکٹروں' طبی عملے اور ادویات پر مشتمل موبائل ٹیمیں زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔ تمام خرابیوں کی بنیاد' آبادی میں تیزی سے اضافہ ہے۔ انہوں نے میری بات کو بے حد پسند کرتے ہوئے مناسب آدمی نامزد کرنے کی پیشکش کی اور کہا ...... "اسے سیکرٹری کے عہدے پر فائز کیا جائے گا اور فنڈز کا ڈھیر لگا دیا جائے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مداخلت نہیں کروں گا"---- میاں نواز شریف نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا ...... "ایدھی صاحب' آپ کی تجاویز پر ضرور عمل کرنے کی کوشش کروں گا ...... واقعی ہمیں فلاحی ریاست کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔" واپسی پر

اپنے ایک ساتھی سے کہا ...... "میری تجویز کے مطابق عمل کرنے کی توفیق و صلاحیت ہوئی تو اسی فیصد مسائل حل ہو جائیں گے۔"

خبر ملی کہ سندھ میں ایک ان جانی بیماری نے لوگوں کو ہراساں کر رکھا ہے۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے ضروری ادویات سمیت ڈاکٹروں کی ایک ٹیم روانہ کر دی گئی۔ جب یہ لوگ نواب شاہ سینٹر پہنچے تو بے پناہ ہجوم نے انہیں گھیر لیا۔ کارکنوں نے بذریعہ ٹیلی فون مطلع کیا کہ پانچ ہزار ٹیکے بھی کم نکلے---- مزید روانہ کئے جائیں---- فرانس سے ٹیکے' ہنگامی طور پر درآمد کرنے کا انتظام کیا گیا اور پیکٹوں میں بند کرکے بذریعہ پی آئی اے دادو' لاڑکانہ' شکارپور اور نواب شاہ روانہ کئے گئے۔

ایدھی فاؤنڈیشن نے سندھ میں تقریباً دس لاکھ افراد کو ٹیکے لگائے۔ میرا خیال تھا کہ قیامت کی اس گھڑی میں' حکومت کا کوئی کارندہ بھی آگے بڑھے گا لیکن شاید اس بار بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ ایدھی نے سب کچھ کر دیا ہوگا---- پھوٹ پڑنے والی اس بیماری پر فاؤنڈیشن کے لاکھوں روپے خرچ ہوئے۔ دو سو پچاس افراد لقمہ اجل بنے---- تاہم کارکن مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنی کوششوں سے' اس ناگہانی آفت کو پھیلنے سے روک دیا تھا----

1989 کے دوران مجھے نشان امتیاز سے نوازا گیا ...... اب بھی خود جاکر انعام وصول کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن بلقیس نے کہا ...... "ہمیں قومی سطح پر ایک اعزاز کی صورت میں تسلیم کیا گیا ہے تو کیوں نہ جائیں ...... ہماری تنظیم' حکومت سے اور کیا لیتی ہے۔" بادل نخواستہ اسلام آباد پہنچا ...... دراصل فاؤنڈیشن کی کامیابی ہی میرا انعام تھی۔

تھل کا صحرا' کئی سال سے پیاسا تھا ...... پانی کی ایک بوند کو ترسنے والے اس ویران خطے کو آفت زدہ علاقہ قرار دے دیا گیا۔ آخر لوگوں کو ایک ہولناک قحط نے آن گھیرا۔ بہت سے لوگ زندگی کی آس میں' میرپور خاص ہجرت کر گئے۔ رضاکاروں کے ہمراہ' امدادی سامان اور دوائیں لے کر میں بھی تھر پہنچ گیا۔ وہاں ایک ہفتہ قیام کیا' پینتیس ہنگامی امدادی مراکز قائم کئے اور واپس لوٹ آیا۔

کبریٰ پاکستان واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے دکھ پہلے سے بھی سوا ہو چکے تھے---- شاید کبریٰ کی یہ خواہش تھی کہ اس کا شوہر الطاف' میری پیروی کرے۔ میں نے

کبریٰ سے کہا — "اگر تمہیں میری تلاش ہے تو الطاف کو بتا دو کہ میں اسے خالی جیبوں، ٹوٹے دلوں اور خستہ جھونپڑوں میں ملوں گا۔"

طلاق کے متعلق میرا مخالفانہ رویہ، پرانے خیالات کی وجہ سے نہ تھا — لیکن اگر فریقین، مصالحت کے کسی بھی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر ہوں تو طلاق ہی آخری حل ہے — اس کے باوجود میں کبریٰ کی آئندہ زندگی کے دکھوں کے متعلق سوچ کر بے حد غم زدہ تھا۔ یہ مسئلہ مجھ پر سیاہ بادلوں کی صورت، محیط ہوتا جا رہا تھا — ہمارے گھروں میں منافقت کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن پھر بھی ہماری بچی — بکھر کر رہ گئی۔ سوچتا ہوں کہ بدقسمتی کے بادل کب چھٹیں گے اور کب میری بیٹی، ان دکھوں سے آزاد ہوگی۔

کراچی میں لسانی فسادات کے دوران، ایدھی فاؤنڈیشن کو نقصان پہنچانے کی ایک نئی مہم کا آغاز ہوا۔ اس مرتبہ، انسانی اعضا اور ہڈیاں برآمد کرنے کا شرمناک الزام لگایا گیا--- ہم جس گلی میں کھالیں لینے جاتے، مخالف عناصر نے دوچار کلاشنکوف بردار کھڑے کئے ہوتے جو ایمبولینس گاڑیوں کو الٹے پاؤں واپس جانے پر مجبور کر دیتے--- اس سے قربانی کی کھالوں کا سلسلہ محدود ہوگیا اور مستحق افراد بھی متاثر ہوئے۔

پھر جب کورنگی اور لانڈھی سے ایمبولینس گاڑیوں کو ہائی جیک کیا گیا تو ہم نے، یہ مسئلہ پریس کے سامنے رکھا — لیکن پریس کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ میں مختلف سیاسی لیڈروں سے اس بارے میں مدد چاہوں۔ میں نے رپورٹروں سے کہا — "میرا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے--- اگر وہ صرف افسوس کا اظہار کرتے ہیں تو اس مسئلہ پر مزید کیا بات ہوسکتی ہے —؟"

مجھے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں--- صحافیوں کے سامنے وضاحت کرتے ہوئے کہا — "میں بھی ہجرت کرکے آیا ہوں پر کسی بھی مذہب، انسان، عقیدے یا برادری کے خلاف کوئی تعصب نہیں رکھتا--- آج تک مخالفت کی تیز و تند ہواؤں میں بھی، اپنے نصب العین کے روشن چراغوں کو بجھنے نہیں دیا۔"

تشدد کے واقعات ایک عرصے سے رونما ہوتے چلے آ رہے تھے۔ کوئی شخص بھی ڈر کے مارے، آنکھوں دیکھے مظالم کی شہادت دینے کو تیار نہ تھا۔ مجرموں کو گرفتار کرنے کے سارے طریقے آزمائے جاچکے تھے — اوپر سے فون آتا کہ یہ ہمارا اپنا کیس ہے۔ ملزم کو

چھوڑ دیا جائے--- حالات و واقعات کی یہ سرکشی ہو اور قتل عام ایک کلچر کی حیثیت اختیار کرچکا ہو تو مدعی اور مدعا علیہ کی شناخت ختم ہو جاتی ہے--- اگر کوئی ملزم، پولیس کی گرفت سے زبردستی نکل بھاگتا تو پولیس اسے انتہائی بے رحمانہ طریقے سے قتل کر دیتی اور پریس نوٹ یہ جاری کیا جاتا کہ فلاں ابن فلاں — گذشتہ رات پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔

قبضہ گروپ عناصر، کھالوں کے کاروبار کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ جانوروں کی کھالیں قصابوں کے حوالے کر دیتے تھے — لیکن جب سے ہم نے ان کھالوں کی فروخت کردہ رقوم، کارخیر پر لگانا شروع کیں — دوسرے ادارے بھی کھالوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کے باوجود دیگر شہروں سے کھالیں ملتی رہیں — ساتھ ہی میرے خلاف الزام تراشیوں اور میرے راستے میں کانٹے بچھانے کا دھندا بھی جاری رہا--- کبھی زبان کا مسئلہ، کبھی خاندان کا مسئلہ--- کبھی مذہبی و سیاسی خیالات — یہ لوگ ان ہتھکنڈوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مال بنانے کے چکر میں تھے اور میں ان افواہوں سے نجات کی جنگ لڑ رہا تھا۔

چوالیس سالہ انسانی خدمات کو جھوٹے اور بے سروپا پروپیگنڈے کے ذریعے ہلایا جا رہا تھا۔ سماجی مشن کو تباہ کرنے کی منصوبہ بندیوں کے واضح اشارے مل رہے تھے۔

کوئی ضرورت مند اگر ٹیلی فون پر مدد کے لئے پکارتا تو میں اسے درپیش صورتحال سے آگاہ کرتا۔ معاملات قابو سے باہر ہوچکے تھے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میٹھادر آفس کو مقفل کر دیا جائے۔ آخر کار نڈھال ہوکر سہراب گوٹھ دفتر جاکر بیٹھ گیا۔

جو لوگ مجھے منانے اور میٹھادر واپس لے جانے کے لئے آئے، ان سے یہی کہا — "میں مستقبل کی روشنی تلاش کرتے کرتے تھک گیا ہوں--- نصف صدی سے گلیوں کی خاک چھان رہا ہوں--- آج مایوس ہوکر، تنہائی میں جا رہا ہوں — افسوس کہ اب یہاں مظلوموں پر بھی کسی کو رحم نہیں آتا۔"

رات کو ایک معاون کے ہمراہ بنچ پر بیٹھا تھا کہ دو سکوٹر سواروں نے آتے ہی کہا — "ایک غریب آدمی مرگیا ہے، اس کے گھروالوں کے پاس تکفین و تدفین کے لئے کچھ نہیں، ان کی مدد کریں۔" یہ سن کر ہم نے کفن سنبھالا اور ضروری سامان سمیت ایمبولینس میں بیٹھ گئے — ان میں سے ایک لڑکا تو گاڑی میں ساتھ بیٹھ گیا، دوسرا سکوٹر پر سوار ہماری رہنمائی

کرنے لگا۔۔۔ کچھ ہی فاصلے پر جا کر کہیں کھو گیا۔۔۔ ہمارے ساتھ بیٹھنے والے نے دھوکے سے کئی گلیوں میں پھرایا۔۔۔ آخرکار وہ بھی یہ کہہ کر وین سے اتر گیا ..... "آپ لوگ ادھر ہی ٹھہریں میں اسے ڈھونڈ کر لاتا ہوں ....." اسی دوران کچھ شبہ سا ہوا تو اپنے ساتھی سے کہا ..... "جونہی لڑکے واپس آئیں' میں ان میں سے ایک کے ساتھ گلے ملنے کے بہانے' اسے مارنا شروع کردوں گا۔" میرا دوست' میری اس اچانک تبدیلی پر حیران ہوا لیکن جلد ہی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ لڑکے سامنے آئے تو ہم نے ایمبولینس کی بھرپور روشنی سے ان کا استقبال کیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک کو اچک لیا' دونوں ہاتھ سختی سے مروڑ کر پیچھے باندھ دیئے۔ اس طرح وہ خنجر اس کے ہاتھ سے گر پڑا جو ہمیں ہلاک کرنے کے لئے لایا تھا۔

سڑک پر ٹیکسی اور رکشا ڈرائیوروں کی خاصی تعداد دوڑ کر ہماری مدد کو آئی اور ان سازشی آلہ کاروں کو مارنا شروع کر دیا۔

لوگوں نے رائے دی کہ پولیس رپورٹ کرائی جائے لیکن میں نے کہا ..... "انہیں چھوڑ دو' یہ بزدل ہیں' بھاگ جائیں گے اور مڑ کر نہ دیکھیں گے۔" بلقیس گھر میں بہت پریشان تھی۔۔۔ کہنے لگی ..... "ان کرائے کے قاتلوں کو کس نے بھیجا ہوگا؟ وہ شاید دوبارہ آئیں۔" بلقیس کے خدشات پر میرا یہی جواب تھا ..... "مصائب و مشکلات ہمیشہ کسی اچھے کام کو روکنے کے لئے آتے ہیں ..... ہم وقت ضائع نہیں کرسکتے۔ مناسب یہی ہے کہ دشمنوں کے لئے راستہ چھوڑ دیں اور بھول جائیں کہ انہیں کس نے بھیجا تھا۔"

اس واقعہ کے بعد' میرے لئے ضروری ہوگیا کہ اپنے حفاظتی اقدامات بھی کئے جائیں۔ کارگر طریقہ یہی تھا کہ تنظیم کے اندر کڑی نظر رکھی جائے ..... کارکن ساتھیوں کو اکٹھا کرکے کہا ..... "موت برحق ہے۔ وہ بخار کی حالت میں آئے یا جھگڑے کی صورت' کیا فرق پڑتا ہے ..... ہمیں ہر خوف سے بے نیاز' دکھی انسانیت کی خدمت پر کمربستہ رہنا ہے۔ اس کے سوا جینے کی کوئی راہ نہیں۔"

..... پیشہ ور گداگروں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ روپ بدل بدل کر بھیک مانگتے ہیں ..... درمیانی عمر کی ایک برقع پوش عورت اس انداز میں میرے پاس آئی جیسے اپنے گھر سے باہر اس نے پہلا قدم' آج ہی رکھا ہو ..... "میں چھ بچوں کی بیوہ ماں ہوں۔ وہ بھوکے ہیں۔

انہیں کچھ نہ ملا تو مرجائیں گے۔" ..... اس عورت کو ایک فارم بھرنے کو کہا تاکہ اسے سلائی مشین دی جاسکے۔ یہ سنتے ہی وہ غائب ہوگئی ___ ایک اور روتی ہوئی آئی ــ "آج صبح میری ماں مرگئی ہے۔ میرے پاس اس کے کفن اور میت کو گاؤں لے جانے کے لئے کچھ بھی نہیں۔" اسے فارم پر کرنے کو کہا اور کارکنوں کو ہدایت کی کہ کفن کا انتظام کیا جائے اور فوری طور پر میت کو اس کے گاؤں پہنچایا جائے۔ لیکن وہ بھی بھاگ گئی۔

ایک شرمیلا سا جوان دفتر میں آیا ..... "جناب' مجھے اپنی بہن کو دفنانے کے لئے کچھ رقم عطا کریں۔ وہ اپنے پیچھے' دس بچے چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئی ہے۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں ..... میری مدد کریں۔" میں نے اس سے کہا ..... "بیٹا' تم اس ایمبولینس میں بیٹھ کر جاؤ اور اپنی بہن کی میت سمیت تمام بچوں کو یہاں لے آؤ۔۔۔ ہم میت دفنا دیں گے اور بچوں کو "ایدھی ہوم" میں داخل کرلیں گے۔" لیکن وہ الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ پچکے ہوئے زرد گالوں پر بہتے آنسو لئے ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا ..... "ایدھی صاحب' میرا بچہ گاؤں میں بیمار پڑا ہے۔ اس کی دوا یا اسے اٹھا کر شہر لانے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں۔۔۔ مہربانی فرما کر میری مدد کریں۔" میں نے یہ سنتے ہی رضاکار ساتھیوں سے کہا ــ "ایمبولینس تیار کریں' اس آدمی کا شناختی کارڈ لے لیں اور اس کے ساتھ گاؤں جائیں۔" لیکن وہ آدمی بھی بھاگ نکلا۔ طرح طرح کے بے شمار واقعات ایدھی فاؤنڈیشن کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

ہزاروں کی تعداد میں بیکار اور نااہل لوگ اپنے دکھوں کی ہولناک کہانیاں سناتے اور جعلی پتے دے کر چلے جاتے ..... ان میں سے کئی ایک کو جھوٹی کہانیاں سنانے پر تھپڑ بھی رسید کئے اور کہا ..... "مجھے بتاؤ کہ آسانی کے ساتھ مل جانے والے اس پیسے کا تم اپنے آپ کو مستحق کیوں سمجھتے ہو؟ تمہیں اس مزدوری سے کون روکتا ہے جو تمہارا قرض بھی ہے اور فرض بھی ..... تمہاری آنکھیں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم جوا بھی کھیلتے ہو اور ہیروئن بھی پیتے ہو۔ تم غریب نہیں بلکہ کاہل اور دھوکے باز ہو ــ جاؤ اور باہر جا کر صفائی کرو۔ تمہیں اس کی جو مزدوری ملے گی اسی کو خیرات سمجھو۔" قریب ہی کچھ اور بھیک منگے بھی کھڑے تھے۔ میری یہ باتیں سن کر سارے بھاگ گئے۔

خیرات کی طلبگار خواتین کے لئے تجویز یہ تھی کہ بے روزگار عورتوں کو گھریلو ملازماؤں کی صورت میں باقاعدہ بھرتی کیا جائے۔۔۔ اس حالت میں وہ نہ تو خیرات مانگیں گی اور نہ

چوری کریں گی۔ یوں ایک باعزت زندگی گزارنے کے قابل بھی ہو جائیں گی۔ اکثر خیراتی اداروں سے کہا کہ ان لوگوں کو مناسب امداد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں سلائی کی مشینیں ادھار پر دی جائیں ..... حالت یہ ہے کہ مانگ کر کھانے کے عادی لوگ' مختلف ناموں پر آٹھ آٹھ مشینیں لے جاتے ہیں اور انہیں مارکیٹ میں لے جاکر فروخت کر دیتے ہیں۔

ایک عمر رسیدہ شخص نے دفتر آکر کہا کہ وہ ادارے کی کسی سولہ سالہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے---- میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا ..... "بھائی' تمہیں چاہیے کہ رشتہ اپنی برادری میں سے کرو" ..... لیکن وہ کہنے لگا ..... "میں صرف کسی بے سہارا لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں"---- میں نے کہا ..... "تم سے جو لڑکی بھی شادی کرے گی' وہ خود بخود بے سہارا ہو جائے گی۔" ..... یہ سن کر وہ شخص چپکے سے سیڑھیاں اتر گیا۔

کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ادارے میں کرپشن ہو رہی ہے۔ جانتا تھا کہ جب فاؤنڈیشن کے دفاتر کی تعمیر ہو رہی تھی تو یہ لوگ ہر چیز پر نظر رکھ رہے تھے۔جو الزامات لگ رہے ہیں' اب یہ تو محض ڈرامہ تھا۔ جو لوگ تنقید کر رہے تھے' وہ شاید چوروں اور بددیانتوں سے بھی تین گنا زیادہ چالاک تھے۔

1990 تک کئی ہزار کل وقتی رضاکار بھرتی کئے جا چکے تھے---- یہ ایسے فعال اور متحرک کارکنوں کی فوج تھی جو اپنی ذات کو مثال بنا کر سماجی بہبود کے نظریئے کو گھر گھر پھیلانے کے لئے آمادہ تھی ..... میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کی معاونت کے بغیر ادارہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا ..... ان کی کوششوں کا ثمر تھا کہ ایدھی فاؤنڈیشن کا نیٹ ورک' بیرونی ممالک تک وسعت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ لوگ جو کبھی سہارے کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے' آج خیرات پر جینے کی بجائے عزت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایدھی گھروں کے ان باسیوں نے تعمیراتی فنون' پینٹنگ' کمپیکل' الیکٹریکل' نرسنگ' کھانے پکانے اور مانیٹرنگ کے شعبوں میں نام کمایا۔

فیصل' اورلینڈو (امریکہ) سے گیارھویں گریڈ تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان آگیا تو ساتھیوں نے رائے دی کہ اسے ایک بڑے انگریزی سکول میں داخل کرا دیا جائے---- میں نے اجازت دے دی۔ چنانچہ میرے ساتھی اسے وہاں لے گئے---- فیصل

نے داخلے کا امتحان پاس کر لیا' لیکن سکول کی انتظامیہ نے خطیر رقم طلب کی۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا ..... "فیصل سے کہو کہ پڑھنا چاہتا ہے تو اپنا تعلیمی معیار محنت سے خود ہی بڑھا لے ..... "فیصل کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔

کبریٰ کے ہاں' دوسرا بچہ پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام بلال رکھا۔ بلقیس نے اسے گود لے لیا۔ پلک جھپکتے' ایک چھوٹا سا بچہ' میٹھادر آفس میں سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اسی دوران دفتر میں ایک لڑکا آیا اور جاوید کے نام سے اپنا تعارف کرایا---- یہ وہی جاوید تھا جسے ہم نے آج سے برسوں پہلے' بسم اللہ بلڈنگ کے ملبے سے شدید زخمی حالت میں نکالا تھا۔ ہمیں وہ وقت یاد آگیا جب دو یتیم بچے جاوید اور عمران' کچھ عرصہ ہمارے زیر کفالت رہے تھے۔ جاوید' بینک میں کلرک تھا---- اور آج میری بیٹی الماس کے ساتھ شادی کی تجویز لے کر آیا تھا۔

الماس ایک متحمل اور صابرہ و شاکرہ لڑکی تھی---- اس نے ہمیں کبھی کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ گھر کی چار دیواری میں وہ اپنی بہن کے بچے کھلاتی' کھانا پکاتی اور ہنستی کھیلتی رہی ..... حال ہی میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی ..... بلقیس نے جاوید سے کہا کہ وہ اسے دیکھ لے ..... جاوید نے نرمی سے معذرت چاہی کہ میں تو فیصلہ کر کے آیا ہوں ..... رابعہ ماں پانچویں حج سے واپس آئیں تو انہوں نے بھی اجازت دے دی ..... بلال کی آمد اور جاوید سے الماس کے رشتے نے گھر کو خوشیوں کا گہوارہ بنا دیا۔ خالہ نے مجھ سے پوچھا ..... "تمہیں پتہ تھا کہ جاوید کو نہیں بلکہ اپنے داماد کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ خدا نے اسے' تمہاری بیٹی کے لئے بچا لیا تھا---- کتنا اچھا لڑکا ہے جس نے ہمیں فراموش نہیں کیا۔" میٹھادر میں ہر شخص کی زبان پر یہی ذکر تھا ..... ڈھولکی ایک بار پھر آگئی اور شادی بیاہ کے گیتوں نے' خواب سچ کر دکھائے----

فیصل نے اعلان کر دیا کہ وہ امریکہ جا کر مزید نہیں پڑھ سکتا۔ کہنے لگا ..... "وہاں مجھے مضامین کو سمجھے بغیر رٹا لگانے کی عادت ہے۔ جو طالب علم بھی جواب میں طوطا کہانی لکھے گا وہ ٹھیک ..... باقی کام کی بات غلط ..... میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔" میں اور بلقیس' دونوں یہ سن کر پریشان ہو گئے---- اسے میری جانب سے انتہائی شدید رد عمل کا خدشہ تھا لیکن میں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ آخر فیصل' امریکہ میں قطب سے دوبارہ جا ملا۔

سانگھی ریلوے سٹیشن سے تقریباً" دو فرلانگ پرے ملتان سے کراچی آنے والی مسافر گاڑی' زکریا ایکسپریس تیز رفتاری سے جس ٹریک پر آ رہی تھی' اسی ٹریک پر پہلے سے کھڑی ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی۔ انجن سمیت گیارہ بوگیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئیں۔ میں جائے حادثہ پر تین روز تک اپنی تنہا انتظامی اور ہنگامی سوچوں کے ساتھ کام کرتا رہا۔۔۔ میرا دھیان' زندگی سے محروم ہونے والے ان تین سو تیس افراد کی جانب تھا جن میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ حسب معمول مرنے والوں کی لاشیں اٹھائی گئیں اور زخمیوں کو سانگھی کے نزدیک ہسپتالوں' سکولوں اور مسجدوں میں رکھا گیا۔۔ شدید زخمی چھبیس افراد کو ایدھی ائیر ایمبولینس کے ذریعے فوری علاج کے لئے کراچی روانہ کر دیا گیا۔ دریں اثناء عوام اور اخبارات میں افواہیں اپنے پورے زور پر تھیں۔۔۔ تخریب کاری اور سازش سے متعلق بیانات گردش کرتے رہے لیکن ہم ان باتوں سے بیگانہ ۔۔ امدادی کاموں میں مگن رہے۔

مجھے اور بلقیس کو پاکستان ٹیلی ویژن کے قومی نیٹ ورک پر ایک تعارفی پروگرام میں' مہمانان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا۔۔۔ ہال میں داخل ہوئے تو پروگرام کے حاضرین نے کھڑے ہوکر استقبال کیا ۔۔ اور تحسین و آفرین کی تالیاں ہمارے بیٹھنے تک گونجتی رہیں۔ اس سے پہلے اتنی عزت افزائی کا احساس نہ ہوا تھا۔۔۔ بلقیس نے مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا ۔۔ "آج آپ کو پتہ چلا کہ لوگ آپ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔" پروگرام کے میزبان نے بلقیس سے کہا ۔۔ "آپ ایدھی صاحب پر کوئی روشنی ڈالیں۔" بلقیس کا برجستہ جواب تھا ۔۔ "میں روشنی پر مزید روشنی کیا ڈالوں ۔۔!" ہماری شادی کے بارے میں پوچھا گیا تو بلقیس نے کہا ۔۔ "یہ تو ایک جوا ہے ۔۔ کوئی ہارتا ہے کوئی جیت جاتا ہے۔" پھر میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگی ۔۔ "میرے خیال میں یہ جوا' ہم دونوں نے جیت لیا ہے۔"

الماس کا ایک بچہ تھا جس کی محبتیں ساتھ لئے وہ جاوید کے ساتھ ایک عام گھریلو زندگی گزار رہی تھی۔ کبھی کبھار بچے کو' رابعہ ماں کے پاس چھوڑ کر' جاوید کے ساتھ گھومنے پھرنے چلی جاتی۔ الطاف امریکہ سے واپس آیا۔ اس نے اپنی پوزیشن واضح کرنا چاہی۔ اب اس کی شاید کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں حالات کی نزاکت سے آگاہ تھا ۔۔ میں نے کبریٰ

سے کہا کہ وہ اپنا بڑا بیٹا کاشف' الطاف کے حوالے کر دے۔۔۔ بلال دو سال کا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ وہ اپنی ماں ہی کے پاس' ہمارے ساتھ رہے گا۔

جو لڑکیاں شادی کے بعد اپنے نئے گھروں میں آباد و شاد ہو جاتی ہیں' ان کے لئے دوبارہ اپنے والدین کے زیر سایہ زندگی گزارنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ کبریٰ پر بھی یہ وقت بے حد گراں تھا۔ بعض اوقات اسے ہمارا طرز زندگی مختلف لگتا۔ شاید اس نے کبھی یہ بھی سوچا ہو کہ شوہر کے ساتھ اس کی زندگی' یہاں کی زندگی سے بہتر تھی ۔۔ کبریٰ پر جو قیامت گزر رہی تھی ۔۔ اس نے اسے اتنا دکھی کر دیا تھا کہ اس غم کا مداوا شاید آنسو ہی تھے۔ وہ اپنے ماضی' حال اور مستقبل کے دکھ سمیٹتی رہی۔ بلال زیادہ تر میرے اور بلقیس کے پاس رہنے لگا ۔۔ بلقیس نے ایک زخم خوردہ نانی کی حیثیت سے مجھے کہا ۔۔ "کبریٰ کی شخصیت بکھر چکی ہے' ڈرتی ہوں کہیں وہ نفسیاتی مریضہ نہ بن جائے ۔۔" میں بلقیس کے خیال سے متفق تو نہ تھا' پھر بھی تسلیم کرتے ہوئے کہا ۔۔ "اگر اس کا یہ حال میری وجہ سے ہوا ہے تو پھر ٹھیک ہے ۔۔ وقت بہت طویل نہیں ہوتا۔"



''شانہ بشانہ' قدم بقدم ..... ہم دونوں''



انسانی خدمات کے اعتراف میں' حکومت فلپائن سے ملنے والے ایوارڈ کے ہمراہ

باب دہم

.....وقت کم ہے

پاکستان کے شمالی علاقوں میں شدید بارشوں نے اتنی تباہی مچائی کہ ...... منگلا ڈیم بھی ہولناک سیلابی ریلے کی زد میں آگیا۔ دریا تو دریا' چھوٹے ندی نالے بھی آپے سے باہر ہوگئے۔ بپھری موجوں نے متعدد دیہات و قصبات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایدھی فاؤنڈیشن کے پچیس کلومیٹر پراجیکٹ کے مراکز' فوری امداد کو پہنچے۔ متاثرہ مقامات پر ضروری ادویات' پیرامیڈیکل سٹاف اور ماہر پیراکوں کی ٹیمیں مصروف عمل ہوگئیں۔ ایدھی ائیرایمبولینس بھی محو پرواز ہوئی۔ لوگ' درختوں' چھتوں اور ٹیلوں پر پناہ لئے ...... وقت کی چارہ سازیوں کا انتظار کرنے لگے۔ انسانوں اور مویشیوں کے مردہ اجسام' مسمار شدہ مکانوں کا ملبہ اور گھریلو سامان ڈوبنے لگا۔ کچے گھروں کا نام و نشان تک بہہ گیا تھا اور گھاس پھوس کی بنی جھونپڑیاں' تنکوں میں بکھر کر' سیلابی جھاگ کا حصہ بن گئی تھیں۔

اس قیامت خیز مرحلے پر' میری عدم موجودگی کے باعث' سارے آپریشن کی انچارج بلقیس تھی۔ اس نے بڑی تندہی سے امدادی کاموں کی نگرانی کا فریضہ ادا کیا۔ دیگر قومی ادارے بھی اپنا ریلیف' ایدھی فاؤنڈیشن کے ذریعے تقسیم کرتے رہے۔ رضاکاروں نے ایدھی ائیرایمبولینس اور گاڑیوں میں' پاک فوج کے ساتھ مل کر' مصنوعی جزیروں میں گھرے ہزاروں افراد کو اٹھا کر محفوظ مقامات تک پہنچایا۔ ایدھی ہیلی کاپٹر بھی قومی ٹیلی ویژن کے زیراستعمال تھے لیکن ...... سیلاب سے متعلق کسی بھی خبرنامے میں ایدھی فاؤنڈیشن کی خدمات کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اسی سال تنظیم کے بیورو اطلاعات نے انکشاف کیا کہ چولستان کے صحرائی علاقے میں چند انسانی جانیں' موت کی وادی میں گھر گئی ہیں۔ فوری طور پر امدادی کارروائی کے لئے رضاکار مامور کئے گئے ...... عجیب بات ہے کہ مقامی سطح پر متعین رینجرز اس واقعے سے لاعلم تھے اور فوجی کمانڈر نے تو یہاں تک کہہ دیا ...... "ہم نہیں جانتے تو ایدھی کو کیسے معلوم ہوگیا؟ کیا اس نے صحرا میں بھی ایدھی مرکز کھول رکھا ہے؟" ...... بہرحال ریت میں دھنستی ابھرتی وین' آگے بڑھتی چلی گئی۔ آخر ہماری قبیلے پر مشتمل بائیس افراد کی لاشیں' ریت میں

دبی ہوئی ملیں ...... ان میں مرد بھی تھے' عورتیں بھی اور بچے بھی ...... ان بدنصیب افراد کو فوری طور پر دفن کیا گیا۔ اس اجتماعی تدفین سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ بھارتی سرحد کے قریب' چنوں عاقل کے صحرا میں ایک اور قافلے کا پتہ چلا۔ سکھر سے ایک امدادی ٹیم' ہیلی کاپٹروں میں روانہ کی گئی۔ ادھر ایدھی ایمبولینس گاڑیاں ریت میں دھنس گئیں تو مجبوراً اونٹوں کا سہارا لینا پڑا۔ تند و تیز ہوائیں ریت کے بادل اڑانے لگیں ...... کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا ...... نہ ٹیلے' نہ افراد۔ سفر جاری نہ رکھا جاسکا اور ہم مایوس ہوکر واپس لوٹ آئے۔

غربت و افلاس نے بنگلہ دیش میں ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ...... کچھ بدقماش لوگوں نے جسم فروشی جیسا مکروہ دھندا اپنا لیا۔ ان کے پیشہ ور ایجنٹ' گاؤں سے سادہ لوح لڑکیوں کو روزگار' شادی اور بہتر زندگی کے سبز باغ دکھا کر سرحدوں تک لے آتے اور اندھیری راتوں میں' راجستھان اور تھر کے صحرا عبور کراتے۔ پاکستان کے شہروں کی روشنی میں پہنچ کر ان لڑکیوں کی آنکھیں کھلتیں تو انہیں عصمت فروشی پر مجبور کر دیا جاتا ...... جو بچ نکلتیں' ان کا ٹھکانہ یا تو جیل ہوتا ...... یا انہیں ایدھی مراکز میں پناہ' کفالت اور حفاظت میسر آجاتی۔ ایدھی فاؤنڈیشن کے زیرانتظام انہیں دستکاری اور دیگر ہنر سکھائے جاتے ...... ان کی مرضی کے مطابق شادیاں کرائی جاتیں یا بنگلہ دیش واپس بھجوا دیا جاتا۔

معروضی حالات اور مصروفیت نے میرے کھانے پینے کے اوقات بے ترتیب کر دیئے تھے۔ بریانی اور قورمہ جیسی پسندیدہ نعمتیں دیکھ کر بھی مجھے بھوک نہیں لگتی تھی۔ اردگرد پھیلی مصیبتوں نے کچھ ایسے الجھا رکھا تھا کہ کھانا پینا درکنار' کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔

دوران سفر ہمیشہ ایدھی مراکز میں ٹھہرتا ...... سبز چائے بنا کر' روکھی سوکھی کھا لیتا۔ کبھی گوشت کھانے کو جی چاہتا تو ابال کر چاولوں کے ساتھ لطف اندوز ہولیتا۔ بلقیس کھانے کے لئے اصرار کرتی رہتی۔ اسے مذاقاً" یاد دلاتا ...... "جو لوگ تبدیلی لانا چاہتے ہیں' انہیں بھوک بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔" یہ جواب سن کر وہ کہتی ...... "خدا کے لئے کہانیاں مت سنائیں' مجھے تو کھانا کھانے دیں۔" میں اپنی بات جاری رکھتا ...... "ہمارے لئے روشن مثالیں' ہمارے رہبروں نے چھوڑی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ دولت و ثروت سے بے نیاز تھے اور حضرت علیؓ ننگی زمین پر سوتے اور جو کی روٹی کھاتے تھے"۔

جس شہر میں بھی ہوتا' میری عادت تھی کہ صبح سویرے تمام ایدھی مراکز کے معاملات

دیکھتا۔ کراچی میں ہوں تو کسی فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ٹوکن فروخت کرنا معمول ہے۔ لوگ ہر روز میرا ہی چہرہ دیکھتے ہیں' شاید اسی لئے یہاں پذیرائی بھی قدرے کم ہے۔ البتہ دوسرے شہروں میں ہمیشہ نتائج بدرجہا اچھے رہے۔

سب جانتے ہیں کہ ایک خیراتی تنظیم بنانے اور گلی گلی جاکر چندہ مانگنے کے لئے کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے مجھے اعلانیہ فقیر تسلیم کرلیا جو نیک مقاصد کے لئے خیرات مانگتا ہے۔

ایک مرتبہ لاہور ائیرپورٹ پر' دو گھنٹے جہاز لیٹ ہونے کے باعث' وہاں موجود مسافروں سے بیس ہزار روپے کے عطیات جمع کئے۔ اکثریت نے دل کھول کر چندہ دیا' پر کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر منہ پھیرلیا۔ شاید وہ اپنی موت بھلا بیٹھے ہوں ـــ حالانکہ ہر روز دیکھتے' سنتے ہیں کہ اتفاقی حادثات میں کئی انسان اچانک مر جاتے ہیں ـــ اس کے باوجود بیشتر لوگ احساس نہیں کرتے ـــ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک پرامن سماجی و اقتصادی انقلاب رفتہ رفتہ پھیلتا چلا آ رہا ہے اور تیسری دنیا کے ممالک میں ایدھی فاؤنڈیشن کی کارگزاریوں کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں۔

وقت کے ساتھ' سماجی خدمات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ نوکر شاہی اور فاؤنڈیشن کے درمیان دوطرفہ تعاون و احترام کا احساس بھی بڑھنے لگا۔ مجھے علم تھا کہ سیاسی اجارہ داری' کرپشن' کم تنخواہ اور مہنگائی نے سرکاری ملازمین کے ہاتھ باندھ رکھے تھے تاہم ان میں نیکی کے جذبات بھی موجود تھے۔ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ انہیں انتظامیہ کے اہلکاروں سے کس طرح پیش آنا چاہیے ـــ "تھانے کا انچارج' آپ کی ظاہری حالت کے مطابق ہی سلوک کرے گا۔ اس کا سخت لب و لہجہ اور الفاظ دراصل ان حالات کی وجہ سے ہیں جن میں ہم سب رہنے پر مجبور ہیں۔"

سرکاری ہسپتالوں میں دوستوں اور رشتہ داروں پر خصوصی توجہ بھی کرپشن کے زمرے میں آتی ہے۔ ڈاکٹر نہ چاہنے کے باوجود بھی سفارش کا طوق گلے میں لٹکائے ہوئے ہیں ـــ میں انہیں الزام نہیں دیتا کہ قوم کا بنیادی ڈھانچہ ہی اسیر ہے۔ پرائیویٹ ہسپتالوں کے مقابلے میں سرکاری ہسپتال قدرے بہتر ہیں کہ وہاں کوئی بستر' مریض کے بغیر دکھائی نہیں دیتا۔

ایدھی فاؤنڈیشن ایک سیدھا سادا ادارہ ہے۔ یہاں کسی نوکرشاہی یا شان و شوکت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ایک اکاؤنٹینٹ بیٹھا ہے اور کوئی چپڑاسی نہیں ـــ حتیٰ کہ گھر سے بھاگے ہوئے کمسن بچے بھی اپنا کام خود کرنا سیکھ جاتے ہیں' بلکہ دوسروں کا ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ کام کا یہ انداز' پوری قوم کے لئے مثال بن سکتا ہے ـــ کئی مرتبہ سیاستدانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ـــ "ایک کلرک چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے بیوی بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑ جائے ـــ چاہے اس کے لئے اسے انتہائی بھیانک کرپشن ہی کیوں نہ کرنا پڑے ـــ لیکن اپنے بعد اگر اسے حکومتی بہبود کا کوئی ادارہ' محفوظ پناہ گاہ کی صورت نظر آئے تو پسماندگان سے متعلق اسے تفکرات نہیں رہیں گے۔"

ماضی میں تقریباً ہر حکومت کے وزیرخزانہ کو خطوط کے ذریعے مسلسل بتاتا رہا ہوں کہ ـــ "ایک ٹیکس چور کو ملکی خوشحالی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انتظامی امور میں غفلت کے باعث' چھوٹا سٹاف رشوت' ٹیکس چوری اور دیگر غلطیوں کا ذریعہ بن جاتا ہے جس کا سارا نقصان حکومت اور قوم کو ہی اٹھانا پڑتا ہے ـــ لہٰذا جو عناصر کرپشن میں ملوث پائے جائیں' انہیں فوری طور پر جبری رخصت پر روانہ کر دینا چاہیے۔ سرکاری دفاتر کا بھی یہی حال ہے ـــ کاغذوں کے ڈھیر تیار کیے جاتے ہیں۔ ملازمت' ضرورت کے تحت کی جاتی ہے' اصل کام سے کوئی واسطہ نہیں۔ انہیں ہر حال میں' مہینہ بعد طے شدہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ انہیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ غفلت کے باعث زیادہ سے زیادہ معطل کیا جائے گا' برطرف نہیں ـــ جبکہ ایدھی فاؤنڈیشن میں تو نالائق اور کام چور لوگوں کو فوری طور پر فارغ کردیا جاتا ہے۔

بلدیہ کے افسران سے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ کراچی میونسپل کارپوریشن' شہریوں کو اس بات کا پابند کرے کہ وہ اپنے گھروں اور دکانوں کے باہر کم از کم دس فٹ جگہ کی خود صفائی کریں ورنہ جگہ ضبط کرلی جائے گی۔ اگر میئر بلدیہ خود ان معاملات کی باقاعدہ نگرانی کریں اور غافل ملازموں کو معطل کر دیا جائے تو فرض شناسی کا احساس پیدا ہوگا اور شاید بہتر نتائج بھی سامنے آنے لگیں۔

ملک میں ٹریفک کا نظام ابھی تک صدیوں پرانے ایکٹ کے ذریعے چلایا جا رہا ہے جبکہ شہری آبادی اور گاڑیوں میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہے ـــ میں نے لندن میں دیکھا کہ غلط پارکنگ پر موبائل ٹریفک پولیس' فوراً جرمانہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح دیگر یورپی ممالک میں

کارپارکنگ کا معاوضہ لیا جاتا ہے لیکن ..... ہمارے ملک میں تو بھاری رشوت والی جگہیں ..... بھاری رقوم دے کر خریدی جاتی ہیں۔ جب تک ٹریفک ملازمین پر سختی نہیں کی جائے گی' وہ اپنے منصبی فرائض کو نہیں پہچانیں گے۔ انتظامی احکامات پر عملدر آمد کرانا' حکومت کی ذمہ داری ہے تو ..... اصلاح احوال کے لئے سزا کار آمد ثابت ہوسکتی ہے لیکن اصل اسباب کا سدباب نہ کیا جائے تو خرابی دور نہیں ہوگی۔ معاوضہ ..... یا انعام کچھ نہ کچھ تو بڑا ہی ہو گا۔

مزدور تنظیموں میں بھی کسی حد تک کرپشن داخل ہو چکی تھی۔ غرور' بیکاری اور کاہلی کے شکار یونین لیڈروں کو لالچ نے گھیر رکھا تھا۔ ان حالات میں غریبوں اور کمزوروں کا کون پرسان حال ہوگا۔ متعلقہ حکام سے کئی بار کہا ہے کہ کمپنی کو سرکاری تحویل میں لے کر یونین دفاتر بند کئے جائیں۔ اس بات سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ میں یونین سازی کے خلاف ہوں۔ مجھے تو بعض ایسے لوگوں سے اختلاف ہے جو یونین کے اغراض و مقاصد سے بیگانے ہوکر' تنظیموں کو کرپٹ اور سیاسی لیڈروں کا آلہ کار بنا دیتے ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ ہمارا ہر شعبہ ابھی تک نوآبادیاتی نظام کا تابع ہے۔ نہ جانے کیوں ہم برٹش انڈیا کا موازنہ اپنے ماضی' حال اور مستقبل سے کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ برطانوی سامراج کی جگہ ہم نے خودساختہ استعماری طاقتیں خود پر مسلط کر رکھی ہیں ..... انگریزوں نے کم از کم اپنی قوم کو دھوکا نہیں دیا ..... ہم نے انہیں اپنے ملک سے نکال دیا اور آزاد و خودمختار تو ہوگئے لیکن ان کے ہم پلہ نہ ہوسکے ..... پھر ان سے موازنہ کیسا۔

تمام مذاہب' فرقوں اور طبقات کو بہرحال اپنے عقائد کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ کسی کو بھی دوسرے کی مرضی کے لئے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ دوسروں کو جینے کا حق دے کر ہی آزادی کے فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ملکوں میں جہاں بھی گیا' انتہائی باصلاحیت افراد کو دیکھا لیکن ..... نہ تو انہیں مثبت انداز میں متحرک کیا گیا' نہ ہی مناسب استعمال ..... یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک شدید افرادی نقصانات سے دوچار ہیں۔ انسانی صلاحیت کے اس زیاں پر میرا دل دکھتا ہے۔ انسانی ذہن نے کیا کچھ نہیں ایجاد کرلیا ..... کمپیوٹر' ہوائی جہاز اور راکٹ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی گلی سے کوئی حیرت انگیز ایجاد سامنے آجائے اور زمین سے بڑے راز کھل جائیں۔ ہوسکتا ہے ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جو کینسر اور ایڈز کا علاج دریافت کر سکیں۔ دیکھا گیا

ہے کہ انسانوں کی کثیر تعداد غافل سوئی رہتی ہے اور ان میں سے ایک' انسانی ترقی کا کوئی بے مثال کام کر دکھاتا ہے۔

حالات و واقعات کا مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہوئے' کسی ممکنہ تباہی سے بچنے کے لئے ہی میں نے نظام تبدیل کرنے کا راستہ اختیار کیا تھا ..... اس ضمن میں سرکاری حکام سے بھی کہا کہ ..... "کسی عقلمند انسان نے یہ نہیں کہا کہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں' سرمایہ خودبخود آتا رہے گا ..... اگر چھوٹے ہوٹلوں اور ڈے کیئر مراکز میں ملازمت پیشہ لوگوں کے بچے' ضرورت مند خواتین کی نگہداشت میں دے دیئے جائیں ..... یا کاٹج انڈسٹری کا تیار کردہ سامان برآمد کیا جائے اور اپنی مدد آپ کے تحت خواتین کو یہ کام ٹھیکے پر دے دیا جائے تو ترقی و خوشحالی کے نئے راستے نمایاں ہوں گے۔ لالوکھیت' سیالکوٹ' ملتان اور گجرات میں اس قسم کی گھریلو صنعتیں بخوبی کام کر رہی ہیں اور حیدرآباد و لالوکھیت میں کانچ کی چوڑیوں کا کاروبار بھی خوب چل رہا ہے لیکن ..... سوال یہ ہے کہ حکومت اس بارے میں پہل کیوں نہیں کرتی۔

..... ایدھی فاؤنڈیشن نے بحری سروس کو بھی وسعت دے رکھی ہے۔ اس سلسلے میں ماہر غوطہ خور' لائف جیکٹ اور ٹیوبیں' نگران ٹاور ہاؤس کے حوالے کی گئیں۔ دریاؤں اور آبی ذخیروں میں سیلابی موسم میں کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے امدادی ٹیمیں روانہ کی جاتیں ..... خطرناک حالات میں گھرے بحری جہازوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے خوراک پہنچانے اور سمندر سے لاشیں نکالنے کے مکمل انتظامات کئے گئے ہیں۔ کئی مواقع پر جہاز رانوں اور مچھیروں نے یہ کہہ کر ہمارے حوصلے بڑھائے کہ ..... "آپ آگئے ہیں' اب ہمیں کوئی فکر نہیں۔ یقین ہے کہ مصیبت کے وقت ایدھی کی مدد ہمیں ضرور حاصل ہوتی رہے گی۔"

سمندری طوفانوں اور دیگر بحری مسائل کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ بیشتر سماجی تنظیموں کے ارکان نے اپنی رائے کا اظہار کیا ..... جبکہ میں نے کہا ..... "اگرچہ آپ کے مقالات' میری سمجھ سے باہر ہیں لیکن میری تجاویز بالکل سادہ اور قابل عمل ہیں۔ اگر ابتدائی مشکلات پر پہلے گفتگو کرلی جائے تو بڑے سے بڑا مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے ....."
نہ جانے کیوں سیمینار کے شرکاء میری اس بات پر ہنس پڑے' تاہم میں نے اپنی بات جاری

رکھی ...... "مغرب والے احمق نہ تھے کہ انہوں نے تیرنے کے لئے خصوصی لباس "سوئمنگ کاسٹیوم" متعارف کرایا۔ اس کا واحد مقصد' پانی کی گہرائی میں پیش آنے والی کسی بھی ہنگامی صورتحال سے بچاؤ ہے ...... ہمارے ہاں عجب تماشا ہوتا ہے کہ لوگ لمبے کرتے اور گھیرے دار شلواریں پہن کر جب پانی میں چھلانگ لگاتے ہیں تو لہریں' ان کے کپڑوں میں پانی بھر کے انہیں تیرنے کی بجائے ڈوبنے کے مواقع زیادہ فراہم کرتی ہیں ...... جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ... موت ہی ہوگا۔"

...... ایدھی انفارمیشن بیورو کو بذریعہ ٹیلی فون کہا کہ ...... "بیورو دفتر کے اوپر والے کمرے کو کنٹرول روم بناکر تمام ایمبولینس گاڑیوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ آئندہ رپورٹ وہیں جاکر کریں گی۔ آج کے بعد یہ "کنٹرول ٹاور" بھی کہلائے گا۔ اس سلسلے میں بیرون ملک قائم ایدھی مراکز کو بھی فوری مطلع کر دیا جائے۔" کارکن ساتھیوں کو آدھی رات تک ٹاور میں پابند رہنا پڑتا تھا۔ انہیں مزید ٹیلی فون لائنوں کی ضرورت تھی جو مہیا کر دی گئیں لیکن ...... دوسری جانب ایمبولینس گاڑیوں کی حالت خستہ تھی۔ جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ ڈرائیور' گاڑیوں کو پیشگی اجازت کے بغیر دوڑائے پھرتے ہیں اور ان بوگس پھیروں کو اپنے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے ...... یہ شواہد ملے تو سٹاف میں کمی کی گئی اور دس فیصد خستہ حال گاڑیاں' ضروری مرمت کے بعد فروخت کر دی گئیں ...... اس طرح فالتو اور بددیانت عناصر کی چھانٹی ہو گئی۔ اس مہم سے باقی بچنے والے فرض شناس ڈرائیوروں کے الاؤنس میں اضافہ کرکے ان کی مزید حوصلہ افزائی کر دی گئی ...... حقیقت یہ ہے کہ ایدھی ایمبولینس سروس' ستر فیصد گھاٹے پر چل رہی ہے تاہم یہ ہمارا خود اختیار کردہ اقدام تھا اور پہلے سے علم تھا کہ ہمارے علاوہ اس نقصان کو نہ تو کوئی کاروباری ادارہ اور نہ ہی حکومت برداشت کرنے کو تیار ہے' تاہم اطمینان تھا کہ انسانی بہبود کے حوالے سے یہ زیاں' پورا کرنے میں خدا اور اس کے دردمند بندے ہمیشہ ایدھی فاؤنڈیشن کو تقویت دیتے رہیں گے۔

بلقیس اور دیگر ساتھی کارکنوں نے میرے ساتھ دن رات اتنا کام کیا تھا کہ سب لوگ تھکن سے نڈھال ہوگئے ...... اب ہر طرف سے "آف ڈے" کے مطالبات آنا شروع ہوگئے۔ ایک کارکن نے یوں تبصرہ کیا ...... "اگر ہمارے حالات نہ سدھارے گئے تو فاؤنڈیشن میں کام کرنے والے مرجائیں گے یا پاگل ہوکر انہیں "ایدھی ولیج" میں داخل ہونا

پڑے گا۔" ایسی ہی احتجاجی صورت' ڈسپنسری کے آغاز میں بھی رونما ہوئی تھی ــ تاہم بعض رضاکاروں کے خیالات حیران کن بھی تھے اور حوصلہ افزا بھی۔ ایک قابل ذکر تبصرہ یہ تھا کہ ...... "ایدھی خود اتنا کام کرتا ہے کہ اس کی سخت گفتگو یا سرزنش محسوس نہیں ہوتی۔ شاید اس نے ہمارے دماغ دھو کر ہماری تمام سوچوں کا رخ ...... کام کی طرف موڑ دیا ہے۔" ایسے کارکنوں پر مجھے ہمیشہ فخر رہا جو سچی لگن سے انسانی خدمت کو عبادت کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ فاؤنڈیشن کے تقریباً تمام کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا اور بعض اوقات میت اٹھانے کا کام بھی دوسروں کو کہے بغیر خود ہی کرلیتا لیکن ہمیشہ اس توقع کے ساتھ کہ ...... ضرورت پڑنے پر سٹاف پہلے سے تیار ہوگا۔ ایسے ہی ہنگامی لمحات تھے جب مرکز کی دو لڑکیوں کو سکھر جیل میں اپنے قیدی باپ سے ملاقات کرنا تھی ...... ادھر ایک باپ اور بیٹے کو کراچی میں قتل کر دیا گیا تھا اور ان کی میتیں' سول ہسپتال لاڑکانہ پہنچانا تھیں۔ دو خواتین کو ہمراہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے پر تمام لڑکیاں خوفزدہ ہوگئیں اور ایک دوسرے کی منت سماجت کرنے لگیں کہ ...... "پلیز' تم جاکر سن لو۔" آخرکار ان میں سے ایک زیرلب دعاؤں کے ساتھ آئی تو میں نے کہا ...... "دایہ سے کہو کہ لڑکیوں کے ہمراہ ایمبولینس میں فوراً بیٹھ جائے۔" میتوں کے ساتھ تینوں بیٹھیں اور میں نے تیزی سے گاڑی چلا دی۔ مجھے جلد میٹھادر واپس آنا تھا۔

مسلسل پانچ گھنٹے گاڑی چلا کر دادو پہنچے۔ یہ علاقہ خطرناک ڈاکوؤں کے حوالے سے مشہور تھا۔ پیاس بجھانے ایک ٹیوب ویل تک گیا لیکن خواتین نے گاڑی سے نکلنے کی جرات نہ کی۔ رات بھر سفر جاری رہا اور صبح لاڑکانہ پہنچے۔ میتیں سول ہسپتال میں داخل کیں' خواتین کو کرایہ پر ایک کمرہ لے کر ٹھہرایا اور خود باہر جاکر گاڑی میں سو گیا۔

علی الصبح ہی میں نے انہیں جگایا۔ سہمی لڑکیاں وین میں سوار ہوئیں۔ ہم سکھر جیل پہنچے تو ڈیوٹی حوالدار نے چائے پیش کی۔ میں نے معذرت کر دی۔ وہ ایک طرف ہوا تو ایک لڑکی زہرہ نے اس سے کہا ...... "حوالدار صاحب' ہم بھوک سے مر رہے ہیں' کچھ کھایا ہے نہ ناشتہ کیا۔ اگر ایدھی نہیں پیتے تو یہ چائے ہمیں دے دو لیکن خدارا انہیں نہ بتانا ورنہ وہ ہمیں راستے میں ہی اتار دیں گے۔" لڑکیوں نے جیل میں اپنے باپ سے آدھ گھنٹے تک

ملاقات کرلی تو ہم واپس ہوئے اور اڑھائی بجے صبح گھر پہنچے۔

اگلے روز تینوں خواتین نے بلقیس سے شکوہ کیا ..... "سفر کے دوران ہمیں بھوکا پیاسا رہنا پڑا۔ صرف ایک بار کنویں کا پانی پلایا گیا۔ شاید ایدھی صاحب کو ہماری بے بسی پر پورا بھروسہ تھا۔"

جب کبھی لڑکیوں کو کسی ڈیوٹی کے لئے باہر لے جانے کو کہا تو سنتے ہی سب ادھر ادھر ہوگئیں۔ پوچھا کہ زہرہ کہاں ہے تو آواز آئی کہ بیمار ہے۔ اسی طرح ادارے کی تمام لڑکیاں' میرے ساتھ نہ جانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کرتیں۔ سب کی کوشش ہوتی کہ بلقیس کے ساتھ مارکیٹ یا کسی کام کو چلی جائیں۔ میں نے بلقیس سے رازدارانہ پوچھا ..... "تم راستے میں انہیں کیا کھلاتی ہو؟" جواب تھا ..... "میں صرف اتنا یاد رکھتی ہوں کہ جو میرے ساتھ چل رہی ہیں' ابھی زندہ ہیں۔"

ٹھٹھہ میں گدلے پانی کے باعث زہر گھروں تک پھیل گیا۔ بلقیس' خواتین کارکنوں کی ایک ٹیم لے کر ٹھٹھہ روانہ ہوگئی۔ دوائیں اور دوسرا ضروری طبی سامان پہلے ہی بھجوایا جاچکا تھا۔ بلقیس نے فروٹ اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی رکھ لیں۔ یہ لوگ راستے میں خوب کھاتے پیتے' ریڈیو پر گانے سنتے ٹھٹھہ پہنچے۔ وہاں قیامت برپا تھی۔ بیمار جسموں میں پانی ختم ہوچکا تھا۔ نیم جاں لوگ' چارپائیوں اور کندھوں پر ہسپتالوں میں لائے جا رہے تھے۔ خواتین رضاکار ٹیم نے قابل تعریف کردار ادا کیا۔ بلقیس کہیں آدھی رات کو گھر واپس پہنچی۔

ادھر' کبریٰ ..... ایک دائمی کرب سے گزر رہی تھی۔ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آ چلا تھا۔ غم و غصہ کے آثار مٹ رہے تھے جس کے باعث وہ اپنی ذات کے خول میں سمٹ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا کہ زندگی کے محاذ پر جنگ لڑتے' ہار چکی ہے ..... سیلاب کے دنوں میں کبریٰ نے سماجی کام میں جس تندہی کا مظاہرہ کیا تھا' اس کے پیش نظر بلقیس نے مجھ سے کہا کہ ..... کام کی دیکھ بھال کے لئے کبریٰ کو اعتماد میں لوں تاکہ وہ مصروف رہ سکے ..... مجھے ابھی تک اس کے سنبھلنے کا یقین نہیں تھا۔ بلقیس نے اسے مختلف ایدھی مراکز میں ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ اس دوران کبریٰ' نوجوان لڑکیوں کے مسائل میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

الماس زیادہ وقت گھر پر ہی گزارنا پسند کرتی تھی اس لئے کبریٰ کو اس کے مقابلے میں انتظامی امور کی زیادہ مہارت حاصل تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ اس کا مستقبل شاید ہمیشہ کے لئے ہمارے ساتھ وابستہ ہوچکا ہے۔

بلقیس نے بتایا کہ کبریٰ ایک اچھی منتظم ہے ..... کلفٹن سینٹر میں اس نے اوقات کار کا باقاعدہ شیڈول بنا رکھا ہے اور جائزہ لیتی رہتی ہے کہ معیار کے مطابق کام ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہر چیز اور ہر شخص اس کی نگاہ میں رہتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی غفلت کی اصلاح کرتی ہے اور معذور افراد میں بے حد ہردلعزیز ہے۔

بلال نے اب توتلی زبان سے باقاعدہ باتیں شروع کر دی تھیں اور ٹانگیں سنبھال کر چلنے لگا تھا۔ میں نے اسے اپنے وجود میں جذب کرلیا تھا اور اسے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ کام سے ادھر ادھر جاتا تو بلال ہر طرف تلاش کرتا رہتا کہ ..... نانا کہاں گئے۔ ہم ایک دوسرے کی اپنائیت اور دوستی سے سرشار تھے۔ میں جہاں بھی جاتا' اسے اپنے کندھوں پر لئے پھرتا۔ وہ اپنے ہاتھ' میرے گنجے سر پر رکھ لیتا اور اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں میرے سینے کی اطراف میں پھیلا لیتا۔ بعض اوقات وہ مجھے اپنی طرف کھینچنے کے کھیل میں مشغول ہو جاتا۔ دھوپ نکلتی تو میں اسے لے کر دفتر کے باہر بینچ پر بیٹھ جاتا اور صابن کی جھاگ بنا کر اس کے سارے بال صاف کرتے ہوئے' اپنے جیسا گنجا کر دیتا ..... اس کے بعد بڑی شان سے وہ اعلان کرتا ..... "دیکھو' میں ایدھی ہوں۔"

میٹھادر آفس میں اب بلقیس کی آواز کے ساتھ' بلال کی صدا بھی گونجنے لگی تھی۔ سب لوگ اس سے مانوس ہوچکے تھے اور ہم تو ایک دوسرے سے جدا ہونے کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے۔ وہ ہر رات میرے گلے میں باہیں ڈال کر سوتا۔ کبھی ہم باہر بینچ پر بیٹھتے اور میں اسے گلی کوچوں کی زندگی کے بارے میں بتاتا۔ بانٹوا میں میرے بچپن کی باتیں سن کر وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا۔ میرے پاس ان سوالات کا ..... ایک قہقہے کے سوا کوئی جواب نہ ہوتا۔

بلال مجھ سے مشابہ تھا ..... گول مٹول جسم' جسے دیکھ کر ہر ایک کا یہی دل چاہتا کہ اسے پیار سے ہوا میں گھما دیا جائے۔ وہ اپنی ماں کبریٰ سے ملنے کلفٹن سینٹر جاتا تو مسلسل پوچھتا رہتا ..... "نانا مجھے لینے کب آئیں گے؟" رابعہ ماں اور بلقیس بتاتیں ..... "بلال' طوطے کی

طرح اتنی باتیں کرتا رہتا ہے کہ ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ آپ اسے اپنے ساتھ ہی لے جایا کریں۔" یہ سن کر میں' بلال کے ننھے منے ہاتھ' اپنے ہاتھوں میں لے کر کہتا ..... "خدا کا شکر ہے' بلال میرے لئے' قدرت کا اضافی عطیہ ہے۔"

فون پر دھمکیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ بلقیس' ان حالات میں اپنے دونوں بیٹوں کے بارے میں فکرمند رہتی۔ خدشات کے پیش نظر' انہیں وقتی طور پر' میٹھادر دفتر سے دور رہنے کو کہہ دیا۔

کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنے دونوں بیٹوں کو' یو ایس فاؤنڈیشن کا ممبر بنوا دوں تاکہ ان کے لئے امریکی گرین کارڈ کا حصول آسان ہو جائے' لیکن میں نے اتفاق نہیں کیا۔ میں وراثت میں ملنے والے عہدوں کا قائل نہ تھا' چنانچہ دوستوں کی یہ تجویز بھی مسترد کر دی کہ ..... قطب کو' ایدھی سینٹر نیویارک میں شامل کرلیا جائے۔ میرے خیال میں منصب حاصل کرنے کے لئے میرے بچوں کو مکمل محنت کرنی چاہیے۔ بلقیس کو بھی صاف بتا دیا کہ ..... "جب دونوں کسی قابل ہو جائیں گے تو بلاروک ٹوک ایدھی فاؤنڈیشن کے قافلے میں شامل ہوسکیں گے۔ تب تک ان کا' اس سارے کام سے کوئی واسطہ نہیں۔

فیصل اور قطب شکاگو چلے گئے۔ وہاں انہوں نے الطاف اور کاشف کے ساتھ مشترکہ رہائش اختیار کرلی۔ فیصل نے آرلینڈو سکول سے حاصل کردہ سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر دسویں گریڈ میں داخلہ لے لیا تھا۔ شام کو ایک دکان پر کام کرتا ..... اخبار فروشی سے لے کر ٹرکوں سے بھاری سامان اتارنے تک' اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ رات کو ویڈیو فلم دیکھتا۔ اسے سیکنڈ ہینڈ سٹوروں سے سستے کپڑے مل جاتے۔ اس طرح وہ خوش لباسی کا شوق بھی پورا کرلیتا۔

اس دوران' ہالینڈ کے ایک مفلس و نادار اور ناخواندہ شخص کی کہانی سننے کا موقع ملا جس نے تقریباً ایک سو پچاس برس پہلے انسانی بہبود کا تصور پیش کیا۔ بہت سے لوگوں سے پوچھا لیکن کسی کو اس کا نام معلوم نہ تھا ..... البتہ یہ پتہ چلا کہ یورپ میں سماجی اصلاحات کا نظریہ سوشلسٹ ذرائع سے آیا اور وہ شخص بھی دھیرے دھیرے کامیاب ہوا۔ اسی نظریئے کا قائل ہونے کی وجہ سے میں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ..... سیڑھیوں سے اوپر چڑھیں' یہ نہیں کہ اوپر پہنچ کر پھر نیچے آ جائیں۔ درخت زمین سے پودے کی شکل میں پھوٹتا ہے اور

فطری شیڈول کے مطابق' اس کی شاخیں سایہ دار بنتی ہیں۔" بلقیس سے بھی ہمیشہ یہی کہا ..... "اپنے بچوں کو' مستقبل کے محافظوں کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو انہیں اپنی زندگی میں ہی اس حیثیت سے دیکھ سکوں گا۔"

ایک بار امریکہ جانا ہوا تو قطب اور فیصل سے ملنے ان کے اپارٹمنٹ گیا۔ انہوں نے خود پکا کر مجھے کھانا کھلایا۔ ٹیلی ویژن بھی چل رہا تھا ..... انہیں پیسے بچا کر رکھنے کی عادت ورثے میں ملی تھی۔ شکر ہے کہ انہوں نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا۔ انہیں سمجھایا کہ ..... "شادی کسی ہم پلہ لڑکی سے کرنا جو ہمیشہ تمہارے دکھ سکھ کی ساتھی رہے۔ یہ رشتہ اسی طریقے سے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔"

بعض قبائل میں قدیم رواج کے مطابق آج بھی لڑکیوں کا سودا کیا جاتا ہے۔ اسے کیونکر ختم کیا جاسکتا ہے ..... البتہ جو لڑکیاں اپنے شوہروں اور خاندانوں کو چھوڑ کر ایدھی فاؤنڈیشن کی پناہ میں چلی آتی ہیں' انہیں سخت اخلاقی اور انتظامی نگرانی میں دے دیا جاتا ہے۔ مزید احتیاط بھی کہ حدود آرڈیننس کے تحت جیل نہ جانا پڑے تاہم جانچ پڑتال اور پوری تسلی کے بعد انہیں آزاد کر دیا جاتا ہے ..... احتیاط اور پابندی کے باوجود' ہم پر الزام آتے رہے کہ ..... ان لڑکیوں کو عقوبت خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ ..... پھر کیا کیا جائے۔ انہیں جانے کی اجازت دیتا ہوں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ..... ایدھی نے چھنال گھر کھول رکھا ہے۔ یہ کیسا ستم ہے کہ انہیں ممکنہ جنسی جرائم سے بچا کر حفاظت اور پناہ میں رکھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ ..... ایدھی فاؤنڈیشن' جیل ہے۔ ان الزامات کی صورت میں ..... کیا سماجی خدمت کا کام بند کرکے' ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین ہو جایا جائے؟ ..... لیکن دکھی لوگ مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور صبر آزما کام جاری رکھتے ہوئے سب کچھ خدا پر چھوڑ دیتا ہوں۔

والدین سے اکثر کہا کرتا ..... "اگر دو انسان ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو شادی بھی کرسکتے ہیں۔ شاید تم تسلیم نہیں کرتے مگر اسلام اس کی اجازت دیتا ہے جبکہ نکاح نامے کی حیثیت ایک دفاعی دستاویز کی ہے اور گواہی سنت رسولؐ ..... حق مہر اس لئے ضروری ہے کہ غیرذمہ دار خاوند اس سے خوفزدہ رہے ..... اس کے بعد تمہارا مسئلہ کیا رہ جاتا ہے؟"

عورتوں کے معاملے میں' اسلام ایک مہربان اور روشن خیال مذہب ہے جو اخلاقی حدود

میں رہتے ہوئے سوچنے' سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ ایک عالم سے تبادلہ خیال کا موقع ملا تو وہ کہنے لگے ـــ "اہم مسائل سے توجہ ہٹ چکی ہے۔ اسی لئے ہمارے معاشرے میں عورت کو ان رسومات اور توہمات میں الجھا دیا گیا جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ برصغیر میں یہ رسمیں' ہندو مذہب سے آئی ہیں ..... ستی جیسی ظالمانہ رسم نے ہندو عورت سے جینے کا حق تک چھین لیا۔ میرے خیال میں' شادی' طلاق اور دوسرا نکاح کرنے کے معاملات' فریقین کی مرضی سے طے ہونے چاہئیں۔ غیرذمہ دارانہ اور جبری رویئے کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔ کوئی بھی مذہب' ترقی اور روشن خیالی کا راستہ نہیں روکتا۔ ہمیں وقت اور زمانے کے ساتھ' اندرونی اور بیرونی حالات کے مطابق متحرک رہنا چاہیے۔ اہل مغرب کے خیالات بھی اسی نظریئے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ معیار زندگی بلند کرنے اور ترقیاتی عمل برقرار رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ ..... مذہبی ہدایات کی روشنی میں' عورتوں کو معاشی آزادی دی جائے۔ گھر بنانے کے لئے قرضے کا حصول' مفت صحت و تعلیم اور دوسری سہولیات سے ان کے پاؤں میں پڑی وہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی' جنہوں نے اسے دوسروں کا محتاج بنا رکھا ہے۔ اس طرح تیزی سے بدلتی دنیا میں' نوجوان نسل کے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ اخلاقی پابندیوں کے دائرے میں رہ کر کیا جائے تو فیملی سسٹم مزید مستحکم ہوگا۔ بیرونی ممالک میں ان باتوں کو معمول کے مطابق سمجھا جاتا ہے لیکن ..... پاکستان میں الٹا حساب ہے۔ ایک بن بیاہی لڑکی جس پر کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں ہوتی' اگر باہر جاکر کام کرنا چاہتی ہے تو اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے' پر اس کی شادی ہو جائے تو گھر کی قیدی بنا دی جاتی ہے ـــ پھر ایک روز اسے' اپنے ڈھیر سارے بچوں کی کفالت کے لئے گھر کی دہلیز عبور کرنا پڑتی ہے۔ دوسری طرف ایک عورت' اپنی اولاد تک' دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہیں چلی جاتی ہے۔ حالات و واقعات کی اس پریشان کن گردش میں' خاندانی کفالت کے نظام کو اور زیادہ مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی احساس کے تحت' ایدھی فاؤنڈیشن نے آخر کار مختلف خودکفالت سکیموں کا اجراء کیا۔

مذہبی طور پر ایک سے زائد شادیوں پر پابندی نہیں لیکن سماجی طور پر ..... پہلی بیوی' دوسری کے آتے ہی طوفان برپا کر دیتی ہے۔ خاوند اس کے ڈر سے درپردہ' دوسری شادی کرلے تو قیامت آ جاتی ہے۔ ایران' افغانستان' سعودی عرب اور دیگر ملکوں میں جسم فروشی

سے بچنے کا واحد طریقہ یہ اپنایا گیا ہے کہ مرد' اپنی پہلی بیوی کی رضامندی سے ـــ زائد شادیاں کرسکتا ہے۔ بلقیس نے ایک مرتبہ مذاقاً" کہا ..... "آپ دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتے' میں اجازت دے دیتی ہوں۔" اس بات کا سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا ـــ " میرے پاس بیویوں کے لئے وقت نہیں۔ دوسری شادی' ایک بے عمل اور کاہل شخص ہی کرسکتا ہے جس کے پاس بہت پیسہ ہو۔" جن لوگوں نے دوسری شادی کرنے کا مشورہ مانگا' انہیں یہی کہا ..... "اگر آپ اپنے نفس پر قابو پالیں تو بہتر ہے ..... بصورت دیگر کسی بیوہ کو سہارا دیں۔ اسلام نے تو چار تک کی اجازت دے رکھی ہے۔"

عورت کے بارے میں مختلف نوعیت کے منفی خیالات اس لئے پھیلے کہ ـــ اس کے تاریخی کردار اور نمایاں کارناموں کو جان بوجھ کر پردوں میں چھپایا گیا ہے۔ عورت ذات کے بارے میں نازیبا داستانیں بھی گھڑی گئیں۔ ان پراگندہ سماجی حالات کو بہتر بنانے کے ضمن میں ہی ایک سے زائد شادیوں کی تجویز دی گئی ..... کیونکہ ہمارا مذہب تو اصلاحات سے آگے بڑھا ہے۔ اسے جہالت ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جانا چاہیے۔ عورت ہر لحاظ سے اعلیٰ مرتبے کی حامل ہے لیکن فطری طور پر خواتین' سامنے کے منظر سے آگے نہیں دیکھتیں ـــ شاید اسی لئے میری تجاویز انہیں قدیم اور پسماندہ محسوس ہوتی ہوں ..... لیکن میرا مقصد' اصلاح احوال کے سوا کچھ نہیں۔ آنے والے عہد کے' بہتر سماج کی بات کرتا ہوں۔

ایک بیوہ خاتون کا بیٹا' کوئٹہ میڈیکل کالج میں وفات پا گیا۔ دکھیا ماں نے مدد چاہی تو بلقیس اور میں' ایک تابوت لے کر بلوچستان پہنچے اور میت کو غسل دیا۔ مرحوم کی آنکھوں میں کچھ ..... کیڑے تیرتے دیکھ کر بلقیس نے حیرت کا تاثر دیا تو اسے بتایا کہ ـــ "یہ کیڑے' تاخیر سے دفن ہونے والی مردہ آنکھوں میں تیرنے لگتے ہیں۔" یہ محض مشاہدے اور تجربے کی بات تھی۔ میتوں کی تدفین کے دوران ایسے ہی عجیب واقعات سامنے آتے رہے۔

ایک فقیر جو کالا پل پر بھیک مانگا کرتا تھا' مرنے پر اس کے مریدوں نے وہیں دفنا دیا۔ عقیدت مندوں نے اس کے مقبرے پر نذر نیاز کے ڈھیر لگا دیئے۔ تدفین کے دو ماہ گزرنے کے بعد' حکام نے اس کی میت کسی قبرستان میں دفنانے کا کام ایدھی فاؤنڈیشن کے سپرد کیا۔ یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ موت کے ساٹھ دن بعد بھی ـــ فقیر کی میت تر و تازہ تھی۔

میانوالی کا رہنے والا ایک فقیر' دھوبی گھاٹ سے ملحقہ تالاب کے کنارے دیکھا جاتا

رہا۔ ایک روز پتہ چلا کہ روپوش ہوگیا ہے۔ دو دن بعد اس کی لاش گٹر کے غلیظ پانی میں تیرتی ملی۔ وہ ناچار شخص کسی سے خود نہیں مانگتا تھا۔ کوئی کچھ دیتا تو کھالیتا، ورنہ تالاب کے کنارے بھوکے پیٹ بسر کرلیتا۔ ہم نے لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہا لیکن ـــ اس کے مریدوں نے منع کر دیا۔ چنانچہ، گلاب کے پھولوں سے لدی لاش، ایمبولینس میں میانوالی پہنچا دی۔

ایک معمر خاتون، ایک کمرے میں تنہا مصروف عبادت رہتی، چل بسی۔ دو چار روز اس کی موت کا کسی کو علم نہ ہوسکا۔ بدبو پوری بلڈنگ میں پھیلی تو محلے والوں نے مرحومہ کی بہو کو بلوایا۔ وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ آئی اور بتایا کہ ـــ "میں تو کل ہی اسے مل کر گئی ہوں۔" جبکہ میت کو دیکھنے سے پتہ چل رہا تھا کہ مرحومہ کو مرے کم از کم تین دن گزر چکے ہیں۔

ادھر ـــ کبریٰ بیٹی، خود پر گزرنے والے ازدواجی سانحہ کی الجھن سے کافی حد تک نجات پا چکی تھی۔ وہ بیشتر وقت، معذور بچوں اور لڑکیوں کے فلاحی پروگراموں میں مگن رہتی۔ شاید اسی لئے اس کے چہرے پر سکون کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ اس کے باوجود وہ الگ تھلگ اور خاموش رہتی۔ کم کھانا اور کئی راتیں مسلسل جاگنا، اس کی عادت بن چکی تھی۔ ماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایدھی فاؤنڈیشن کے لئے کام کرنے سے خوش اور مطمئن ہے تو ـــ ہم نے کلفٹن سینٹر میں اس کی ذمے داریاں بڑھانے کا فیصلہ کرلیا، لیکن بلقیس کے ہمراہ، بلال کو اپنے کاندھے پر سوار کیے سینٹر پہنچتا تو یہ دیکھ کر دل چھلنی ہو جاتا کہ ـــ میری پیاری بیٹی نے اپنے آپ کو تنہا سمجھ لیا ہے۔

بلقیس سے شادی کو چوبیس برس ہوچکے تھے لیکن ـــ گھریلو اخراجات کے مسئلے پر ہمارا تنازعہ بدستور چلتا تھا۔ میں کہتا ـــ "ہرماہ کی پہلی تاریخ کو جتنی رقم درکار ہو، لے لیا کرو۔ بعد میں تقاضا نہ کرنا۔" پر وہ بلاناغہ ہر مہینے کی نو دس تاریخ کو آدھمکتی اور بولے چلی جاتی۔ گذشتہ ہفتے کا حساب دے کر مزید طلب کرتی۔ صاف انکار کرتے ہوئے کہتا ـــ "میں کھلا فقیر ہوں۔ دوسروں کے قرضے نہیں اتار سکتا۔"

کچھ سرمایہ، سرکاری بچت کی سکیموں میں لگا رکھا تھا۔ یہ رقمیں عوام کے کاموں میں استعمال ہوتیں اور منافع بھی گردش میں رہتا۔ استعمال کے لئے ہمیشہ کم ہی پیسے نکلوائے۔ یوں بچت در بچت کے اصول نے فاؤنڈیشن کو مستحکم بنائے رکھا۔

چالیس برس تک خاموشی سے کام کرتے رہنے کے بعد، ہم رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہے تھے۔ راتوں رات نہیں، ادارے کو اس مقام تک پہنچانے سے پہلے، دن رات سوچا اور بے پناہ محنت کی ـــ آج کوئی شخص اس سارے کام کو قومیانے کی بات کرتا ہے تو بے ساختہ ہنسی آتی ہے ـــ کہ اگر فاؤنڈیشن کی نجکاری ہوئی تو سب اپنی جھولی پھیلا کر دوبارہ اسی مقام پر آ جائیں گے۔ میرے خیالات سن کر ساتھی سر تھام لیتے اور بلقیس، کرسی پر ڈھیر ہو جاتی کہ کیسی باتیں کرتا ہوں ـــ پر ان سے یہی کہتا ـــ "آپ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ادارے میں، میری حیثیت تو محض امانت دار کی سی ہے۔ میں نے صرف اپنی میمن سوچ کام میں لاتے ہوئے، عوامی مفادات کو وسعت دی ہے۔ ادارہ کسی پر بوجھ تو نہیں۔ اگر اگلا مرحلہ مکمل نہ کرنے دیا گیا تو کسی دوسری دنیا چلا جاؤں گا، جہاں کئی نادار لوگ، امداد کے منتظر ہیں ـــ کام تو لامحدود ہے۔"

نام و نمود، نہ تو میرا طرز زندگی ہے، نہ مقصد حیات ـــ یہ نظام، لوگوں کے دیئے ہوئے عطیات سے قائم ہے۔ کسی سے مقابلہ بھی نہیں۔ کبھی کسی سیاسی جماعت میں شامل نہ ہوا۔ رقیبوں سے ہمیشہ گریز کیا۔ یہی سمجھتا ہوں کہ کسی ویران گلی میں کھڑے ہوکر ـــ ایک روپیہ فی کس مانگنے کا طریقہ کافی ہے۔ حماقتوں سے محفوظ رہنے کے لئے وقت کی ڈھال اور کفایت شعاری کو وسیلہ بنایا۔ بچت نہ کرتا تو تنظیم، اقتصادی لحاظ سے اتنی مضبوط نہ ہوپاتی اور فلاحی عمل رک جاتا۔

اب زبانی کلامی باتوں، تقریروں اور خالی دلائل کی بجائے ـــ صرف محنت اور عملی جدوجہد ضروری تھی ـــ مواقع ملے تو طلباء سے بطور خاص کہا ـــ "آپ، فکر و عمل کے حوالے سے میری ذات کا پورا محاسبہ اور تجزیہ کرسکتے ہیں۔ ایک ذہنی تبدیلی کا مشن لے کر آنا چاہتا ہوں۔ اس انقلاب کے لئے راکٹوں اور بموں کی نہیں، لوگوں کو خواب خرگوش سے جگانے والے دماغوں کی ضرورت ہے۔ اصل انقلاب یہی ہے کہ فرسودہ نظام کی بجائے ایک ایسا فعال سسٹم رائج کیا جائے جس سے پسماندہ معاشروں کی بربادی دور ہوسکے۔"

1990ء کے دوران، ملک میں پھیلے کالے دھن کا برملا اعلان کرکے، اسے گردش میں لانے کی تجویز دی۔ لوگ جب اپنا زیر زمین سرمایہ، گردش میں لے آئیں گے تو ترقیاتی عمل تیز تر ہو جائے گا۔ تمام ملازمین کو تنخواہیں، کیش کی بجائے بذریعہ چیک دی جائیں تاکہ

چوری چکاری اور گھپلوں کا ازالہ ہوسکے۔ ہر چیک پر ایک معمولی ٹیکس لازمی قرار دیا جائے تو حکومت اور قومی خزانے میں نمایاں اضافہ سامنے آئے گا۔

محکمہ صحت سے متعلق حکام سے کہا ..... "آپ حکومت کے دست و بازو بن کر کام کریں۔ حکومت کی تیار کردہ دوائیوں کے پیکٹوں پر باقاعدہ تحریر ہو کہ ..... "ان ادویات کو کھلی مارکیٹ میں بیچنے کی سزا' کم از کم پانچ سال قید بامشقت ہو گی۔ سرکاری ہسپتالوں میں ادویات کی پیکنگ یکساں اور ارزاں بنائی جائے تاکہ غریب مریضوں کو آسانی سے کم قیمت ادویات میسر آسکیں۔"

1950ء کے دوران مشرقی پاکستان گیا تھا تو تیزی سے تعمیر ہوتی مساجد کو دیکھ کر خیال آیا تھا کہ ..... مساجد کو حقوق اللہ کے ساتھ' حقوق العباد کے فروغ کا وسیلہ بھی بننا چاہیے کہ یہی خدا کی منشاء اور خوشنودی بھی ہے۔ مسجد کے زیرِ سایہ' تعلیم' صحت اور دیگر انسانی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام ..... حقیقی' اسلامی فلاحی ریاست کا پیش خیمہ ثابت ہوسکے گا۔ یہی نظریہ' بعدازاں لاہور میں منعقدہ ایک سیمینار میں علمائے کرام کے سامنے بھی دوہرایا۔ کافی لوگوں نے اتفاق بھی کیا۔ انسان دوستی اور حقوق العباد کی روایت کو کچھ لوگ "گلاب کے پھول" سے مشابہ سمجھتے ہیں لیکن ..... اسے بھی چند رسموں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ میت پر گلاب کی پتیاں ..... سیاسی لیڈروں کے گلے میں پھولوں کے ہار۔ سوچئے' بھلا اس سے کیا فائدہ؟

بعض انتہا پسندوں نے میرے یہ خیالات سنے تو سمجھے بغیر مخالفت کرنے لگے ..... کسی نے مجھے آغاخانی کہا' کسی نے شیعہ' کسی نے قادیانی' بلکہ بے دین تک کہہ دیا۔ ایک مسجد کے باہر ایک بینر دیکھا ..... جس میں مجھے "غیر مسلم" لکھا گیا تھا تو وضاحت ضروری سمجھتے ہوئے کہنے کی جسارت کی ..... "میرے خیالات تو ہر شخص کے فائدے کے لئے ہیں۔ آپ عجلت میں' مجھ پر دوسرے عقائد کی چھاپ لگا کر وہ کریڈٹ تو نہ چھینیں جو ..... صرف اسلام سے وابستہ ہے۔" میں اعلانیہ طور پر ایک باعمل مسلمان ہوں مگر ..... تمامتر وضاحتوں کے باوجود' میرے خلاف پروپیگنڈا جاری رہا۔

اسلام آباد کی ایک معروف مسجد کے پیش امام نے خط بھیجا' لکھا تھا کہ ..... "آپ اچھے آدمی ہیں لیکن آپ کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ آغاخانی گروپ سے تعلق رکھتے

ہیں۔ میرے پاس آ جائیں تاکہ آپ کو سچا مسلمان بنا دوں۔" انہیں براہ راست جواب دینے کی بجائے بذریعہ پریس وضاحت کر دی ..... "مسلمان ہوں اور آپ کو چاہیے کہ مجھے کام کرنے دیں ..... اس سے سب لوگ مستفید ہوں گے۔"

ایک مرتبہ' طلباء کو پیغام دیتے ہوئے کہا ..... "قرآن مقدس کو جزدانوں میں لپیٹ کر رکھنے کی بجائے' اپنی روحوں میں ہر وقت کھولے رکھیں۔ اپنے دلوں کے دروازے کھول کر تو دیکھیں۔"

بعض اوقات' کسی فٹ پاتھ پر ٹوکن فروخت کرتے ہوئے' لوگوں کی سردمہری دیکھ کر بہت پریشان ہوتا۔ قربانی کی کھالیں جمع کرتے وقت بھی بعض لوگ اسی طرح دل جلانے کی بات کرتے کہ ..... ایدھی فاؤنڈیشن کے طریقہ کار کے مطابق کھالیں باطل قرار پائیں گی اور جو لوگ اس ادارے کے ذریعے قربانی دیں گے' عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے وغیرہ' وغیرہ۔ یوں وہ اپنے مفادات کے لئے' نفع بخش فضا تیار کرتے۔ جبکہ ..... کھالیں جمع کرنے اور انہیں سماجی عمل کے لئے کار آمد بنانے کے سلسلے میں فاؤنڈیشن کا طریقہ کار بڑا واضح تھا۔ دردمند لوگ' عید سے پہلے ہی' اپنی جانب سے قربانی کی رقوم' ادارے میں جمع کراتے۔ ہم جانور خرید کر قربانی کرتے' کھالیں فروخت کر دی جاتیں اور گوشت ..... غریب بستیوں' سرکاری ہسپتالوں اور جیلوں میں تقسیم کر دیتے۔

کراچی کے ایدھی سینٹر سے' بارہ تیرہ سال عمر کے کچھ بچے بھاگ کر' ایدھی سینٹر ملتان جا پہنچے اور وہاں سے غائب ہو کر ایک مقامی کونسلر کے گھر چلے گئے جو ملتان سینٹر کے انچارج سے ناراض تھے ..... اگلے روز انہوں نے بچوں کو ہائی کورٹ میں پیش کر دیا اور انسانی حقوق کی پامالی کے قوانین کے تحت' فاؤنڈیشن کے خلاف خودساختہ الزامات کا مقدمہ دائر کر دیا کہ ..... ایدھی مراکز میں عورتوں کی چٹیا کاٹ دی جاتی ہے اور بچوں کو بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں۔ سینٹر کے معائنہ کے لئے ایک سیشن جج مقرر ہوئے۔ وہ پولیس اہلکاروں' وکیل اور اخباری رپورٹر کے ہمراہ آئے۔ رپورٹر نے گیٹ پر آتے ہی ہاتھ ہلا کر بچوں سے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ بچوں نے بھی اسی گرمجوشی سے جواب دیا لیکن ..... تعجب ہے کہ انہی بچوں کی تصویر اگلے روز اخبار میں چھپی تو نیچے عبارت یوں لکھی تھی ..... "مدد کے لئے پکارتے قیدی بچے" ..... یہ دیکھ کر میں نے ڈاکٹر قاضی کو ہدایت دی کہ وہاں مقیم تمام بچوں کو

دیکھ بھال کے لئے ہائی کورٹ کے حوالے کر دیا جائے لیکن افسوس کہ ــــ ملک میں سماجی بہبود کا نظام ــــ نام کی کوئی شے نہ تھی۔ آخر کار عدالت نے ہمارے خلاف تمام شکایات نمٹا دیں۔

کبھی کبھی میرا دھیان' بھارت اور بنگلہ دیش کے بڑے شہروں میں فٹ پاتھوں پر راتیں گزارنے والے بے کس و نادار انسانوں کی طرف چلا جاتا ــــ گجرات کاٹھیاواڑ کے ایدھی سینٹر کو بھی تین ایمبولینس گاڑیاں دی تھیں ــــ بمبئی اور کلکتہ میں کچھ دوسری سماجی تنظیمیں بھی مستعد ہو رہی تھیں ــــ جبکہ پاکستان کی نصف آبادی' جھونپڑیوں میں رہتی تھی اور بنیادی سطح پر کوئی کام نہیں ہو رہا تھا ــــ پر ہم انہیں' تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

1991ء کے دوران' میری ملاقات کور کمانڈر ملتان سے ہوئی۔ انہیں بتایا ــــ "یہاں طور طریقے تو یوں ہی برقرار رہیں گے لیکن ــــ شاید ایک فیصد لوگ ایسے نکل آئیں جو اکثریت کی امداد کر سکیں۔ بڑے طبقے کی نجات اسی صورت ممکن ہے کہ ــــ ملک میں سماجی نظام رائج کیا جائے۔ آپ مضبوط پوزیشن میں ہیں' چاہیں تو تبدیلی لا سکتے ہیں۔" رخصت ہونے لگا تو جنرل صاحب نے یہ کہہ کر حوصلہ بڑھایا کہ ــــ "گزشتہ چوالیس برسوں میں اس ملک نے آپ جیسا شخص پیدا نہیں کیا۔" واپسی پر اپنے زونل چیف کو اس ملاقات کا ماجرا سناتے ہوئے کہا کہ ــــ "اپنی پوری زندگی لوگوں کو یہی باور کراتے گزاری ہے کہ سسٹم درست کئے بغیر کچھ نہیں ہوگا لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر بھی سوچتا ہوں کہ شاید کوئی لکھاری' سماجی بہبود کی افادیت پر کوئی کتاب ہی لکھ ڈالے ــــ پر کسی کو بھی ان باتوں سے دلچسپی نہیں۔ اپنے محل میں سارے انقلابی ہیں۔"

ایک بار جب لاہور میں افسران کے ایک گروپ سے کہا کہ ــــ "ہمیں چارلس ڈیگال جیسے لیڈر کی ضرورت ہے" ــــ تو میرے اس بیان کو پریس نے کچھ اور ہی معنی پہنا دیئے۔ میں نے کہا ــــ "جب یہ سب لوگ مجھے احمق گردانتے ہیں تو ــــ پھر میرے خلاف کسی تادیبی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

تنظیم اب سکون و اطمینان سے چل رہی تھی اور جنون کی جگہ ٹھہراؤ نے لے لی تھی ــــ میں تھک چکا تھا لیکن اکتایا نہ تھا ــــ نیٹ ورک کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا ــــ اپنے

مقصد کو قریب سے دیکھ رہا تھا کیونکہ بنیادی مشکلات اختتام پذیر تھیں ــــ البتہ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔

پھولی لاشوں اور جلی میتوں سے کراہت کے بارے میں نئے آنے والے کارکن کہتے ــــ "جب کوئی لاش میٹھادر سینٹر سے اٹھالی جاتی ہے تو ہم لوگ کئی دنوں تک اس کی بدبو کی زد میں رہتے ہیں ــــ حیرت ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہوتا۔" جواب میں کہا ــــ "مسخ شدہ لاشیں دیکھ کر یہی سوچتا ہوں کہ یہ میتیں ــــ میری' تمہاری یا ہم میں سے کسی کی بھی ہو سکتی ہیں' ان سے کراہت کیسی؟"

ملکی سیاست ایک سنگین مرحلے سے گزر رہی تھی۔ 1991ء میں صدر غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت کو' مبینہ نااہلی اور کرپشن کے الزام میں برطرف کر دیا۔ عبوری' نگران حکومت نے دوبارہ عام انتخابات کرائے جن کے نتیجے میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی اور میاں محمد نواز شریف نے وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

یہی سال تھا' جب ہزاروں لوگوں نے سرحد عبور کرتے ہوئے' بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تاکہ وادی میں کشمیری مسلمانوں پر بھارتی مظالم کے خلاف' اقوام عالم کو احساس دلایا جائے۔ ایدھی فاؤنڈیشن نے غیرجانبدار انسانی تنظیم ہونے کے ناطے' امن و سلامتی کا بین الاقوامی کردار ادا کرتے ہوئے مقامی افراد کے شانہ بشانہ اپنی خدمات پیش کیں۔ ایدھی ہیلی کاپٹر ــــ زخمیوں کو لائن آف کنٹرول سے مظفر آباد' ہسپتالوں میں پہنچاتے رہے۔

ــــ بلال کے جل جانے کے فوراً بعد' الطاف اس خیال سے نہیں آیا کہ ــــ شاید کچھ نہ کر سکے۔ کبریٰ نے بلال کی دیکھ بھال کے لئے کلفٹن مرکز پر اپنے تمام فرائض موخر کر دیئے ــــ یہاں تک کہ دو ماہ کی اذیت ناک کشمکش کے بعد' بلال کو قضا نے آلیا۔

معصوم بیٹے کے غم میں نڈھال کبریٰ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ــــ بلقیس بھی گھائل تھی۔ کون دلاسہ دیتا' کون ڈھارس بندھاتا۔ اندوہ ناک موت نے ایک تنہا ماں کی گود سے اس کا بچہ اٹھا کر' اسے ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین کر دیا تھا۔ اس کا غم ہلکا کرنا شاید کسی کے بس میں نہ تھا ــــ اس امید پر اپنے آپ کو بھلاتے ہوئے' کام میں مصروف کر لیا کہ ــــ شاید کچھ دیر کے لئے سہی' بلال کے مسلسل غم پر قابو پا سکوں ــــ پر ایسا کہاں ــــ پھر

اچانک اس سوچ سے آن گھیرا کہ ــ اب کبریٰ کا کیا بنے گا!

ایک طویل سفر سے واپس پہنچا تو بلقیس نے بتایا ــ "آپ تو حسب معمول چلے گئے' کبریٰ کو دیکھیں ــ اسے سکتہ سا ہوگیا ہے ــ پرسا دینے والے بھی اس کے سامنے بلال کی موت کا ذکر نہیں کرتے کہ کہیں غم کی شدت سے وہ مر ہی نہ جائے۔ کبریٰ کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ آپ ہی کچھ کیجئے۔" میں دل پر پتھر رکھ کر کبریٰ کے قریب گیا۔ اس کی ہولناک خاموشی' بوجھل آنکھیں' ساکت وجود ــ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے یہ ستم بالاخر قبول کرلیا ہے۔

کبریٰ سے نرمال کے بارے میں پوچھا تو اس کا جواب تھا ــ "آپ بہتر جانتے ہیں۔" میں نے کہا ــ "اس ذہنی مریضہ کے گھر کا بھی پتہ نہیں۔ اسے تو ایک گلی سے اٹھا کر لایا گیا تھا۔ وہ کل بھی اپنے حالات سے بے خبر تھی' آج بھی ہے۔" کبریٰ نے میرے اس فیصلے سے اتفاق کرلیا کہ نرمال کو' ذہنی بیمار عورتوں کے بفرزون سینٹر بھیج دیا جائے۔۔۔۔

کلفٹن سینٹر میں اکتالیس معذور بچے زیر کفالت تھے جبکہ مزید دو سو کی گنجائش موجود تھی۔ یہ بچے' ماہر نرسوں کی نگرانی میں پرورش و علاج کی سہولتوں سے بہرہ مند تھے۔ ملحقہ عمارت میں ایک سے دس سال تک عمر کی یتیم بچیوں کی نگہداشت ہوتی ــ جنہیں گیارہویں برس سے ایدھی ایجوکیشن سینٹر' نارتھ کراچی میں منتقل کر دیا جاتا۔ کلفٹن سینٹر کے یہ بھولے بھالے بچے ..... معصوم بلال کے غم کی تلافی تو نہ کرسکے تاہم رفتہ رفتہ ــ یہی کھلونے' کبریٰ کے جی بہلاوے بنتے چلے گئے۔

بلال کی وفات کے چند ماہ بعد' بلقیس نے بتایا کہ کبریٰ چاہتی ہے کہ الطاف کو ایک اور موقع فراہم کرتے ہوئے' امریکہ جاکر اسے بلال کے غم میں شریک کرلے ــ یہ سن کر ہم سب مطمئن ہوئے لیکن ..... جلد ہی یہ اطمینان دم توڑ گیا جب ــ کبریٰ نے الطاف سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی کا فیصلہ سنا دیا۔

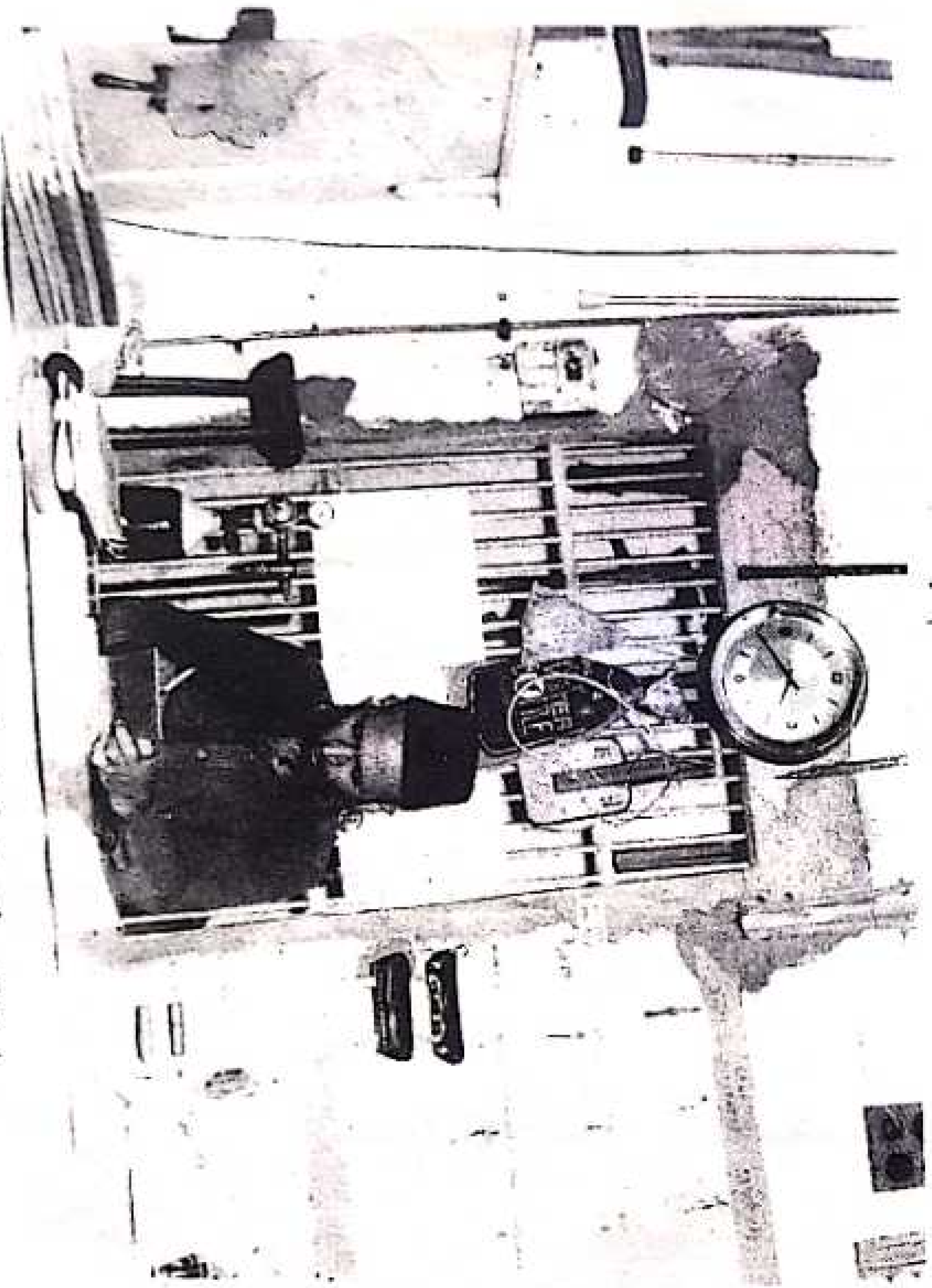
کبریٰ کی محرومیوں کا یہ رخ' کسی عظیم المیے سے کم نہ تھا۔ اپنی غمزدہ بیوی سے کہا کہ ..... "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی گہرائی میں گر پڑی ہو۔" یہ سنتے ہی کبریٰ اپنی ماں کے گلے لگ کر بے تحاشا روئی۔ اس نے اپنا غم' ہمارے ساتھ بانٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا ــ کسی تاخیر یا تنازعہ کے بغیر' خاموشی سے طلاق کا مسئلہ نمٹا دیا گیا۔

اسی دوران' الطاف ایک اور لڑکی سے شادی کا فیصلہ کرچکا تھا۔ خالہ اور زینت نے اسے باز رکھنے کے جتن کئے لیکن بے سود ..... اب کبریٰ نے ٹھکرائے جانے کی اذیت سے دوچار ..... ایک ایسے مستقبل میں زندہ رہنا تھا جو ..... شاید اس کی محرومیوں کی تلافی کردے۔ الطاف کی دوسری شادی کی تاریخ قریب آئی تو کبریٰ نے اپنے آپ کو ــ مزید تنہا کرلیا۔ خالہ' ڈبڈباتی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے الطاف کی نئی بیوی کے ہمراہ شادی کی تصویریں ہمیں دکھانے لائیں تو انہیں کبریٰ سے چھپا کر رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ــ پر ایسا ممکن نہ ہوسکا اور کبریٰ' اپنی سیج پر بیٹھی دوسری عورت کو دیکھ کر..... اعصابی حملے کا شکار ہوگئی۔

ایک روز امینہ' بجلی کی طرح ہماری زندگی میں ایک بار پھر لپک آئی۔ بلقیس سے مذاقاً کہا ..... "خبردار رہنا' اس نے ایک اور موقع تلاش کرلیا ہے۔" بلقیس مطمئن تھی کہ میرا امینہ سے کبھی کوئی وجدانی تعلق نہیں رہا' اس لئے اس نے کوئی نوٹس نہ لیا تاہم اتنا کہا ــ "امینہ ہماری محبت سے' شاید جلتی تھی' جبھی تو اس نے پورے بارہ برس ہمیں اپنا کوئی دکھ جتائے بغیر گزار دیئے۔" امینہ نے اپنے خوابوں کے شہزادے سے شادی تو کرلی تھی پر وہ شخص اسے کوئی سکھ دیئے بغیر چل بسا ..... امینہ' بیوگی کے دکھ اٹھائے دوبارہ سماجی کام کرنے چلی آئی۔ زندہ رہنے کی ترجیحات اور پشیمانیاں' اس کے چہرے سے عیاں تھیں۔ بلقیس نے فیصلہ کرلیا کہ امینہ اگر اپنی زندگی' غریبوں کی خدمت میں گزارنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ میں نے مذاقاً" ہنستے ہوئے کہا ..... "امید ہے' یہ فیصلہ کرنے کے بعد تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

بلقیس سے میری شادی کو چوتھائی صدی بیت چلی تھی پر ہم دونوں کی ایک دوسرے سے محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ بلقیس نے امینہ سے فخریہ انداز میں کہا ..... "ایدھی نے بظاہر مجھے کچھ نہیں دیا اور لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے شادی کے پہلے ہی روز مجھے آگ میں جھونک دیا تھا ــ لیکن دنیا جانتی ہے کہ میں اس آگ سے کندن بن کر نکلی ہوں۔"

بلقیس کی ہر وہ ترغیب' جس کا مقصد میری توجہ کام سے ہٹانا تھا' ہمیشہ کی طرح ناکام ہوچکی تھی۔ زندگی کی تلخیوں میں کھو کر' میں نے خود کو بھی بھلا رکھا تھا۔ ایک روز بلقیس کہنے لگی ..... "آپ ایک کام سے تھک جاتے ہیں تو دوسرے سینٹر چلے جاتے ہیں ..... میٹھادر



"وقت کم ہے"

اپنے میٹھادر دفتر میں، زندگی کے دکھوں کے لئے خدمت انسانیت کی دوڑ کرتے ہوئے

سے سراب گوٹھ' وہاں سے ایدھی ولیج' ناور' ہسپتال ---- اور خدا جانے کہاں کہاں۔ پھر لاشیں دفنانے بلوچستان کی حد نظر تک پھیلی پہاڑیوں ---- اور سندھ کے صحراؤں تک ---- اس کے بعد لاہور اور اسلام آباد' ہر لمحہ حرکت میں رہتے ہیں۔ جب کچھ بھی کرنے کو نہیں ہوتا تو کوئی نیا بکھیڑا خود پر سوار کرلیتے ہیں۔ امریکی صدر بھی اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے کے لئے آرام اور تفریح کا کوئی لمحہ نکال لیتا ہے۔" میرا جواب تھا کہ ---- "میرا موازنہ' امریکہ کے صدر سے کیوں کرتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میری نگاہ میں' طویل ترین زندگی بھی ایک لمحے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ سامنے اور اردگرد' انسانی دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور ان کا علاج کرنے کے لئے ---- وقت بہت کم ہے۔"

حقیقت یہی ہے کہ ---- میٹھادر مرکز سے میری وابستگی' ہمیشہ ہر مقام سے بالاتر رہی ---- یہی میرا گھر تھا ---- امن و سلامتی کا مستقل ٹھکانہ ---- میرے تمام راستے' دنیا گھوم کر بھی یہیں آکر ختم ہو جاتے ---- یہیں کی خاک میرا "پریشر گروپ" بھی تھی۔

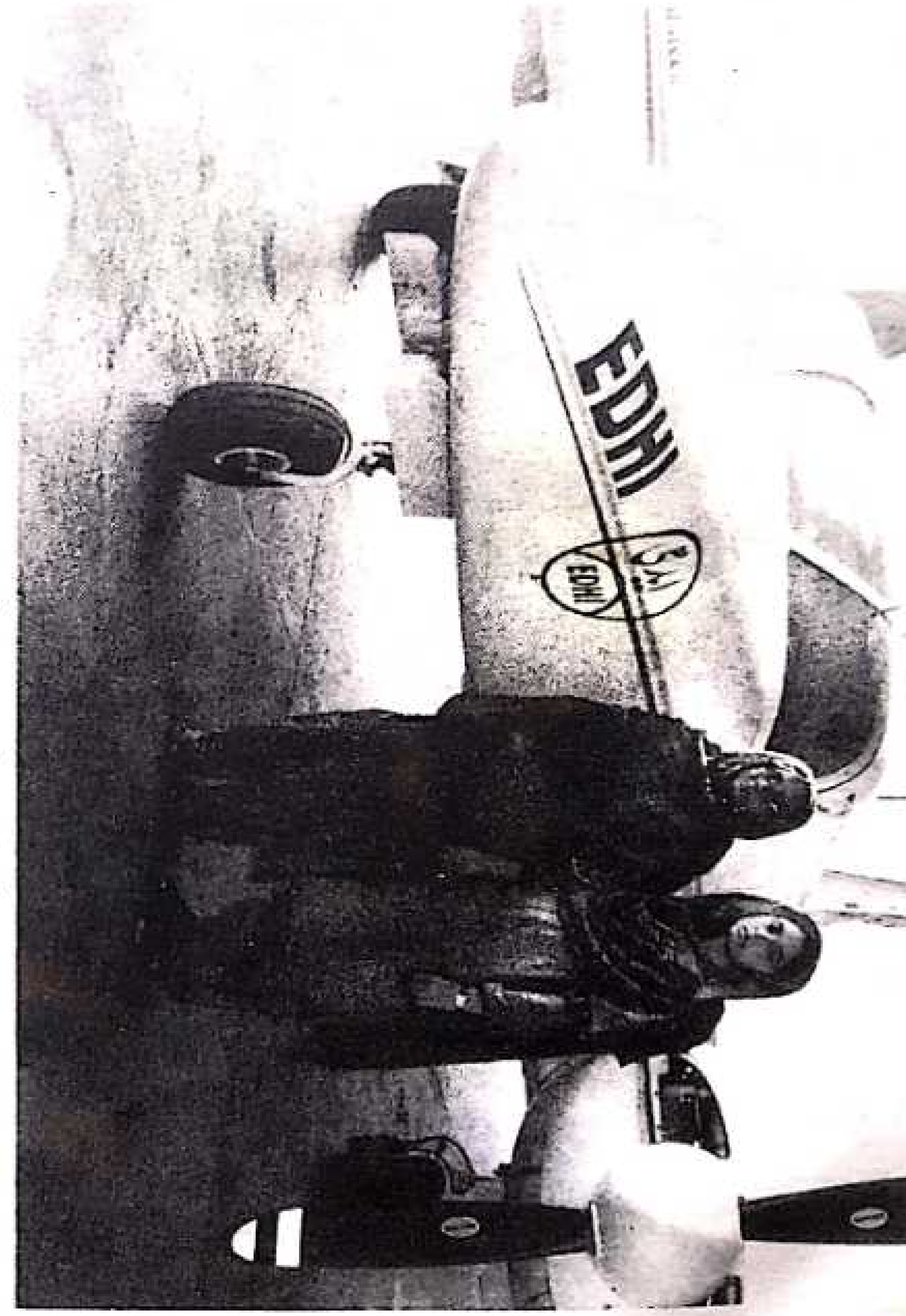
باب یازدہم

پریشر گروپ

1994ء کی ایک آدھی رات کو میٹھادر آفس میں کام کر رہا تھا۔ پچھلی دیوار پر آویزاں' پاکستان کے نقشے میں ایدھی فاؤنڈیشن کا قومی نیٹ ورک بھی نمایاں تھا۔ دائیں طرف' لوہے کی الماری نے پوری دیوار ڈھانپ رکھی تھی۔ یہ میرا ایک طرح کا قدیم کمپیوٹر تھا..... باقی تمام دیواروں کے ساتھ والی جگہوں اور دفتر کے دیگر حصوں میں متعلقہ ٹیلی فون' فیکس نمبر' کوٹیشن' رپورٹیں اور کاغذ کے ٹکڑوں پر گجراتی زبان میں لکھی ہوئی ہدایات تھیں۔ میرے سامنے چیک بکوں کا ایک ڈھیر لگا تھا جن پر میں نے جلدی سے دستخط کر دیئے۔

بلجیم ٹیلی ویژن کی ٹیم نے فاؤنڈیشن سے متعلق ایک ڈاکو منٹری فلم بنائی۔ اس کے مکمل ہوتے ہی' بلقیس' بھارت کے شہر اجمیر شریف چلی گئی جہاں اس نے مشہور زمانہ درگاہ کی زیارت کی۔ اس کے بعد اس نے بنگلور میں ایدھی سینٹر کا معائنہ بھی کرنا تھا..... فیصل حال ہی میں امریکہ سے واپس پہنچا تھا اور اس وقت پاک کالونی میں آتشزنی کے ایک سانحہ میں اپنی ساجی ٹیم کے ساتھ امدادی کام میں مصروف تھا۔

صبح کے اڑھائی بج چکے تھے۔ فیصل واپس پہنچتے ہی سونے چلا گیا..... میں مصروف رہا۔ فائلیں ترتیب سے رکھیں اور دستخط شدہ زونل چیک الگ کر دیئے..... گھڑی دیکھی اور روشنیاں گل کر دیں۔ پھر دفتر کی سیڑھیاں چڑھا اور اپنے ایک معتمد ساتھی کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے بتایا..... "سارا کام مکمل ہے اور ایک گھنٹے کے اندر برطانیہ روانہ ہو رہا ہوں۔ کیا تم مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے جاؤ گے؟ لندن میں فنڈ جمع کرنے کے پروگرام کا پہلے سے اعلان ہو چکا ہے' خصوصی دن' دو ہفتے بعد منعقد ہو گا"۔ یہ سب کچھ سن کر ساتھی کو حیرت ہوئی' تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا..... دیگر کارکنوں کی طرح' اسے بھی میرے مزاج کا علم تھا۔ کئی سوالات پہلے ہی ذہن میں گھوم رہے تھے..... ہم دونوں خاموشی سے ایئرپورٹ پہنچے۔ سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے ہدایت دی کہ دوپہر تک' لندن آفس کو میرے وہاں پہنچنے کی اطلاع نہ دی جائے..... یہاں بھی کسی کو آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں۔



خدمت کے نفاذ کے مشن پر ..... بلقیس ایدھی اور کبریٰ ایدھی' ایدھی ائیر ایمبولینس کے ساتھ

اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ..... چاروں طرف دیکھتے ہوئے' امیگریشن کی طرف چل پڑا۔ ان لوگوں کے بارے میں بھی شک و شبہ سے دو چار تھا' جنہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا' ان سے بھی جنہوں نے کاغذات چیک کئے ..... جہاز میں بیٹھ کر دوسرے مسافروں کے چہروں کے تاثرات دیکھتا رہا ..... جہاز کی اڑان کے کچھ دیر بعد' سیٹ سے تکیہ لگا کر' اپنی تھکی ہوئی آنکھیں بند کر لیں۔

فضائی سفر کے دوران' کراچی سے متعلق خیالات تیزی سے میرے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ برطانوی سامراج کے دور سے نجات کے بعد' یہی شہر میرا گھر تھا۔ بمبئی' کلکتہ' نیویارک اور استنبول جیسے شہروں سے بھی کئی درجے زیادہ صاف شفاف ..... سنگاپور سے بھی زیادہ خوبصورت' لیکن مختلف قبائلی معاشرتوں نے اسے اب ایک گندے شہر میں بدل دیا تھا۔ پاکستان کے تمام صوبوں سے لوگ ہجرت کر کے یہاں آگئے تھے۔ ہم کاٹھیاواڑ سے طویل سفر طے کر کے یہاں آباد ہوئے۔ بعد ازاں صوبہ سرحد' گلگت اور پاکستان کے کئی دور دراز علاقوں سے بھی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا۔ جب اسلام آباد' نیا دارالحکومت بنا تو مہاجروں کو کراچی میں اپنے پاؤں اکھڑتے محسوس ہوئے۔ اگر کراچی کو ہی دارالخلافہ رہنے دیا جاتا تو شاید اتنے مسائل پیدا نہ ہوتے ..... وقت گزرنے کے ساتھ' کراچی میں غربت بڑھی۔ لسانی گروپ' ذاتی مفادات حاصل کرنے کے منصوبے بناتے رہے اور خانہ جنگی کے لئے دھماکہ خیز مواد جمع کرتے رہے۔ طبقات کے درمیان خلیج وسیع تر ہونے لگی ..... بے روزگاری اور ناانصافی کے خلاف جذبات کے اظہار سے فضا اتنی آلودہ ہو گئی جس سے پورا ملک متاثر ہوا۔

میرا ذہن' قائد اعظمؒ کی اس حکمت عملی کی طرف چلا گیا جس سے وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک قومی زبان کے ذریعے متحد رکھنا چاہتے تھے۔ سوویت یونین کے مسائل میں' کثیر زبانوں کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ ایسے ممالک جہاں صرف ایک زبان بولی جاتی ہو' وہاں تنگ نظری کے امکانات کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سنا تھا کہ شیخ مجیب الرحمان' عملی سیاست سے پہلے کراچی کے بمبئی بازار میں وکالت کرتے تھے۔ حالات بھانپتے ہوئے انہوں نے زبان کو اپنی سیاسی بنیاد کا پتھر بنا لیا۔ اسی طرح کراچی کے قابل اور محنتی اردو دان طبقے نے بھی یہی سوال اٹھایا۔ حالات سے نالاں اور برہم نوجوانوں کے اجتماعات سے کراچی کی پوری فضا

میں بارود اور خون کی بو پھیل گئی۔

چند ماہ پہلے' کچھ لوگ اسلحہ کی نوک پر' گرومندر' بہادر آباد اور کلفٹن مراکز کے ایدھی سٹاف کو موت کی دھمکیاں دیتے ہوئے ایمبولینس گاڑیاں' ساز و سامان اور رقوم اٹھا لے گئے تھے ..... اس سے پہلے ایک چوری شدہ ایمبولینس' بلوچستان سے برآمد ہوئی تھی ..... پھر گاڑیاں روک کر ڈرائیوروں کو دھمکیاں دی جاتی رہیں کہ اگر انہوں نے ایدھی فاؤنڈیشن کے ساتھ مزید کام کیا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے ..... ایدھی کنٹرول روم میں بھی قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں۔ آخر کار اس گینگ کے کچھ افراد پکڑے گئے تو انکشاف ہوا کہ فاؤنڈیشن ہی کے سابقہ ڈرائیوروں کا ایک گروپ تھا جنہیں پٹرول چوری اور دیگر بدعنوانیوں کی پاداش میں برخاست کیا گیا تھا ..... مساجد میں مار دھاڑ اور فائرنگ کے واقعات کی نوعیت دوسری تھی۔ اب حالت یہ تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون ..... کس کو مار رہا ہے اور کیوں مار رہا ہے؟

جرائم پیشہ لوگ' بار بار پکڑے جاتے اور ضمانتوں پر رہا ہو جاتے..... کراچی کی تاجر برادری کو اکثر کہتا رہا کہ ..... ہماری مدد کریں تاکہ بگڑے ہوئے نظام کو سیدھے راستے پر لایا جائے لیکن یہ پیشکش کسی نے بھی تسلیم نہ کی۔ حکومتی افراد سے بھی کہا کہ ..... ناقص سسٹم میں اگر ایک گروپ کو پکڑیں گے تو ان کی مدد کے کئی دوسرے گروپ' آجائیں گے۔ آپ یہ نظام بدل دیں' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ..... مشرقِ وسطیٰ کو تیل جیسی نعمت کے وسیلہ سے ایک بہتر نظام ملا تو بدوؤں نے مکہ جانے والے حاجیوں کو لوٹنا چھوڑ دیا اور دنیا نے انہیں مہذب اقوام کی طرح تسلیم کر لیا۔

پریشان کن خیالات کو جھٹک کر سو جانا چاہا پر سو نہ سکا۔ ان سنگین حالات و واقعات سے ذہن کیسے آزاد رہ سکتا تھا جن کے باعث مجھے جلدی میں' جہاز میں بیٹھنا پڑا۔ 1993ء میں کچھ فوجی افسروں نے ٹاور میں رابطہ کیا اور اپنے دفتر میں ملاقات کے لئے کہا۔ میرے ذہن میں ایجنسیوں کا کوئی تصور نہیں' ہر ایک کو سی آئی ڈی ہی سمجھتا ہوں ..... دفتر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک معروف سوشل ورکر بھی بیٹھے تھے۔ سلام دعا کے بعد' جلد ہی اپنائیت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ..... اپنے ہی گھر جیسی فضا محسوس کر سکوں۔ آخر ایک صاحب کہنے لگے ..... "ایدھی صاحب! ہمیں آپ کی ضرورت ہے کہ

آپ قوم کو متحد رکھنے کے لئے آواز اٹھائیں۔ لوگ آپ کی آواز پر لبیک کہیں گے اور آپ کی عملی قربانیوں کے باعث آپ پر اعتماد کریں گے"۔ میٹنگ میں موجود دوسرے دونوں حضرات نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے باور کرانے کی کوشش کی کہ ۔۔۔ اس طرح سچے جذبوں کے ساتھ مثبت نتائج پیدا ہوں گے۔

چودہ اگست کو قائد اعظمؒ کے مزار تک جانے کے لئے ایک ریلی ترتیب دی جا رہی تھی۔ اس میں مجھے بھی شمولیت کے لئے کہا جا رہا تھا۔ چونکہ مجھے جاپان جانا تھا' اس لئے میں نے معذرت کر دی لیکن آفیسر نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ اس مرحلے پر یوم آزادی کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ملک کا ہر آدمی اس سلسلے میں ہم سے تعاون کر رہا ہے۔ میرے ساتھیوں نے بھی زور دیا کہ اس تقریب میں ضرور شامل ہوں۔ جب ہم چلنے کے لئے اٹھے تو آفیسر نے یہ بھی تجویز کیا کہ ۔۔۔ وہ مجھے بولنے کو ایک تقریر لکھ کر دیں گے اور اگر زبانی بولنا چاہوں تو کچھ ضروری نکات بتا دیں گے ۔۔۔ میں نے جھنجلا کر کہا کہ ۔۔۔ " میری تقریر' میرے دل کی آواز ہو گی۔ وہی کچھ کہوں گا جو آج تک کسی کے سامنے کہنے سے نہیں گھبرایا"۔

یوم آزادی آیا تو اپنے دفتر سے سیدھا مزار قائد پہنچا۔ وہاں مختلف مقررین' سٹیج پر آتے اور قائد اعظمؒ اور پاکستان کی باتیں سنا کر چلے جاتے۔ پھر مجھے تقریر کے لئے بلایا گیا۔ میں نے جو کہا' دل سے کہا ۔۔۔ "اگر قائد آج زندہ ہوتے تو حیران ہوتے کہ ان کی جدوجہد کا یہ کیا ثمر ہے۔ پاکستان' تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے کیونکہ اس کی قیادت' عظیم مقاصد کو زندہ رکھنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کے باوجود ہم ہر سال پورے احترام کے ساتھ اس پرشکوہ یادگار پر آتے ہیں لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ ہم یہاں آکر اپنے محسن کو کیا صلہ دیتے ہیں؟" ۔۔۔ اسی لمحے دیکھا کہ آفیسر میرے ایک ساتھی کو کچھ ہدایات دے رہا ہے جس نے فوراً" مجھے کہا ۔۔۔ " وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ کچھ نہیں کہنا چاہئے تھا۔" یہ بات سنتے ہی میرے اندر کا وہ لاوا بھی الفاظ کی صورت بہہ نکلا جسے شاید میرے دل میں ہی رہنا تھا۔

واپس پہنچ کر ہم سب اس واقعہ پر خوب ہنسے۔ میں نے کہا ۔۔۔ " اب وہ مجھے تقریر کے لئے کبھی نہیں بلائیں گے۔ صدر سہارتو کے استقبالیے کی طرح شاید یہ بھی میرا آخری بلاوا تھا"۔

یہ معاملہ ختم ہوا تو دیگر معاملات رونما ہونے لگے۔ جولائی 1994ء میں لندن کی ایک تقریب میں عمران خان سے ملاقات ہوئی۔ کینسر ہسپتال کے لئے عمران کی عوام سے عطیات کی اپیل کو میں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ..... بلکہ جب بھی کسی شخص نے عوامی بھلائی کا کوئی کام کیا' میں نے اسے سراہا۔ اسی جذبے کے تحت خود جا کر عمران خان کو ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ تقریب میں عمران خان نے مجھے ترغیب دی کہ سیاسی سطح پر ایک پریشر گروپ میں شامل ہو جاؤں۔ اس کا خیال تھا کہ اس ملک کے صاحبان کردار لوگ متحد ہو جائیں تو حالات تبدیل ہو سکتے ہیں ..... خاموشی سے اس کی بات سنی۔ بعد ازاں اسے مشورہ دیا کہ ..... "آپ جذباتی نہ ہوں۔ ہم لوگ کچھ تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ اپنے اپنے سماجی نصب العین کی تکمیل کریں۔ ہمیں اپنے فرائض پر توجہ دینی چاہئے۔ پریشر ڈالنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں"۔

عمران کو شاید جلدی تھی۔ جیسے کسی کو پریشان دیکھ کر اکثر نوجوانوں کا دل چاہتا ہے کہ اس شخص کے دکھوں کا مداوا' پلک جھپکنے میں ہو جائے ..... جو اچانک ممکن نہیں ہوتا ..... وہ اپنے نظریئے اور پریشر گروپ کے فوائد بتاتا رہا جبکہ میرا موقف دوسرا تھا۔ اسے یہی مشورہ دیا کہ ..... "ہمیں یہ جنگ تنہا ہی لڑنی ہو گی۔" سمجھایا کہ ....."پریشر گروپوں اور سیاسی پارٹیوں سے خود کو دور رکھو کہ وہ تمہیں کمزور کر دیں گی۔ تم جس تبدیلی کا پرچم لے کر آج نکلے ہو' میں اسی آرزو کی شمع' گزشتہ نصف صدی سے اپنے دل میں روشن کئے بیٹھا ہوں' اسے بجھنے نہیں دیا۔ امن و سلامتی کے راستے کا مسافر ہوں۔ چھوٹے چھوٹے' معصوم' خوبصورت بچوں کو دیکھتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ خدا ہم سے ابھی مایوس نہیں ہوا۔ میرا ایمان ہے کہ عزم پختہ اور جذبے سلامت ہوں تو بامقصد سماجی تبدیلی کو روکا نہیں جا سکتا۔ منزل چاہے کتنی دور کیوں نہ ہو' میں سیدھا راستہ چھوڑ نہیں سکتا۔ اشتہاروں کے ذریعے بے معنی شہرت اور ایوان اقتدار میں کھیلنے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ تجربات میرے لئے پرانے ہیں"۔

پاکستان واپس پہنچا تو جنرل حمید گل نے فون کیا کہ ..... " سیاستدان' لوگوں کو تباہ کرنے کی فکر میں ہیں"۔ ان کی بات پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ شاید ان کا مطلب تھا کہ .....اب جمہوریت نے احتجاجی صورت اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے بھی ہم خیال دوستوں کا پریشر

گروپ بنانے کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ..... "ملک کو بچانے کیلئے ہمیں آگے آنا ہو گا۔ نیک عزائم رکھنے والے مثالی لوگ تبدیلی لا سکتے ہیں۔" میرا جواب یہی تھا کہ ..... "میں اپنے کام کے سوا' کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتا"۔ وہ مسلسل اصرار کرتے رہے۔ آخر کار اسلام آباد میں کسی مناسب وقت ملنے کا وعدہ ہوا۔

ان سے دوران گفتگو یہی محسوس ہوا کہ ..... شاید عمران خان کی طرح وہ بھی جلدی میں تھے۔ میرے خیال میں صرف چہروں کی تبدیلی سے نظام نہیں بدلتے بلکہ اس طرح تو جمہوری مرحلوں کو مزید پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ ساتھیوں اور صحافیوں کو بتایا کہ ..... "میرا کام غیر سیاسی ہے۔ بنیادی طور پر سوشل ورکر ہوں اور سوشل ورکر ہی رہنا چاہتا ہوں۔ کسی پریشر گروپ سے میرا کیا واسطہ"۔

اگلے ہفتے' ایدھی فاؤنڈیشن اسلام آباد کے زونل انچارج ڈاکٹر قاضی سے کہا کہ وہ جنرل حمید گل کو فون پر کہہ دیں کہ میں ان کے پلان سے متفق نہیں ہوں۔ میرے انتظار میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ زونل انچارج نے بتایا کہ جنرل صاحب' میرا پریس بیان پڑھ کر خود ہی سمجھ گئے ہیں۔یوں یہ موضوع ختم ہو گیا اور میں بھی سب کچھ بھلا کر' اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ اکتوبر میں ایک فوجی افسر دوبارہ ٹاور آیا۔ بتایا گیا کہ وہ تقریباً" ایک گھنٹے تک فاؤنڈیشن کے طریق کار کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اگلے جمعہ کو پھر آیا۔ ایک گھنٹہ ٹاور میں بیٹھنے کے بعد سہراب گوٹھ آگیا جہاں مرکز انچارج سے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ آخر تیسرے جمعہ کو مجھ سے ملاقات ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ وہ بریگیڈیئر کے عہدے پر فائز تھا۔ سماجی بہبود اور کراچی کے حالات پر باتیں ہوئیں۔ اس نے مجھے ملیر سیکنڈری سکول میں خطاب کرنے کو کہا..... تقریب کے دوران اس نے طلباء کے سامنے' سماجی بہبود سے متعلق ہمارے عزائم کی تائید کی۔ اگلے جمعے کو پھر ہمارے دفتر آیا اور بار بار آنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہنے لگا ..... "آپ سماجی خدمت کرتے ہوئے ملک کو موجودہ مشکلات سے نکالیں"۔ میں نے ان صاحب سے وضاحت چاہی تو انہوں نے بھی وہی کچھ کہا جو پہلے والے حضرات بتا چکے تھے۔ اس پر انہیں بھی کہا کہ چہرے بدلنے کی بجائے نظام کی تبدیلی ضروری ہے' چاہے اس میں چوتھائی صدی ہی صرف ہوجائے۔ میں سماجی خدمت کا کام کرتا رہوں گا۔ ممکن ہے کہ اس سے ممکنہ تبدیلی کا راستہ

ہموار ہو جائے ..... لیکن اس فوجی افسر نے عجیب انداز سے جواب دیا ..... "اب آپ کو تیزی سے آگے بڑھنا چاہئے کیونکہ آپ سماجی عمل کو جاری رکھنے کے لئے جتنا سرمایہ اگلے سات سال میں اکٹھا کرنا چاہتے ہیں' وہ اقتدار میں رہ کر' چند روز میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ بااختیار حیثیت سے آپ اپنی تمام پالیسیوں کو بغیر تاخیر یا رکاوٹ کے بروئے کار لا سکتے ہیں"۔

اس کی باتیں نا قابل فہم نہ تھیں پر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں کسی پلان کا حصہ بن جاؤں۔ ایک عرصہ سے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہوں۔ میرے وطن نے بھی بڑی مشکلات برداشت کی ہیں۔ میرا نظریہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جمہوری عمل جاری رہنا چاہئے اور ہر حکومت کو آئینی مدت تک کام کرنے کا موقع دیا جانا چاہئے۔ میرا جواب سن کر وہ کچھ گھبرایا تو میں نے اپنے خیالات کی مزید وضاحت کی کہ ..... "اگر آپ لوگ تبدیلی چاہتے ہیں تو حکمرانوں سے مطالبہ کریں کہ وہ فلاحی ریاست کے فلسفہ پر عمل کریں"۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو مشورے کے لئے بلایا۔ وہ سب میری رائے سے متفق تھے کہ ملک کو ایک سازش کا سامنا ہے۔ اگلے روز وہی فوجی افسر اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ملنے آیا۔ گفتگو کی ابتداء میں ہی ان دونوں پر واضح کر دیا کہ کسی پڑھے لکھے اور طاقتور شخص کو تلاش کریں۔ وہ کہنے لگے ..... "اس سلسلے میں آپ اکیلے نہیں ہوں گے۔ کئی مشہور لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے"۔ اس پر جواب دیا کہ ..... "مختصر وقت میں نظام کیسے بدلے گا۔ یہ تو محض ایک سراب ہے"۔ اب وہ کھل کر کہنے لگا ..... "ہم آپ کو اس پروگرام میں شامل کرنے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہیں۔ آپ کو بہر حال یہ قبول کرنا ہی ہو گا"۔ اس بات سے میرے خدشات مزید بڑھے کہ اگر ان کی بات نہ مانی تو مجھے کسی جھوٹے مقدمے میں پھنسایا جا سکتا ہے۔ راز افشاء ہونے کے ڈر سے مجھے ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے دور رہوں۔

کراچی میں امن ریلی میں شرکت کے دوران بھی ایجنسی کے اہلکار نظر آئے۔ ہفت روزہ "تکبیر" کے ایڈیٹر صلاح الدین نے انٹرویو کے لئے اصرار کیا تو میں اونچی آواز میں جواب دیتا رہا تاکہ سب لوگ سن سکیں۔ ان سے کہا کہ پرسوں میٹھادر آجائیں تو سب کچھ بتا دوں گا۔ ریلی پروگرام کے مطابق مجھے پہلے "فلوٹ" پر بیٹھنا تھا لیکن عین وقت پر اعلان

ہوا کہ دوسرے "فلوٹ" پر سوار ہوتا ہے۔ اس تبدیلی نے میرے خدشات میں اضافہ کر دیا۔ ٹرک پر چڑھتے ہوئے عجیب بے چینی محسوس کی۔ ہزاروں لوگ ساتھ چل رہے تھے۔ جلوس' گرومندر اور لالو کھیت سے گزرتے ہوئے صدر بازار کی طرف مڑ گیا۔ بعض نوجوان سیاسی نعرے لگانے لگے۔ مجھے تقریر کے لئے بھی کہا ـــ اتنے میں ٹیلی ویژن والے سامنے آئے اور انٹرویو پر اصرار کیا ـــ ٹرک سے اترتے ہوئے قریبی ساتھیوں کو ادھر ادھر دیکھا لیکن ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

ٹی وی کیمرے چل پڑے ـــ سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ـــ "یہ ریلی' کراچی کے زخموں کے لئے ابتدائی طبی امداد کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظام میں تبدیلی تب آئے گی جب لوگوں کے مسائل کو خلوص دل سے سمجھا جائے گا۔ نئے چہروں سے حالات میں بہتری کی امید نہیں - یہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔"

جلوس ختم ہوا ـــ ہم سب میٹھادر آکر ٹی وی انٹرویو کا انتظار کرنے لگے ـــ حیرت ہوئی کہ سوائے میرے' باقی سب کے انٹرویو دکھائے گئے۔ ٹیلی ویژن والوں کو فون کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹیپ قبضے میں لے لی گئی تھی ـــ اب عزائم کھل کر سامنے آچکے تھے۔ اگلے روز' حسب وعدہ مجھے صلاح الدین کو انٹرویو دینا تھا..... ہٹ لسٹ پر آنے والے نئے لوگوں کے نام بھی' افواہ کی صورت میں گردش کر رہے تھے ـــ پورے شہر میں خوف و ہراس کی لہر تھی ـــ اسی لہر میں صلاح الدین شہید کر دیئے گئے' انا للہ وانا الیہ راجعون ـــ میرے خدشات کی مزید تصدیق ہو گئی۔

یہی حالات تھے کہ جس کی وجہ سے چند روز تنہا رہنے کا ہنگامی فیصلہ کیا ـــ قتل سے بچنے کے ساتھ' ساتھ سیاست میں زبردستی ملوث کئے جانے سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ دونوں صورتوں میں' میری زندگی اور نصب العین' تباہی کے خطرات سے دو چار تھے۔

لندن پہنچ کر' اپنے دوست کو تمام واقعات بتائے۔ اس دوران مختلف لوگوں کے تبصرے' ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتے رہے کہ ایدھی موت سے ڈر کر بھاگ گیا ہے ـــ انہیں کیا پتہ کہ پاکستان کے لئے خون کا میرا آخری قطرہ پہلے ہی بہہ چکا ہے۔

چوبیس دنوں میں' گجراتی زبان میں ایک دستاویز اپنے ہاتھ سے لکھ دی اور اس کی پانچ

کاپیاں سربمہر کر کے مختلف حلقوں کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیں کہ ـــ اگر مجھے قتل کرا دیا جائے تو یہ دستاویز عام کر دی جائے۔ اس دستاویز میں وہ تمام عوامل لکھے جن سے ملک کمزور ہوا اور نفرتوں کے بیج بوئے جاتے رہے۔

آبائی شہر بانٹوا کا بچپن کا دوست صادق ایدھی ملنے آیا تو اس کی پیشکش پر' لندن کے مضافات میں واقع اس کے فارم میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ یہاں کھانا پکاتا' صفائی کرتا' کھلی فضا میں چہل قدمی کرتا لیکن ـــ تنہائی میں خیالات ستاتے رہتے۔ پرانے دوست سے ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ اسے بتایا کہ 1950ء میں سماجی کام شروع کیا' 1978ء میں ایدھی فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی اور اب 1995ء کے دوران تمام انسانوں کو دعوت دے رہا ہوں کہ سماجی مشن کی تکمیل میں میرا ساتھ دیں تاکہ اس کے ثمرات سے سب لوگ فیض یاب ہو سکیں۔ اسے ایک واقعہ سنایا' جب ایران سے واپسی پر ایک ڈاکٹر نے یہ بات بتائی تھی کہ ..... ایران میں دور دراز دیہات تک بھی مفت طبی امداد پہنچائی جاتی ہے۔ سن کر یقین ہو گیا کہ ایسے لوگوں کا کچھ بگڑ نہیں سکتا۔

اس دوران کچھ ساتھی لندن آکر ملتے رہے۔ موضوع گفتگو سماجی مشن ہی رہا ـــ انہیں بتایا کہ اس کام کو بنیادی سطح سے شروع کیا گیا اور کامیابی ملی۔ یقین ہے کہ لوگ میدان عمل میں آکر ہمارے شانہ بشانہ چلیں گے ـــ ہمارے پڑوسی ملک بھارت کے لئے بھی اپنی خستہ حال معیشت کو سہارا دینے کا یہی راستہ ہے کہ وہ بھی ہماری طرح سماجی بہبود کا پروگرام اپنائے۔ تیسری دنیا کے مفکرین کو بھی یہی انداز اختیار کرنا چاہئے۔ یہ سن کر ساتھی پوچھنے لگے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گا تو انہیں بتایا کہ ـــ "یہ کام آپ لوگوں کا ہے' چاہیں تو فاؤنڈیشن سے رہنمائی لے لیجئے۔ یہ ایک بنا بنایا سسٹم ہے جس کی پیروی کرنا مشکل نہیں۔ ہر ملک' مذہب اور ملت کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے تمام جھگڑے بھی صرف اس صورت میں ختم ہو سکتے ہیں کہ عالمی رہنما ـــ انسان دوستی اور حقوق العباد کو فروغ دیں۔ پہلے بھی کہتا رہا ہوں کہ مزید سات سال تک قدم بہ قدم موقع دیا جائے تو ہمارا سماجی پروگرام خود کفیل ہو جائے گا۔ اس کے بعد مخیر لوگ جو کچھ دیں گے' اس سے ملک کے تمام قرضے اتارنا شروع کروں گا"۔

لندن میں پاکستانی ہائی کمشنر نے بتایا کہ پاکستان کی سینٹ اور پارلیمنٹ نے میری وطن

واپسی کا' بل پاس کیا ہے اور صدر لغاری نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وطن واپس آجاؤں ..... انہیں بتایا کہ یہاں سے غریبوں کی خدمت کے لئے دو ایمبولینس گاڑیاں اور کچھ ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔ اس کے علاوہ کینسر کے کچھ مریضوں کے لئے فنڈز جمع کرنے ہیں جس کے بعد فوراً چلا آؤں گا۔ میری یہاں آمد پر آپ فکر مند نہ ہوں۔

رمضان المبارک' خیرات و صدقات کا مہینہ ہوتا ہے۔ فون پر بتایا گیا کہ منفی قیاس آرائیوں کے باعث' عطیات کا مطلوبہ ہدف کم ہو جائے گا۔ ساتھیوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ یہ مصیبت وقتی ہے۔ جو کچھ بس میں ہو گا' کروں گا"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایدھی فاؤنڈیشن کو پہنچنے والا نقصان عارضی تھا مگر ..... قوم کی نیک نامی کو ایک بڑا خطرہ لاحق تھا۔

آخر کار' 8 جنوری کو پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیڈ آفس کی خواہش تھی کہ میری آمد سے پریس کو بھی مطلع کر دیا جائے لیکن اس خیال سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا کہ ایئرپورٹ پر بھی صرف میرے قریبی ساتھی آئیں۔ ہوائی سفر کے دوران کراچی میں خونریزی کے بارے میں سوچتا رہا کہ اس کلچر کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ سب لوگ' خدا کے سامنے کھڑے ہو کر' ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔ گزرے ہوئے کل کو بھول جائیں اور آنے والے کل پر' اپنے آج کا سب کچھ قربان کر دیں۔

امن و امان کی صورتحال کو آسان اور بہتر بنانے کے لئے کراچی کے حکام کو ایک رائے دی کہ ..... اگر کسی حلقے میں رہنے والے تمام لوگ' سکیورٹی کے نام پر دس روپے فی کس عطیہ دیں تو اس علاقے کی حفاظت کے لئے ایک چوکی بنائی جا سکتی ہے۔ اسے چلانے کے لئے محلے کے لوگ بھرتی کئے جا سکتے ہیں ..... لیکن شاید انہیں یہ تجویز احمقانہ لگی۔ میرے خیال میں اگر کوئی ریاست شہریوں کے جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ پولیس' ڈکیتی کو چوری کا مقدمہ بنا کر درج کرتی ہے جس کے نتیجے میں لٹے پٹے گھرانوں کی تلافی کی بجائے ان کا تمام چھوٹا موٹا سامان برائے تفتیش قبضے میں لے کر' انہیں محرومی و رسوائی کے دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ شاید ..... سارا ملک مافیا گروپوں کی گرفت میں ہے۔

اپنے وطن کو درپیش مسائل کے کئی ممکنہ اور قابل عمل حل دیکھے ہیں ..... مثلاً"

پاکستان کو اگر فری پورٹ قرار دے دیا جائے تو تجارت پر بھارت کی اجارہ داری کم ہو جائے گی اور بیرون ملک شراکت دار' ہمیں تائیوان کے مقابلے میں لاتے ہوئے' ہمارے لئے روزگار کے مزید مواقع پیدا کر دیں گے۔ میرے خیال میں نج کاری بھی ہمیں آگے بڑھا سکتی ہے۔ ریلوے' ٹیلی ویژن اور مواصلات کو خود مختار اداروں میں تبدیل کر دیا جائے تو ان کی افادیت میں اضافہ ہو گا۔

جہاز سے اتر کر لاؤنج میں پہنچا تو عملے' امیگریشن حکام اور ایئرپورٹ سیکورٹی اہلکاروں نے جذباتی انداز میں استقبال کیا۔ کئی لوگ ارد گرد جمع ہو گئے اور ہم سب مل کر ایئرپورٹ سے باہر آئے۔ اپنے گھر کے افراد سے ملاقات ہوئی۔ بیٹیوں کے افسردہ چہرے بتا رہے تھے کہ انہوں نے میری عدم موجودگی میں کتنی پریشانی کا وقت گزارا ہے۔ بلقیس خوشگوار حیرت سے دو چار تھی۔ ساتھیوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

پریس والے میری تلاش میں تھے۔ انہیں اگلے روز میں وہ حالات بتانے کا وعدہ کیا' جن سے گزر کر اپنے نصب العین کو بچایا تھا۔ ان سے یہ بھی کہا کہ میرے بیانات دیکھ لیں اور کچھ لوگوں کے مطالبات اور لہجے میں تبدیلی کا نوٹس لیں۔

معلوم ہوا کہ میرے جانے کے بعد شیئر مارکیٹ میں حصص کی قیمتیں گر کر تین دنوں تک نیچے رہیں۔ تشدد کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا۔ برادری میں سے کسی نے میرے حق میں آواز نہ اٹھائی۔ شاید انہوں نے میری مخالفت کی پرانی روایت برقرار رکھنا چاہی۔ لوگ ٹیلی فون پر میرے متعلق پوچھ کر روتے رہے' انہیں خدشہ تھا کہ شاید اب کبھی واپس نہ آؤں۔ بستر بیماری پر پڑے ایک بزرگ اپنے پوتوں کا سہارا لئے' ہانپتے کانپتے ٹاور کی سیڑھیاں چڑھ کر ملنے آئے۔ کہنے لگے کہ ..... "جب قائد اعظمؒ کی رحلت کا اعلان ہوا تو ان دنوں میں جوان تھا۔ اس روز پورا کراچی شہر فریادی تھا۔ تمہارے بغیر میرا بھی وہی حال ہوا جو جناح کے چلے جانے سے کراچی کا تھا۔ نہ تب کوئی آس تھی' نہ اب ہے"۔

پریس سے ملاقاتوں کا آغاز ہو گیا۔ اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایک ہفت روزہ نے الزام لگایا کہ میں یہودیوں کا ایجنٹ ہوں۔ کیا کچھ نہیں کہا گیا ..... خود ساختہ باتوں کے ڈھیر..... "ایدھی' مردہ انسانی اعضا کا دھندہ کرتا ہے ..... اس شخص نے اتنا روپیہ اکٹھا کیا' وہ کہاں گیا ..... اس کی آڈٹ رپورٹیں دیکھی جائیں ..... اس کے بیٹوں نے امریکی گرین کارڈ

حاصل کر لیا ہے ___ وہاں وہ کئی سٹوروں کے مالک ہیں اور انتہائی قیمتی گاڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں" ___ کچھ اخبارات نے اپنے "معتبر ذرائع" کے حوالے سے یہ بھی لکھ ڈالا کہ ___ "بلقیس ایدھی حال ہی میں بھارت گئی تھیں۔ وہاں سے وہ بے نظیر بھٹو سے جا ملیں جو انہیں اپنے ساتھ' وفد کی حیثیت سے کاسا بلانکا لے گئیں"۔ ___ عجیب جھوٹ تھا۔

کچھ فکر مند صحافیوں نے پوچھا ___ "آخر آپ ملک سے بھاگے ہی کیوں تھے؟ کیا اس سے آپ کا نام اور کریڈٹ متاثر نہیں ہوا؟" میرا جواب تھا کہ ___ " میرا مطلوب و مقصود شہادت کا رتبہ پانا نہیں۔ کسی ستائش یا صلے کے لئے سماجی خدمت نہیں کر رہا۔ میری کارگزاری کے حق میں گواہی دینے کے لئے میری زندگی کے پینسٹھ برس' کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ میرا کام آدھی صدی پر محیط ہے۔ کیا یہ سب' کریڈٹ کے زمرے میں نہیں آتا؟"

ایک اور صاحب نے سوال کیا ___ "عمران خان نے چند ہفتوں میں بارہ کروڑ روپیہ اکٹھا کر لیا ہے۔ کیا وہ آپ سے زیادہ کامیاب نہیں؟" ___ پہلے سوچا کہ خاموش رہوں مگر جواب تو بہر حال ضروری تھا۔ میں نے کہا ___ " عمران کے پاس لوگوں کو دینے کے لئے کچھ اور ہے' میرے پاس کچھ اور ..... میں لوگوں کا ہیرو نہیں بلکہ فقیر ہوں۔ ان کی زندگی کے لئے مزدوری کرتا ہوں ___ ان کے ساتھ ماں جیسی غیر مشروط محبت کرتا ہوں"۔ ایک صحافی نے پوچھا کہ میں عمران کو اپنا حریف کیوں نہیں سمجھتا؟ دوسرا کہنے لگا کہ مجھے عمران کی ضدی طبیعت سے خبردار رہنا چاہئے ___ حیران تھا کہ یہ لوگ ہمارا مقابلہ کیوں کرا رہے ہیں۔ جب کوئی شخص سماجی میدان میں اترتا ہے تو میرے ساتھ مقابلہ کرنے یا آگے نکلنے کا عزم لے کر نہیں آتا۔ اگر اتفاق سے عزائم ایک جیسے ہی ہوں تو باہمی احترام کا مشترک رشتہ ہو گا۔ سماجی خدمت کے میرے گزشتہ پچاس سال لوگوں کی نظروں کے سامنے ہیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہوں' سڑک کے کنارے روٹی کھاتا ہوں ___ گلیوں میں گھومتا ہوں اور پھر گداگروں کے ہجوم میں کھو جاتا ہوں۔ امیر کبیر' خوشحال اور شاہانہ زندگی گزارنے والی شخصیات نے کبھی مجھے اپنا مدمقابل نہیں جانا اور میں نے بھی اپنا موازنہ ان سے کبھی نہیں کیا۔

جن لوگوں نے اپنے مقاصد کے لئے مجھے استعمال کرنا چاہا' وہ میرے فوری رد عمل سے مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ صرف پریشر کی بات کرتے تھے جبکہ ایدھی فاؤنڈیشن کا انحصار اس کے اثاثوں اور لوگوں کے عطیات پر ہے۔ اس دوران فرقہ واریت' سیاست میں

زبردستی گھسیٹنے کی جابرانہ چالوں اور فاؤنڈیشن کو اس کے نصب العین سے ہٹا کر استعمال کرنے کی سازشوں کے خطرات سے بچ کر نکلا ہوں۔ توقع ہے کہ سچائی جلد بے نقاب ہو گی ....." آخر کار 35 اخبارات کے رپورٹروں کے سامنے' سوال جواب کا سلسلہ' چوتھے روز ختم ہوا۔

ایدھی فاؤنڈیشن کو محض کفایت شعاری کی بنیاد پر مستحکم کرتے ہوئے ابتدا میں سماجی بہبود کا پہلا مرحلہ مکمل کیا۔ دوسرے سفر کا آغاز 1994ء کے دوران ہو چکا تھا۔ 1990ء کی ابتداء میں' امریکہ کی ایمرجنسی لائن ..... "یو ایس۔ 911" جیسی فری ٹیلی فون لائن ___ "ایدھی 115" منظور کی جا چکی تھی۔ چالیس فیصد لائنوں کی وساطت سے اسلام آباد' کراچی اور لاہور کو سہولتیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ یہ پراجیکٹ چند برسوں میں مکمل کر لیا جائے گا۔

کچھ ساتھیوں نے ٹیلی فون باکس لگانے کے لئے رقم مانگی تھی۔ طریقہ کار سے متعلق سارا کام مکمل ہو چکا تو یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا کہ اس پراجیکٹ پر مزید ایک روپیہ بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوں ..... یہ سن کر ساتھیوں نے اپنے اپنے دلائل کے انبار لگا دیئے کہ ..... "مولانا! یہ ہمارے لئے انتہائی شرم کی بات ہے کہ جو کام تقریباً" مکمل ہو چکا ہے' ہم بغیر کسی وجہ کے اس سے اپنے ہاتھ کھینچ لیں ___ پراجیکٹ ادھورا چھوڑنے سے بے پناہ مالی نقصان اٹھانا پڑے گا"۔ ساتھیوں کی بات سن کر سوچا کہ اگر سخت رویہ قائم رکھا تو یہ لوگ کہیں کام چھوڑ ہی نہ دیں ___ ان لوگوں سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ مجھے لفظ " مولانا" سے چڑ ہے مگر مجال ہے جو انہوں نے یہ بات یاد رکھی ہو ___ بلقیس اس پر ہنستے ہوئے کہنے لگی ..... "جس شدت سے فاؤنڈیشن کا بھوت آپ کے سر پر سوار رہتا ہے' اتنی ہی چاہت کے ساتھ یہ لوگ آپ کو مولانا کہہ کر پکارتے ہیں"۔

رمضان کے پہلے ہفتے تک' عید کے لئے خوراک اور کپڑوں سے گودام بھر لئے گئے تھے۔ عید سے پہلے ہی تمام ایدھی مراکز کو ان کی ضروریات کے مطابق سامان روانہ کر دیا گیا۔ لوگوں سے ان کے فیملی کوائف' فارموں پر بھروائے گئے اور باقاعدہ تصدیق کے بعد انہیں اشیائے زندگی دے دی گئیں ..... اس طریقہ کار سے ضرورت مندوں کے حالات سے آگاہی کا موقع بھی میسر آیا۔ مارچ 1991ء تک کھارے پانی کی پچاس ہزار ڈرپس (DRIPS) پاکستان بھر کے ہسپتالوں اور ہیروئن کے زیر علاج مریضوں کے لئے سپلائی کر دی گئیں .....

جب بھی کوئی دوا ساز کمپنی عطیئے میں دوائیں' ایدھی فاؤنڈیشن کو دیتی ہے' فوری طور پر تقسیم' انہی خطوط پر کی جاتی ہیں۔

بلقیس نے یاد دلایا کہ شادی کے فوراً بعد کچھ لوگوں نے یہاں پہنچ کر اس سے دفتر کی چابیاں طلب کی تھیں ..... یہ کہانی دوہراتے ہوئے' میں نے بلقیس کو بتایا کہ ..... "انہیں اعتراض تھا کہ میں نے اپنی ایک سٹاف ممبر سے شادی کیوں کی ہے۔ بقول ان کے' یہ شادی اسلامی اصولوں کے خلاف تھی ..... یہ سن کر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ حضور نبی پاکؐ نے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ سے اس وقت شادی کی تھی جب وہ آپ سے شریک کاروبار تھیں۔ کیا یہ سنت رسولؐ نہیں ہے؟ ..... شاید یہ بات سوچنے کا' ان لوگوں کے پاس حوصلہ نہ تھا۔

اس دوران الزام تراشیوں کا سلسلہ جاری رہا ..... ایدھی مصر کیوں گیا تھا اور برطانیہ جا کر کس سے ملا ..... ایدھی کسی گولی کا نشانہ کیوں نہ بن گیا ..... انہیں کون سمجھائے کہ حماقت کی موت مرجانا مردانگی نہیں ہے۔ جب بھی کہا کہ حکومت کو اپنی آئینی مدت پوری کرنی چاہئے تو مجھے پیپلز پارٹی کا حمایتی سمجھا گیا ..... ان تمام بے سروپا الزامات کی وضاحتیں' بارہا کر چکا ہوں۔ بتاتا رہا کہ میں صرف ..... اس ملک کے لاوارث افراد کا حمایتی ہوں جن کی کوئی زبان نہیں ..... اور نہ ہی ووٹ کی اہمیت۔

کراچی میں وحشیانہ قتل و غارت کا بازار ابھی گرم تھا ..... فاؤنڈیشن نے گولیوں سے چھلنی میتوں کو ٹھکانے لگایا اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا۔ سیاست دان محض چکر لگانے میں مصروف تھے ..... وطن واپسی کے ایک ماہ بعد پنجاب کے ایدھی مراکز کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا اور فیصلہ کیا کہ اس دوران میڈیا سے کوئی بحث نہیں ہوگی لیکن جو رپورٹرز' مرتضیٰ بھٹو کے لئے ملتان ایئرپورٹ پر موجود تھے' انہوں نے مجھے بھی دیکھ لیا۔ ان کے سوالوں کے آغاز میں ہی' ارادے بھانپ لئے تھے۔ ملتان کے مقامی انچارج کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے کہا کہ ..... یہ لوگ پھر مجھے "ہیرو" کے ساتھ الجھانا چاہتے ہیں ..... ایک صحافی نے اصرار کیا کہ کرکٹر عمران خان پر کوئی تبصرہ کروں ..... مذاقاً جواب دیا کہ وہ اللہ کا ولی ہے اور میں فقیر ..... ایک اور نے سوال داغ دیا تو جھنجلا کر کہا ..... "بھائی آپ میرا اور اس کا مقابلہ کیوں کرتے ہیں؟ وہ کھلاڑی ہے اور میں اناڑی ..... میں نے ساری زندگی گٹروں' کیچڑ

اور خون میں لت پت گزاری ہے۔ ان کھردرے ہاتھوں سے تقریباً تیس ہزار لاوارث لاشوں کو دفنایا ہے ..... جہاں بھی رہا ہوں' انسانی دکھوں' غربت و افلاس' ناانصافی اور موت کے سوا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملا"۔

میرے لندن جانے سے' تنظیم کو وقتی نقصان تو اٹھانا پڑا لیکن یہ کہانی' اب پرانی ہو چکی تھی۔ ساتھیوں نے کہا ..... "ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کا اصول بھی کوئی مثبت نتائج پیدا کر سکتا ہے۔" انہیں سمجھاتا کہ ..... "ہمارا کام عنقریب ہر قسم کی تباہی سے محفوظ ہو جائے گا اور مزید کچھ عرصہ تک عوام کا تعاون اسی طرح رہا تو قائد اعظمؒ کی عملی سوچ' کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گی"۔

فیصل نے میرے بڑھاپے اور پریشانیوں کا دھیان کرتے ہوئے' امریکہ کی بجائے ادھر ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا ..... بلقیس کو پسند نہ تھا۔ وہ اسے فاؤنڈیشن کے بھاری کم کاموں کے لئے ابھی مناسب نہ سمجھتی تھی۔ فیصل نے کہا ..... "ابا روز بروز کمزور ہو رہے ہیں' دشمنوں میں بھی گھرے ہوئے ہیں۔ میں ان کی ہر طرح مدد کرنا چاہتا ہوں"۔ فیصل بہت جلد فاؤنڈیشن کے معاملات میں مصروف ہوگیا۔ یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ ایک مرتبہ اس نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر ایک بیمار گدھے کو گلی سے اٹھایا اور ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال تک لے گیا۔ فیصل کے فیصلے پر میں نے بلقیس کو تسلی دیتے ہوئے کہا ..... "اگر اس نے خود اپنی مرضی سے انسانی خدمت کو بطور کیریئر چنا ہے تو اچھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ مستقبل میں قابل ذکر صلاحیتوں کا مظاہرہ کرے گا"۔ اس کے باوجود فیصل اور اس کی ماں کے مابین بحث و تکرار چلتی رہی۔

فیصل' نرم مزاجی میں اپنی ماں سے مشابہ تھا۔ اس نے بلقیس سے کہا ..... "امی' آپ ہمیشہ اپنا غصہ ہم پر ہی جھاڑتی رہتی ہیں۔ وہ صبرو تحمل جس کا مظاہرہ آپ مارکیٹ میں سبزی فروشوں کے ساتھ اور دارالامان میں ذہنی مریضوں سے ان کے دکھ درد سنتے وقت کرتی ہیں' گھر میں تو ہم نے اس کا اظہار نہیں دیکھا۔ اب آپ بلڈ پریشر کے باعث کچھ غصیلی ہوگئی ہیں"۔ پھر جب بلقیس نے اس پریشانی کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا تو بہت لطف اندوز ہوا۔

پاکستان کے سیاسی افق پر جو سیاست دان بھی ابھر کر سامنے آیا' اسے یہی باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ فلاحی ریاست قائم کرنے کے سوا حکومت کے پاس بچنے کا کوئی اور راستہ

نہیں ہے۔ بقاء کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ مل جل کر' ایک دوسرے کی مدد سے زندگی گزاری جائے ..... لیکن دکھ تو یہی ہے کہ اکثریت کو خاموش اکثریت کہہ کر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

حکومت اپنی روایت کے مطابق عوامی مسائل سے بیگانہ رہی اور میں ایک فعال نظام حیات کے قیام کی کوششوں میں مگن رہا..... مذہبی لیڈر' لاؤڈ سپیکروں پر خیرات و زکواۃ اور صدقات کے فلسفے بیان کرتے رہے ..... اس صورتحال کو بدلنے کے لئے مزید پچاس سال کون دے گا اور کس کا حوصلہ ہو گا کہ بہتری کا انتظار بھی کرے ..... آدھی صدی نثار کرنے کے بعد اب ..... اگر یہ وقت فصل کاٹنے اور پھل کھانے کا ہے تو ان لوگوں کا راستہ روکنے کا بھی ہے جو فلاحی ریاست کے قیام میں روڑے اٹکا رہے ہیں ..... شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسلامی نظام ہی اصل میں سماجی بہبود کا نظام ہے۔ یہ اسلام کا دل ہے' باقی مذاہب کی بنیاد اور اساس بھی یہی ہے اور عالمی امن و سلامتی بھی اسی میں ہے کہ سماجی بہبود کے نظام کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اپنے خلاف مسلسل الزامات کو ہمیشہ ہی تحمل سے برداشت کرتا رہا ..... بعض اوقات بلقیس سے باتیں کرتے ہوئے لوگوں کی اس عادت پر قہقہے لگاتا ..... "بلقیس' حیران ہوں کہ لوگ آخر مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ بچپن میں مجھے خواب دیکھنے والا شیخ چلی کہا گیا ..... پھر پاگل' کمیونسٹ' فراڈیا' انسانی اعضاء کا سوداگر' یہودی اور بھارتی ایجنٹ ..... ان تہمتوں کی فہرست خاصی طویل ہے"۔ بلقیس کہنے لگی ..... "وہ اصل خطاب تو آپ بھول ہی گئے ..... "دنیا کا سب سے بڑا کنجوس"۔ ذات کی حد تک ان الزامات کو نظرانداز کرتا رہا لیکن جب دیکھا کہ فاؤنڈیشن ان کی زد میں ہے تو سینہ تان کر دفاع کیا۔

آج سے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کو حق و باطل کے درمیان جنگ کا تصور دیا گیا..... سماجی خدمت کے عمل کی بنیاد بھی میں نے اسی تصور پر رکھی۔ یہ نظام قدیم بھی ہے اور آزمودہ بھی ..... اور اسلام نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ انسانی فلاح کا یہ فارمولا ہر دور کے لئے کار آمد ہے ..... پھر بعض لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ یہ تو گزرے زمانے کی باتیں ہیں۔ انہیں علم ہونا چاہئے کہ جہالت اور تعصبات کا خاتمہ بھی سماجی بہبود کے عادلانہ نظام ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ غربت' ناانصافی' بغض' حسد اور نفرت کے

ہولناک سائے تلے غنڈے پرورش پاتے ہیں جو زندگی کی سہولتوں سے محروم لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ اس افراتفری کا نتیجہ عالمی جنگ کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ انتہائی اہم مسائل سے آنکھیں بند کر کے یہی سمجھ لیا گیا کہ ..... سب اچھا ہے۔ اس سے پہلے کہ شدید ردعمل ظاہر ہونے لگے' معتدل مزاج مسلمان ملکوں کو چاہئے کہ وہ سماجی بہبود کا فلسفہ اپنالیں۔

بھارت میں بابری مسجد کی بے حرمتی کے خلاف احتجاج کے طور پر مسلمانوں نے یہاں مندر جلا دیئے اور ہندوؤں کو بھی مارا پیٹا..... جب ایک شخص نے اس پر افسوس کا اظہار کیا تو اسے بڑے پیار سے سمجھایا کہ ..... "مسلمانوں نے ہندوستان پر بارہ سو سال تک حکومت کی ہے۔ آج بھی وہاں بیس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اگر اسلام پر سچے دل سے عمل کیا جاتا تو بھارت کی پچھتر فی صد ہندو آبادی' اپنے دھرم کی غیر انسانی ذات پات سے تنگ آ کر' اسلامی مساوات میں شامل ہو جاتی۔ بابری مسجد کے واقعہ کی بنیاد بھی اسلام سے ہماری صدیوں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ ہماری اسی بدبختی کے باعث آج بھارت میں اسلامی تبلیغ کا راستہ بند ہو گیا ہے ..... ادارہ نے ان اقلیتوں کا بھرپور سماجی تحفظ کیا اور امداد فراہم کی۔

مغرب کی معاشرتی برائیاں بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے لوگوں میں پھیل رہی ہیں۔ ہم ان میں کیا پھیلانا چاہتے ہیں' تعصبات اور غیر مہذب فرسودہ خیالات؟ ..... لیکن دنیا ہم سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ مغربی تقلید کا یہ حال ہے کہ ہم نے جوتے اور گھڑیاں تک ان کے ہاتھوں کی بنی ہوئی پہن رکھی ہیں اور ان کی ساختہ گاڑیوں پر جھومتے پھرتے ہیں۔ مذہبی رہنما خود مغرب کی پیروی کرتے ہیں اور ہمیں ان کا بائیکاٹ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ کیا چکر بازی ہے؟ ..... جو لوگ مسلسل مغربی سازشوں کا ذکر کرتے ہیں' ان سے اکثر کہا کہ ..... "اگر ہم باعمل مسلمان بن جائیں تو اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ..... بلکہ ہمارے عقاید کی عالمی حیثیت کو ساری دنیا تسلیم کر لے گی کیونکہ دنیا کو خود ان کی ضرورت ہے"۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے آج سے بہت پہلے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ مسلمان' مذہبی فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کو تباہ کر دیں گے۔ شان و شوکت اور بادشاہت و آمریت کے خلاف بھرے دربار میں صحابی رسولؐ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا احتجاج ایک خاص رجحان کی ترغیب دیتا ہے۔ انہیں اس حق گوئی کی پاداش میں جلا وطن کر دیا گیا

تھا ..... انقلابی قوتیں اس وقت بھی ناانصافیوں کے خلاف سینہ سپر تھیں ..... آج بھی ہم ایسی ہی صورتحال سے دو چار ہیں۔

ایک مذہبی سکالر نے بڑے غصے میں پوچھا ..... "ایدھی' تم پڑھے کہاں تک ہو؟ نہ تو عالم دین ہو اور نہ ہی تم نے قرآن پڑھا ہے"۔ میں نے نہایت ادب سے جواب دیا ..... "اسلامی تعلیمات میری رگوں میں' خون کی طرح دوڑ رہی ہیں"۔ لیکن ان حضرت نے فرمایا ..... "چونکہ تم کچھ نہیں جانتے' اس لئے تمہیں تبلیغ کا کوئی حق بھی نہیں ہے"۔

اپنے ہمنوا گروپ سے کہا کہ ..... 1996ء کے دوران' میں اور بلقیس' عوام کے پاس ٹوکن فروخت کرنے جائیں گے۔ ہم نہ تو انتظامیہ کو ستون بنائیں گے اور نہ ہی ایجنسیوں کا سہارا لیں گے۔ اگر اس طرح ہمارے کام کی رفتار ست رہی یا ان میں کوئی تاخیر واقع ہوئی تو کوئی پرواہ نہیں ..... ہمیں کوئی جلدی نہیں کیونکہ باکسنگ میں بھرپور داد' پوائنٹس پر نہیں بلکہ ناک آؤٹ کر دینے میں ملتی ہے ..... ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے انداز میں قدم بقدم آگے بڑھتے رہیں۔

سازش کی کہانی ..... ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بتایا گیا..... کہ کچھ لوگ ہفت روزہ تکبیر کے مقتول ایڈیٹر صلاح الدین مرحوم کے سوگوار اہل خانہ کے پاس گئے اور انہیں ترغیب دی کہ وہ اس دستاویز پر دستخط کر دیں کہ صلاح الدین کو ایدھی نے قتل کیا تھا۔ صلاح الدین مرحوم نے ایک مرتبہ میرے خلاف اپنے جریدے میں ایک آرٹیکل لکھا تھا جس پر بعد میں وہ پشیمان بھی ہوئے اور اشاعت پر معذرت بھی کر دی ..... ہم دونوں ایک عرصے کے بعد کراچی ریلی والے روز اکٹھے ہوئے تھے جہاں ایک رسمی ملاقات اور مختصر سی گفتگو ہوئی ..... مزید کچھ نہیں۔

ساتھیوں سے کہا کہ ان لوگوں کو میرا چیلنج ..... تباہ کرنے کی اب بھی آرزو ہے۔ صرف وہی نہیں' اور بھی بہت سارے لوگ اس سسٹم کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ میں کہوں گا کہ معروف لوگوں کو مجھے گرائے بغیر کچھ مزید قابل قدر ادارے تشکیل دینے چاہئیں کیونکہ میرا کسی سے مقابلہ نہیں ہے ..... میرا تو اجتماعی کام ہے جس کی انہیں مخالفت کی بجائے معاونت کرنی چاہیے ..... تنہا رہ کر کام کرنے سے بہتر ہے کہ مل جل کر کام کیا جائے جس سے ان کے نام اور شہرت میں اضافہ ہوگا۔

چار سال قبل میں نے کینسر ہسپتال بنانے کے لئے کراچی کی مشہور طارق روڈ پر ایک عمارت خریدی جس نے 1994ء میں کام شروع کر دیا اور جہاں کیمو تھراپی اور دیگر اقسام کا علاج مفت تھا۔ ریڈی ایشن کی باقی سہولت جناح ہسپتال نے فراہم کر دی تھی۔

حکومتی صحت ریکارڈ کے مطابق جس رفتار سے سرطان کے مریض برائے علاج آ رہے تھے یا لائے جا رہے تھے' تلاش و جستجو کا عمل اس کے مقابلے میں ست تھا۔ لوگ عموماً" تشخیص سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں لوگوں کے پاس معمولی ادویات حاصل کرنے کے ذرائع بھی نہیں ہوتے جبکہ امیر لوگ تو آخر دم تک اس مرض کو خاموش اذیت ..... کے ساتھ دبائے رکھتے ہیں۔ دوسری جانب مفلس و نادار افراد ..... مرتے دم تک حکیموں کی بھینٹ چڑھے رہتے ہیں اور جب کسی مناسب ہسپتال تک جانے کا وقت آتا ہے تو وہ اس سے پہلے ہی دم توڑ چکے ہوتے ہیں۔

غیرملکی ٹیم' معائنہ کے لئے ہسپتال پہنچی تو انہیں بتایا گیا کہ ہمارے لوگ رشتوں کی آگ میں مل کر جلنے کے عادی ہیں اور یہ بندھن اس قدر مضبوط ہیں کہ جب ایک بیمار کو کسی دور دراز علاقے سے شہر لایا جاتا ہے تو اس کی زندگی کے لئے دعائیں مانگنے اور رونے والوں کی ایک ٹیم اس کے ساتھ آتی ہے۔ ہم انہیں ایدھی گھروں میں ٹھہراتے ہیں' ان کے طعام وقیام کی ذمہ داری بھی ہماری ہی ہوتی ہے' ماہر سٹاف کی نگرانی میں لواحقین ان کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔ چونکہ کینسر مریضوں کے مناسب علاج کے لئے شعاعوں سے علاج کی ضرورت بھی آن پڑتی ہے اس لئے جناح ہسپتال کے کچھ ماہر ڈاکٹروں کو ایکسپرٹ رائے اور علاج کے لئے بلوایا جاتا ہے۔ جب مریض بڑھ جاتے ہیں تو انہیں مختلف ہسپتالوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ طارق روڈ والے ہسپتال میں مریضوں کی "کیمو تھراپی" کی جاتی ہے ..... اس سلسلے میں لندن ایدھی فاؤنڈیشن نے ایک معاہدے کے تحت برطانیہ کے ایک معروف ہسپتال میں علاج معالجے کی سہولتیں بھی دے رکھی ہیں۔

غیرملکی اخباری نمائندہ جب واپس میٹھادر آیا تو اس نے عمران خان اور ہمارے کینسر ہسپتالوں کا موازنہ کرنا چاہا مگر میں نے کہا کہ موازنہ کیسا؟ صحت کے میدان میں کچھ ایسے اہم معاملات بھی ہیں' جنہیں کسی طور پر سرطان کے مقابلے میں کم تر نہیں گردانا جاسکتا۔ غریبوں کو بھی بنیادی طبی سہولتوں کی ضرورت ہے۔

میں کسی صورت بھی امراض سے متعلق سپیشل ہسپتالوں کا مخالف نہیں ہوں۔ پبلک سرمایہ تو جب محفوظ سمجھا جاتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جائے۔ میری ناقص رائے ..... یہ ہے کہ کسی مفید ادارے کو ہسپتال میں تبدیل کر دیا جائے اور اگر اس کا تعلق غریبوں کے مفادات سے ہے تو اس کا احترام بھی ..... گنگا رام اور میو ہسپتال کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ ٹائم میگزین کے اخبار نویس نے کہا کہ میں نے پورے برصغیر کے اداروں میں جو صلاحیت کار ایدھی فاؤنڈیشن میں دیکھی ہے' وہ کہیں نہیں دیکھی ..... یہ جان کر مجھے بہت اطمینان ہوا۔

کراچی میں وحشیانہ قتل و غارت کے واقعات روز کا معمول بن چکے تھے۔ اب اگر کسی کو مرنا تھا تو اسے کسی گروپ یا سیاسی جماعت سے وابستگی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کوئی شخص کسی مقام پر بھی اور کہیں بھی گولی کی زد سے محفوظ نہ تھا۔ کاروباری مراکز' ریستوران' مساجد' دفاتر اور گھر ..... کیا غریب اور کیا امیر ..... تمام مہلک ہتھیاروں کی زد میں تھے۔ جس شہر میں بیس تیس جنازے روزانہ اٹھتے ہوں اور انہیں رات کے اندھیرے میں اونچی آواز میں کلمہ شہادت پڑھے بغیر دفنا دیا جاتا ہو' وہاں کی کیا خبر اور کیا اخبار ..... جب امریکہ کے دو سفارتی اہلکاروں کو دفتر جاتے ہوئے راستے میں قتل کر دیا گیا تو امریکہ اور دیگر مغربی ممالک بھی اس بدنصیب خطے میں تشدد کے واقعات کی جانب متوجہ ہوئے۔

ایسی صورت میں کہ مذہبی' لسانی اور گروہی طبقات پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہوں' وائرلیس پر تمام ایدھی ایمبولینس گاڑیوں کو ہدایت دی کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ کام کے سوا اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں۔ متاثرہ افراد کو اٹھائیں اور جلد از جلد ہسپتالوں تک پہنچائیں۔ ہمارا کام نصیحت یا تنقید کرنا نہیں۔

ورکروں نے دن رات کام کیا ..... یہ لوگ وہاں تک بھی گئے جہاں پولیس اور رینجرز کو جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ قیامت کی اس گھڑی میں کسے ہوش تھا کہ وہ ہمارے رضاکاروں اور ایمبولینس گاڑیوں کے کردار کو اگلے روز کے اخبارات میں نمایاں کر کے شائع کرتا ..... جو تھا ٹھیک تھا۔ ہمیں بھی پسند نہیں کہ اس بارے میں ہمارا اشتہار لگایا جائے ..... یہی سمجھو کہ زیر زمین کوئی کام کر رہے ہو کیونکہ خدمت کے صلے میں یہ وقت کسی تحسین و آفرین کے لئے مناسب نہیں ہے ..... میں نے سٹاف کو یہ کہہ کر تسلی تو دی لیکن ایک سرکاری افسر کو

اتنا ضرور کہا کہ جب بہت سارے لوگوں نے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا رکھا ہو تو اس کا مطلب ہے کہ یہ یقیناً کوئی قابل رحم معاشرہ ہے ..... اگر کام کا کریڈٹ نہ دیا جا رہا ہو اور میرے زندگی بھر کے اعتماد کو گھائل کیا جا رہا ہو تو پھر کام کرنے کی تحریک اور حوصلہ ..... دونوں متاثر ہوں گے اور ایدھی فاؤنڈیشن کے کارکنان' لوگوں کے مفادات کے لئے اپنی زندگی کو پرخطر بنانے سے گریز کریں گے ..... آپ اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟

پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے عزائم' موجودہ حالات کو جوں کا توں دیکھنے کی شرمناک آرزو اور اپنی ذات کے لئے خصوصی عہدوں کا حصول ..... یہ سب کچھ ایک دوسرے سے مشابہ تھا۔ ان میں اتنی توفیق نہ تھی کہ میں جس کام کی تعمیر کر رہا تھا' وہ اس کا حوصلہ بڑھاتے یا اس کے لئے اپنے منہ سے کوئی کلمہ خیر نکالتے ..... کیونکہ جو لوگ کرپشن اور بددیانتی کے زینے چڑھ کر اوپر کی منزلوں تک پہنچے تھے' ان کے لئے میں کسی حوالے سے بھی موزوں نہیں تھا..... میں کسی سیاست دان سے وابستہ نہ تھا' کسی سے عداوت بھی نہ تھی اور ..... کوئی غرض نہ تھی کہ کون اقتدار میں ہے اور کون اقتدار سے محروم ..... نہ ہی مجھے کسی اور مارشل لا کا دھڑکا تھا۔ میرا کام توڑ پھوڑ' آمریت اور اس کے اثرات کے باوجود اپنے ہی انداز میں چلتا رہا۔ کرپشن اور دوسری واضح برائیاں راستے کا پتھر نہ بن سکیں......

جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے کام کا صلہ ہمیشہ ایک قدرتی انعام کی حیثیت سے ملا ہے تو میں اس بارے میں یہ کہتا ہوں کہ ..... خدا اس پر قادر ہے کہ وہ استحقاق کے بغیر ہی جسے چاہے اور جس قدر چاہے' عطا کرے۔ ایک کی بجائے اگر دس ایدھی اور دس بلقیس ..... پیدا ہو جائیں تو کس کام کے! ..... شخصیات پر زور دیا جائے تو خوشامدیوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

لوگ اعتراض کرتے کہ میں غیر مسلم زخمیوں کو ایمبولینس میں کیوں اٹھاتا ہوں ..... انہیں تو یہی کہہ سکتا تھا کہ میری ایمبولینس تو تمام دکھی انسانوں کیلئے ہے' نہ کہ کسی طبقے یا گروہ کیلئے ......!

کچھ لوگ معترض ہوئے کہ اتنے برسوں کی کمائی کے باوجود ایدھی کے پاس ابھی صرف سوزوکی ایمبولینس ہی کیوں ہے ..... اس نے سوزوکی کی جگہ ٹویوٹا وین کا فلیٹ کیوں نہیں کھڑا

کرلیا ـــ فاؤنڈیشن کے عزائم میں یہ شامل نہیں ہے کہ ایک اور وی آئی پی سروس مہیا کر دی جائے جب کروڑوں عوام بنیادی ضروریات کے لئے ترستے ہوں ـــ ہم چونکہ ان سہولیات کا دائرہ خاص و عام تک لامحدود کر دینا چاہتے ہیں اس لئے امیر کو بھی اسی ایمبولینس پر اکتفا کرنا ہو گا جو غریب کو ہسپتال تک لے جاتی ہے۔ اگر ایک فی صد کو ہمارا طریق کار پسند نہیں تو کیا ہوا' ننانوے فیصد کی تو یہ ضرورت ہے۔

بعض اوقات فاؤنڈیشن میں اضافوں کا مطالبہ سن کر جھلا اٹھتا ـــ اگر وہ کہتے کہ سروس ناکافی ہے' اس میں وسعت کی جائے تو کہا ـــ "یہ وسعت تو حرام کی کمائی اور سود کے روپے ہی سے ہوسکتی ہے۔ صاف صاف بتا دیا جائے کہ بابا تمہاری سروس ہمیں نہیں چاہیے۔ میں کام کی تلاش میں کسی اور جگہ سدھار جاتا ہوں۔ دنیا ضرورت مند لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم ہر اس مقام پر کام کرسکتے ہیں جہاں غریب بستے ہیں ـــ یہ نظام کسی جگہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے ـــ بیرون ملک کے کئی حکمرانوں نے مجھے اپنے یہاں کی شہریت پیش کی ہے اور ہمارے کام کو فروغ دینے کے لئے ایک گھنٹہ ٹیلی ویژن پروگرام کی بھی آفر کی ہے۔"

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ایدھی انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے کاموں پر مبنی ایک دستاویزی پروگرام' جرمن ٹیلی ویژن پر دیکھا جس سے لوگوں میں اچھا خاصا مثبت ردعمل مرتب ہوا اور یہی وجہ تھی کہ جرمن صدر نے آنے والے موسم بہار میں اپنے پاکستان دورہ کے دوران ایدھی فاؤنڈیشن آنے کی بھی خواہش ظاہر کی۔ اس طرح بیرون ملک بھی پاکستانیوں کے وقار میں اضافہ ہو رہا ہے۔

فیصل بہت ہی پرجوش رضاکار کی حیثیت سے ابھرا ـــ اس نے رائے دی کہ سٹاف کو ایک ایسا خوشنما اور منفرد ورکنگ لباس پہننا چاہیے جس سے وہ سمارٹ بھی لگیں اور ورکروں کی حیثیت سے پہچانے بھی جا سکیں ـــ میں نے فیصل سے اس یونیفارم کا نمونہ مانگا اور دیکھتے ہی منظور کرلیا۔

جب دیگر تنظیموں نے' قومی اخبارات کے آدھے پہلے صفحے پر زکوۃ و صدقات سے متعلق اشتہار دیا اور عید سے چند روز قبل کھالیں عطیہ کرنے کی گزارشات کو بھی دہرایا تو ایک سینئر صحافی نے تجویز دی کہ میں اپنے خلاف گھات میں بیٹھے دشمنوں کا مقابلہ اخباری اشتہارات سے ہی کروں ـــ جواب دیا کہ تشہیر پر خرچ اخراجات ـــ میرا طریق کار نہیں

ہے۔ پبلسٹی پر اتنا زیادہ روپیہ اگر اڑا دیا جائے تو اس سے فاؤنڈیشن کی ساکھ بھی گھٹ جائے گی۔ میں نے تو اپنی تنظیم کو میڈیا کا کبھی محتاج بننے نہیں دیا ـــ اگر ہمارا کام اس قابل ہے تو ٹھیک ورنہ کیا میڈیا اور کیا اشتہار ـــ!

مجھے یاد ہے کہ اس روز عید تھی جب بلال مجھے بے ساختہ یاد آیا اور نماز فجر کے بعد ہم اس کی ننھی قبر پر دعا مانگنے گئے ـــ آج بھی کئی سال بعد دل کا یہی حال ہے کہ جب وہ یاد آتا ہے تو پھر کئی کئی گھنٹے ـــ کچھ بھی دھیان میں نہیں رہتا......

عید تقریبات کے بعد میں نے انفارمیشن بیورو سے فون کرکے پوچھا کہ کھالوں کی آمد کا کیا حساب ہے ـــ کراچی کے حالات اور پورے شہر کی گروہی تقسیم کے باعث ہماری اب کی مرتبہ کی فراہمی گذشتہ کئی سالوں سے کم تھی ـــ پنجاب کی آس تھی پر وہاں کے معاملات بھی پچاس فیصد کم رہے ـــ زکوۃ کے حسابات دیکھے تو ادھر بھی صورت حال ٹھیک نہ تھی۔

میرے دوست یہ سب جان کر تھوڑے اداس ہوئے ـــ مگر مجھے انہیں دیکھ کر ہنسی آگئی۔ ہاں میں شکستہ دل ضرور ہوں مگر میں نے ابھی ہار نہیں مانی ـــ یہ ایک وقتی دھچکا ہے ـــ جس نے ہمیں کارکردگی کا از سر نو جائزہ لینے کے لئے پھر سے متحرک کیا ہے۔

بلقیس نے گھر میں اپنے طور پر حالات میں پھر سے بہتری لانے کی ایک کوشش شروع کر رکھی تھی ـــ میں نے دیکھا کہ فیصل کچھ پریشان تھا ـــ شاید وہ اپنا اضطراب بیان کرنے میں کسی حد تک جھجک محسوس کر رہا تھا۔ کہنے لگا ـــ "جس طرح دوسرے لڑکوں نے آپ کو سخت حالات میں کام کرتے دیکھا اور پھر آپ کی پیروی کرنے لگے' میں بھی انہی کی طرح اس مشن کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں جس کی تکمیل کے لئے آپ ابھی تک اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں ـــ اگرچہ میں اپنے ارادوں سے مطمئن ہوں کہ خوب سے خوب تر کرکے دکھاؤں گا مگر اس سے پہلے مجھے آپ سے بھی کچھ سیکھنا ہے۔"

کبریٰ کو حالات نے جذباتی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا' اس کے چہرے پر جیسے شام ڈھل رہی تھی ـــ اب وہ شاید الزامات اور نقصانات کے باعث پریشان تھی ـــ اس نے اپنی ماں سے کہا ـــ "ابا نے تو اپنا سب کچھ کام پر نثار کر دیا ہے' ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے خوابوں کو تعبیر دیں۔ میں اس مقصد کے لئے اپنی پوری زندگی کو عطیے میں دیتی ہوں ـــ" اس کے بعد کبریٰ نے باقاعدگی اور لگن کے ساتھ کام جاری رکھا...... وہ ایک اچھی منتظم تھی۔ اس نے دوران کار'

نرسنگ کے سارے نظام کو مربوط اور پاکستان میں سپلائز کو مستحکم کیا۔

جب مجھے پتہ چلا کہ قطب بھی پاکستان واپس آنا چاہتا ہے تو میں نے بلقیس سے کہا کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے ..... اگر وہ واپس آنا چاہتا ہے تو اس کا یہی مناسب وقت ہے ..... اسے مت روکو ..... الماس بیشتر اوقات اپنے گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ..... جاوید نے بتایا کہ وہ نماز سے فارغ ہوتی ہے تو اپنے آپ کو قرآن کی تلاوت میں مصروف کر لیتی ہے ..... اور پھر مصلے پر بیٹھ کر میرے اور فاؤنڈیشن کیلئے رو رو کر دعائیں مانگتی ہے ..... جاوید نے پوچھا کہ تم فاؤنڈیشن کا نام لے کر کیوں روتی ہو؟ ..... جواب تھا ..... "کیا کروں' بابا کا نام لیتی ہوں تو زبان پر فاؤنڈیشن کا نام بھی آ جاتا ہے ....."

ہمارے مراکز کے دارالامانوں میں زندگی سے بے خبر' معذور اور ذہنی پسماندہ بچوں کو میرے مسائل کا کیا پتہ ..... وہ تو اپنی آنکھوں میں ڈھیر ساری تمنائیں اور دعائیں لئے دوڑتے میرے پاس آتے اور لپٹ لپٹ جاتے ..... انہیں میں بلاناغہ ہر جمعے کو ایدھی ولیج جا کر نہلایا کرتا تھا' وہ مجھے دیکھتے ہی ..... مولانا ابو آگئے' مولانا ابو آ گئے ..... کی حسرت انگیز صدائیں لگاتے جنگلے کی طرف دوڑ پڑتے۔ میں اچھلتے کودتے اور گرتے پڑتے بچوں کے سروں پر گندھک ملے پانی کو ڈالتے ہوئے یہ دعا بھی مانگتا ..... "اے میرے اللہ ..... مجھے اپنی بارگاہ سے سونپے گئے فرض کی ادائیگی کے لئے مہلت عطا فرما ..... اگر میرا وقت پورا ہو چکا ہے تو پھر اس کام کی تکمیل کے لئے کسی اور کو مقرر فرما ..... تاکہ تیری قدرت کاملہ ان بے چاروں کو برباد ہونے سے بچا لے جن کا کوئی گھر نہیں ....." جب وہ نہا رہے ہوتے ..... ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے ہوتے اور مجھے گلے لگا کر پیار کرتے۔ تو ایسے لگتا جیسے رکا ہوا پانی ایک بار پھر سے چلنے لگا ہو .....

میں اپنے چھوٹے سے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ جس حالت میں اسے چھوڑ کر گیا تھا' اس میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ سٹور کے ساتھ برتن اسی طرح پڑے تھے------ ایک ننگی چارپائی جس پر میرے ماں باپ نے دم دیا تھا ..... اور ایک خالی ٹوکری ..... میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو سامنے گلی میں وہی عالم تھا ..... کل اور آج میں کچھ فرق نہ تھا ..... گلی سے پار وہی فروٹ والا دکان لگائے کھڑا تھا اور پرانی یادوں کے حوالے سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

بلقیس نے فرش دھویا' سارے گھر کو صاف کیا ..... اور ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے

لگے------ بلقیس' میں دعا کرتا ہوں کہ ہم فاؤنڈیشن کو جیتے جی حوالے کر دیں اور باقی زندگی یہاں آکر چین سے بسر کریں مگر وہ خاموشی سے چھت کو گھورنے لگی اور پھر سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ..... "یقین نہیں کہ آپ کبھی ریٹائر بھی ہو سکتے ہیں ..... قبر میں بھی کسی نئے پلان کے تحت سماجی کام کرنے لگ جائیں گے"۔

بلقیس جھاڑ پونچھ سے فارغ ہو چکی تو چارپائی پر بیٹھ کر مجھے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی------ میں نے اپنی بساط کے مطابق سارا گھر' گھر کے تمام فرش' کھڑکیاں' الماریاں' دروازے اور دیواریں گیلے کپڑے سے صاف کر دیں------ کام کے دوران میں نے بلقیس کو کہا ..... "سوچتا ہوں' جب کرنے کو کچھ نہیں ہوگا تو میں کیا کروں گا .....؟ شاید معاملات پر غور و فکر کیا کروں گا اور لوگوں کے درمیان ثالثی کے فرائض سرانجام دوں گا ....." بلقیس نے فوراً" میری اس خیال آرائی کو مسترد کرتے ہوئے کہا ..... "آپ تھوڑی دیر کسی جگہ بیٹھیں گے تو کچھ کریں گے ناں .....؟"

ظاہر ہے کہ زندگی اب اپنے انجام کے قریب تھی کہ ہم دونوں کی عمروں سے بھی یہی کچھ لگ رہا تھا۔ اس کے بال تو ابھی کم کم بھورے اور خاکستری تھے مگر میرے تو ایک دم برف کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ذیابیطس کے مریض تھے اور کام کی زیادتی نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ گھمبیر سوچ' ماں کی بھولی بسری یادیں بھی اپنے ساتھ لپیٹ لائی ..... میں نے اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک دھار کو بہہ نکلنے سے پہلے جذب کر لیا ..... یہ میری ماں ہی تھی جس نے میرے دل میں عوامی خدمات کے جذبات یہ کہہ کر بھر دیئے تھے کہ دنیا بھر میں اس وقت تک تمہاری کوئی اہمیت نہیں جب تک تم خدا کے بندوں کی مدد نہیں کرتے ..... ہم نے رابعہ ماں کی زندگی کو یاد کیا۔ ان کی جدائی ہمارے خاندان کے لئے ناقابل تلافی نقصان ثابت ہوئی۔ بلقیس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا ..... "شکر ہے' ہم نے اپنی ماؤں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی اپنی زندگی گزار دی ہے ....."

ماں کے ان الفاظ نے ایک بار پھر میرے ذہن میں شمع روشن کر دی کہ ..... "تمہاری ذمہ داری تو صرف اتنی ہے کہ تم محنت کرتے رہو' نتائج خدا پر چھوڑ دو" ..... واقعی کسی کو بھی نتائج پر دسترس حاصل نہیں ہے اور نہ ہی بہترین کوشش اور محنت کے صلے کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ ہمارا کام تو صرف محنت کرنا اور اجر کی آس میں زندہ رہنا ہے......

باوجود اس کے کہ حالات بے حد تشویش ناک تھے' میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں ابھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ پشاور واپس جاتے ہوئے بلقیس سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا ۔۔۔ میرے نزدیک سماجی خدمت ہی پاکستان کی سلامتی کی ضمانت ہے۔ میں اپنی ہر سانس کے ساتھ اس کی بقا و سلامتی کے لئے دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔

پشاور میں اپنے ڈیسک کے پیچھے گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ کوئی بھی غیر ضروری طور پر میرے خیالات کا تسلسل نہ توڑتا۔ ہر شخص میرے احترام میں پنجوں کے بل آتا اور اسی انداز میں کمرے سے باہر چلا جاتا۔ کارکن لڑکیاں سرگوشیوں میں مصروف رہتیں اور میرے ساتھی آنے جانے والوں کے معاملات نمٹاتے ۔۔۔ اور جب اچانک مجھے ٹیلی فون گھنٹیوں اور رکشاؤں کے شور کا احساس ہوتا تو فوراً جا کر اپنے آپ کو غسل خانے میں بند کر لیتا تاکہ خاموشی بھی میرے ساتھ چلی آئے۔

میں ایک مرکز سے دوسرے مرکز تک مسائل کو حل کرتا' کہیں جھول نظر آتا تو اسے سلجھاتا اور ضروری ہدایات دیتا ۔۔۔ اور اس دوران جب کبھی فراغت کا کوئی لمحہ ہوتا تو چپ چاپ کبھی آسمان کی طرف دیکھتا اور کبھی جھک کر اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیتا کہ اتنے میں کوئی آواز ۔۔۔ خاموشی کو توڑ کر رکھ دیتی۔

ایک روز' گاڑی چلا کر ٹاور جا پہنچا اور وہاں پر اپنے ساتھیوں سے اب تک کے باقاعدہ عطیہ گزاروں کی تفصیل چاہی۔ رات گئے تک ہم قابل اعتماد ذرائع کا حساب لگاتے رہے اور ان مخیر لوگوں کی فہرستیں تیار کرتے رہے جنہوں نے کم نصیب افراد کے لئے ایک سسٹم تشکیل دینے میں مدد کی ۔۔۔ تقریباً" چھ گھنٹے کے حسابات کے بعد ہم نے ادارے کو صرف معتمد گروپ کی اعانت تک محدود کر لیا اور نئے طریقہ کار کا اعلان کر دیا۔

ہم نے اپنے تمام دیہی مراکز کو ایک دری' بلیک بورڈ اور چاک دے کر عام خواندگی کے پہلے مرحلے کا آغاز کر دیا۔ تعلیم دینے کے لئے مقامی لوگوں کو الاؤنس کی بنیاد پر مقرر کیا گیا ۔۔۔ پروگرام یہ تھا کہ عورتیں اور بچے نماز مغرب اور عشا کے درمیانی وقفے میں پڑھیں گے اور ایسے ہی وقت میں ہم نے چھوٹے قرضوں کے بحالیاتی پروگرام کا آغاز بھی ہر پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر پورے پاکستان میں شروع کر دیا ۔۔۔ اپنے رضاکار ساتھیوں سے کہا کہ تنظیم کے علاوہ کوئی دوسری خبر مجھے نہ سنائی جائے۔ سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے

دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ مولانا ۔۔۔ ہم نے اس قسم کی بات پہلے کب کی تھی؟ ۔۔۔ میں نے یہ سن کر انہیں سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میرے بارے میں کوئی خبر ہو تو مجھے نہ دی جائے ۔۔۔ یہ بھی نہ بتایا جائے کہ نیٹ ورک کو کس انداز میں چلایا جا رہا ہے۔

ساتھیوں کے حواس بھی بجا ہوئے ۔۔۔ تمام گئے گزرے واقعات' ان کے مابعد اثرات اور مالی نقصانات کو پہلے پہر کا خواب جان کر بھلا دیا گیا۔ کسی بھی بڑے کاروبار میں یہ صدمات تو معمول کے واقعات ہیں ۔۔۔ اب میں سنبھل چکا تھا اور سب کچھ دیکھ سن رہا تھا جبکہ لوگوں کے نزدیک میں عائلی بکھیڑوں' قومی جھگڑوں' لوگوں اور ان کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ میرے ساتھی بغیر کسی تردد کے اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور میں اس دوران کئی دنوں تک اپنی انتظامیہ کی کارکردگی کی پورے غور و خوض کے ساتھ چھان بین کرتا رہا-----

میں نے ایک ایک کر کے تمام سینئر کارکنوں کو باور کرایا کہ نئے آنے والوں کے لئے تمہارا تجربہ راستے کا چراغ ہے۔ انہیں سب کچھ تم ہی سے سیکھنا ہے اور یہی تمہاری جان کا وہ عطیہ ہے جو تم نے تنظیم کے نام کیا تھا۔

ٹاور میں زندگی پھر سے لوٹ آئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے گاڑی کو گھمایا ہی تھا کہ سامنے سے بلقیس بھی رکشے میں بیٹھ کر گلی میں آ گئی ۔۔۔ پہلے تو ہم ایک دوسرے کو کراس کرتے گزر گئے مگر اچانک وہ بھی اتر گئی اور میں بھی ٹھہر گیا ۔۔۔ وہ آئی اور میری گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے تاثرات دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا ۔۔۔ اور بڑے نرم لہجے میں اسے کہا کہ ہماری زندگی کے یہی کچھ آخری سال ہمارے پاس بچ رہے ہیں۔ آؤ کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے' اسے بھی دکھی لوگوں پر نچھاور کر دیں ۔۔۔ یہ سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکرا دی۔

میں جانتا تھا کہ ایک غم گسار عورت نے جن عذابوں کو زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رکھا' وہ بے حد و بے حساب تھے' جنہیں اس نے کبھی بیوی' کبھی ماں اور کبھی ایدھی فاؤنڈیشن کی درد آشنا کے روپ میں جھیلا ۔۔۔ لیکن کام کی مصروفیات کے باعث' شاید میں اس کے دکھ بانٹنے کے لئے مناسب وقت نہ دے سکا۔

بلقیس مڑ کر چلنے لگی تو میں ایک لمحے کے لئے اسے دیکھنے ٹھہر گیا ۔۔۔ یہ سوچ کر کہ ہر

کسی کے لئے دنیا سے جانے کا ایک وقت معین ہے ..... کون جانے، پہلے کس نے جانا ہے ..... اس اٹل حقیقت کو سوچ کر میرا دل ڈوب ڈوب گیا ..... اکیلے جینا کتنا مشکل ہو گا...... پھر اس خیال کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کی اور تیزی سے میٹھادر روانہ ہو گیا۔

میٹھادر ..... میٹھے پانی کا سرچشمہ!

"آج کا جوڑا"



عبدالستار ایدھی



بلقیس ایدھی

"کل کے کارکنان"



فیصل ایدھی



کبرا ایدھی

باب دوازدہم

دو گز زمین

فجر کے وقت، میٹھادر آفس کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھے، ماضی کی یادوں میں کھو گیا، جب آج سے چالیس سال پہلے اسی جگہ اپنے سامان کی گٹھڑی ایک طرف رکھ کر بیٹھا تھا.... اس روز بھی یہی چودہ فٹ کچا راستہ، گلی کی دونوں اطراف نکلتا تھا۔ آج ہی کی طرح سبز مسجد کے میناروں سے ..... اللہ اکبر، اللہ اکبر..... کی صدا بلند ہوئی تھی۔ تب بھی گہما گہمی کا یہی عالم تھا۔ صرف وقت کے ساتھ انسانوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ بکھرا ہوا ہجوم، پک اپ گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، ریلے اور تانگے ..... ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں سکوٹر..... ٹوٹے سائلنسروں والے رکشے، جو شور مچاتے ہوئے، تنگ راستوں سے گزرتے..... مسلسل ہارن بجاتے ڈرائیور ..... جنہیں راستہ ملے نہ ملے، تیز رفتاری سے رواں دواں تھے۔ شاید انہیں زندگی موت کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

آج گندگی کے وہ ڈھیر ذرا کم تھے ..... ان وقتوں کے ادھیڑ عمر لوگ، آج جھک کر چل رہے تھے۔ صرف بے راہ رو نوجوانوں نے ہر سو بے ترتیبی پھیلا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ سب کچھ ماضی جیسا تھا۔

اس ماحول میں، ان پرانی عمارتوں کو دیکھا جہاں غریب و متوسط طبقے کے لوگ، زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے تھے ..... گیلے کپڑے اب بھی بالکونیوں پر سکھائے جاتے تھے، تنگ سیڑھیوں کو ڈھکنے کے لئے آج بھی بانس لگائے گئے تھے۔ یہ سلسلہ بیٹھکوں تک، اسی طرح تھا۔

پینسٹھ سال کی مسافت نے، جہاں میری داڑھی سفید کر دی تھی .... وہاں اردگرد کی ہر چیز بھی بدل گئی تھی۔ 1951ء میں تعمیر کردہ چھوٹی سی ڈسپنسری، اب تیسری، چوتھی منزل تک بڑھ گئی تھی .... اسی مقام سے میں اپنے آپ کو گھسیٹ کر ان دکھی انسانوں تک لے گیا تھا جو مجھ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ پاکستان کے طول و عرض تک پھیلے ہوئے نیٹ ورک کو.... آج ایک کمرے پر مشتمل ٹاور سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔

1990ء تک ایدھی ایمبولینس گاڑیوں کی تعداد ساڑھے چار سو سے زائد ہو گئی تھی .....

اندازہ ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہ تعداد، آٹھ سو، ہزار تک ہو جائے گی (انشاء اللہ)۔ قومی سطح کی یہ مثالی پبلک سروس، جدید مواصلاتی نظام سے لیس، ملک کے دور افتادہ علاقوں تک ـــ ہر لحہ مستعد چل رہی تھی۔ 1990ء تک، تقریباً ایک کروڑ انسانوں کی خدمت کا اعزاز، ایدھی فاؤنڈیشن کو حاصل ہو چکا تھا۔

قومی مصائب میں، امدادی کارروائیوں کے لئے سرکاری اداروں اور غیر سرکاری سماجی تنظیموں کو پچاس ایمبولینس گاڑیاں عطیہ کی گئی تھیں۔ 1987ء میں مریضوں کے لئے دو ہوائی جہاز اور ایک ہیلی کاپٹر پر مشتمل ائیرایمبولینس سروس نے بھی کام شروع کر دیا تھا۔ اگلے منصوبہ کے تحت مزید پانچ ہیلی کاپٹر اور پانچ ہوائی جہاز خریدنے کے لئے خطیر رقم جمع کی جا رہی تھی۔ فاؤنڈیشن کے ہوابازوں کو آرمی ایوی ایشن کے ماہرین نے باقاعدہ ٹریننگ دی تھی۔ ایدھی ائیر سروس کے وسیلے سے دور دراز علاقوں میں ماہر ڈاکٹر اور معائنہ رپورٹیں بھیجنے اور دشوار گزار پہاڑوں اور صحراؤں تک امدادی کام تیز تر کرنے میں بڑی مدد ملی۔

پچیس کلومیٹر ہنگامی پراجیکٹ کی بنیاد پر فلاحی مراکز کا سلسلہ سندھ، بلوچستان، پنجاب اور درہ خیبر سے سیاچن تک تمام بڑی شاہراہوں اور رابطہ سڑکوں پر سماجی خدمت میں مصروف تھا۔ تمام مراکز، وائرلیس سسٹم سے مربوط تھے۔ باقاعدہ پلان کے تحت مزید پانچ سو مراکز کی منظوری دی جاچکی تھی۔ اس مجوزہ پروگرام کے تحت اگلے چند سالوں میں ہر سو کلومیٹر پر ہسپتالوں اور حادثاتی مراکز کی تعمیر مقصود تھی۔

سندھ اور بلوچستان کے قحط زدہ علاقوں میں امداد کی باقاعدہ ترسیل کے لئے دیہی مراکز کو فعال بنایا گیا تھا اور صرف تھر کے علاقے میں پچیس فلاحی مراکز کھول دیئے گئے تھے۔ دیہی پروگرام کے دوسرے مرحلے میں ہر پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایسے خصوصی مراکز کے قیام کا ارادہ بنا جہاں مفت تعلیم، طبی نگہداشت، صحت و صفائی کے پروگرام، پینے کا صاف پانی اور اپنی مدد آپ کے تحت باہمی تعاون کی سہولتیں میسر ہوں۔ نیز گھروں میں جاکر عورتوں اور بچوں کو ٹیکے لگانے اور ابتدائی طبی امداد کی فراہمی کے لئے دایائیں ہوں۔ جائے حادثہ پر فوراً" پہنچنے، منشیات زدہ مریضوں کی بحالی، فیملی پلاننگ اور ناخواندگی جیسے دیگر سماجی مسائل حل کرنے کے لئے ہنگامی بنیادوں پر چوکیوں کا قیام بھی اسی پروگرام میں شامل ہے۔

جسمانی اور ذہنی معذوروں اور گھروں سے بھاگنے والوں کے لئے بڑے شہروں میں پندرہ ایدھی ہوم بنائے گئے تھے۔ اب تک کم و بیش تیس لاکھ بچوں کو مختلف ہنر سکھا کر بحال یا ان کے گھروں تک پہنچایا جاچکا تھا۔ بیس ہزار سے زائد بچے، ایدھی جھولوں کے ذریعے موت کے منہ سے نکالے جا چکے تھے۔ کراچی میں ایسے چھ نرسنگ سکول قائم تھے جہاں پسماندہ علاقوں کی نادار خواتین، ابتدائی تربیتی کورس مکمل کر رہی تھیں۔ اب تک تقریباً چالیس ہزار خواتین سرٹیفکیٹ حاصل کرکے مالی طور پر خودکفیل ہو چکی تھیں۔ چاروں صوبوں میں آٹھ خیراتی ہسپتال قائم کئے گئے اور موسیٰ لائنز کے گنجان آباد علاقے میں دو سو بستروں پر مشتمل ایک چھ منزلہ ہسپتال تعمیر کیا گیا جہاں ضروری سہولتوں سے آراستہ زچہ بچہ گھر، آپریشن تھیٹر اور ایکسرے و معائنہ یونٹ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی، حیدر آباد اور ملتان میں پچاس بستروں کے ہسپتالوں میں لاوارث مریضوں کا علاج ہو رہا تھا۔

فری ایدھی ڈسپنسریوں کے علاوہ آزاد کشمیر، جھنگ اور ٹیکسلا میں پندرہ ایسے گشتی شفاخانے بھی مصروف عمل تھے جو اب تک تقریباً ہزاروں زخمیوں کا علاج کر چکے تھے۔ کراچی سپر ہائی وے کے پہلو میں پینسٹھ ایکڑ وسیع زمین پر آٹھ بلاکوں پر مشتمل ـــ ایدھی ولیج میں سینکڑوں بچے زندگی کی سہولتوں سے بہرہ مند تھے۔ یہیں ایک بلاک، منشیات زدہ مریضوں کی بحالی کے لئے مخصوص کیا گیا۔ سوچا ہے کہ ایک سال کے اندر ہی، منشیات کے مریضوں کے لئے مویشی بانی کا ایک فارم بنا دیا جائے۔ ان میں سے جو افراد پڑھنا لکھنا چاہیں، انہیں تعلیمی سہولتیں دینے کے ساتھ ڈرائیونگ اور ابتدائی طبی امداد کی تربیت فراہم کی جائے ..... جو لوگ پڑھ لکھ لیں اور ایدھی فاؤنڈیشن میں کام کرنا چاہیں، انہیں محنت کا معاوضہ اور شادی کے اخراجات بھی بطور الاؤنس دیئے جائیں۔ ان تمام کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ مل جل کر کام کرنے کا شوق پیدا ہو اور باہمی محبت سے مالا مال ایک مثالی سوسائٹی تشکیل پا سکے۔

بفرزون میں، ذہنی مریض عورتوں کے علاج معالجہ کے لئے ایک خصوصی نفسیاتی کلینک کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نارتھ کراچی میں ایک ہوسٹل اور تربیتی مرکز، دو ہزار خواتین پر مشتمل ہے اور صنعتی تربیت کے مراکز کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ تمام مراکز، پاکستان فیملی پلاننگ اور یونسیف کی متعدی امراض سے بچاؤ کی ایسوسی ایشن کی مفت ماہرانہ رائے سے

بھی استفادہ کرتے ہیں۔

قدرتی آفات اور ہنگامی حالات میں مطلوبہ اشیاء کی فوری فراہمی کے لئے آٹھ گودام مخصوص ہیں۔ یہاں سے فری راشن اور سرکاری ہسپتالوں میں مفت گوشت سپلائی کیا جاتا ہے اور اب تک سیلاب زدگان کے علاوہ لاکھوں معذور و بے گھر افراد کے لئے بستر' چارپائیاں' وہیل چیئرز' آکسیجن سلنڈر' واٹر پمپ اور بیساکھیاں مہیا کی جاچکی ہیں۔

انشاء اللہ اگلے سال تک' کراچی' لاہور اور راولپنڈی کے بڑے شہروں اور قحط زدہ علاقوں میں مساکین اور نادار افراد کے لئے ..... مفت ایدھی لنگر قائم ہو چکے ہوں گے۔

ایدھی فاؤنڈیشن کی زیرنگرانی' چھ بڑے شہروں میں قائم چھ قبرستانوں میں ان گنت لاوارث میتیں دفنائی جا چکی ہیں۔ سہراب گوٹھ میں ساٹھ لاشوں کی گنجائش کا ایک مردہ گھر کام کر رہا ہے۔ کراچی میں دو بلڈ بنک' سرکاری ہسپتالوں کو روزانہ آٹھ پینٹ خون سپلائی کرتے ہیں۔ اسی نوعیت کے دیگر بلڈبنک' میرپور اور کراچی میں خون کے علاوہ دیگر طبی سہولیات بھی فراہم کرتے ہیں۔ کراچی شاہراہ کی چار کنال اراضی پر' جانوروں کے علاج اور دیکھ بھال کے لئے تین پناہ گھر بھی قائم کئے گئے ہیں۔

فاؤنڈیشن کی فراہم کردہ مفت قانونی امداد کے ذریعے' ہزاروں لاوارث اور مخبوط الحواس قیدیوں کی ضمانتیں دے کر انہیں رہا کرایا جاچکا ہے۔ فاؤنڈیشن کے مقرر کردہ ڈاکٹر' جیلوں میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے جاتے ہیں اور قیدیوں کو کتابیں' سٹیشنری' کھیلوں کا سامان' ٹیلی ویژن' کپڑے' ایمبولینس سروس اور خصوصی مواقع پر تحائف پہنچائے جاتے ہیں۔

1991ء کے دوران' خلیجی جنگ اور ایران میں زلزلے سے متاثرہ لوگوں کو خون کے عطیات' ادویات' طبی آلات اور خوراک کی صورت میں امداد دی گئی ..... 1992ء میں مصر کے شہر قاہرہ میں زلزلہ آیا تو ایدھی رضاکاروں سمیت جاکر امدادی کارروائیاں سرانجام دی گئیں۔ اسی سال کویت میں جنگ کے نتیجے میں محصور ہونے والے پاکستانیوں کی گھروں تک پہنچنے میں معاونت کی۔ 1993-94 کے دوران' امیگریشن کے باعث عراق اور رومانیہ میں روکے گئے پاکستانیوں کو نجات دلائی۔ 1993ء میں پاک فوج کے شانہ بشانہ' صومالیہ کے شہر موگادیشو تک چاول اور خوردنی تیل پہنچایا۔ کروشیا کیمپ کو امدادی سامان دیا گیا ..... اس

دوران آزاد کشمیر کی کنٹرول لائن تک امدادی رسد جاری رہی۔

ایدھی فاؤنڈیشن کی کارگزاریوں میں بنگلہ دیش' افغانستان' کشمیر' کردستان' برما' نیپال' صومالیہ اور یوگنڈا سے آنے والے مہاجرین کو نقد اور جنس کی صورت میں امداد شامل ہے ..... اسلام آباد میں مقیم بوسنیائی مہاجرین کو بھی ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچائی گئیں۔ امریکہ' برطانیہ' ہنگری' متحدہ عرب امارات' کینیڈا' جاپان' بنگلہ دیش' افغانستان' بھارت' سری لنکا' سوڈان اور روس میں ایدھی انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کی برانچوں کا کام' فعال انداز میں شروع ہو چکا تھا۔

سماجی بیداری کی ان گنت کامیابیوں کے نتیجے میں' ایدھی فاؤنڈیشن کا نام' خیرات و صدقات' اپنی مدد آپ' حقوق العباد' لگن اور مقاصد کے حصول کی پہچان بن چکا تھا اور اس ادارے کو مزید آگے بڑھنا تھا۔ دراصل یہ سارا کام روایتی انداز سے ہٹ کر شروع کیا گیا تھا۔ مخلص رضاکاروں کی فوج' ایک سسٹم کے تحت دن رات کام کرتی رہی تھی۔ ادارہ بڑے ناموں کا محتاج بھی نہ تھا۔ فلاحی مراکز' تنظیمی طور پر ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ ایک روز میٹھادر آفس میں' بیرون ملک سے آئے ہوئے ایک وفد سے بات چیت کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ..... "قومی سطح پر مریضوں کے علاج معالجہ اور ایمبولینس سروس کا ایک جال' دور دراز دیہات تک پھیلانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے حالانکہ ہمارے ہاں حکومتی سطح پر ایسی سہولتیں میسر نہیں۔ یورپ کی شاہراہوں پر بھی ہر پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر فلاحی مراکز ابھی تک نہیں بنائے گئے۔ ایدھی فاؤنڈیشن نے اپنی بساط کے مطابق' لاکھوں انسانوں کی خدمت کو دن رات اپنا شعار بنائے رکھا۔ یہ سب کچھ مسلسل محنت کا ثمر ہے"۔

ایک دن رضاکار ساتھیوں میں سے ایک نے اپنی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں بات کرنے کا فریضہ' بلقیس کو سونپتے ہوئے درخواست کی کہ وہ لڑکے والوں کے ہاں جاکر حالات کا جائزہ لے تاکہ حتمی فیصلہ ہوسکے۔ بلقیس' زینت کے ہمراہ گئی تو اچانک اس پر شدید کمزوری نے غلبہ پالیا اور وہ بے بسی کے عالم میں سیڑھیوں میں بیٹھ گئی۔ اس نے زینت سے کہا کہ اوپر جاکر پوچھے اور پھر بتائے کہ کیا کرنا چاہیے۔ زینت کی واپسی تک' بلقیس درد سے نڈھال اور پسینے میں شرابور ہوچکی تھی ..... زینت نے گھبرا کر ہسپتال جانے کو کہا لیکن بلقیس نے اسے تسلی دی اور دونوں آہستہ آہستہ میٹھادر کی طرف چل پڑیں ..... مٹھائی کی

ایک دکان کے سامنے پہنچتے ہی بلقیس لڑکھڑائی اور بے ہوش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد' ذرا سا ہوش آنے پر ایک گھونٹ پانی پیا اور چل پڑی ..... لیکن دوبارہ اس پر وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ مجبوراً زینت نے اسے رکشا میں جناح ہسپتال لے جاکر داخل کرایا اور مجھے فون پر اطلاع دی۔ پریشانی کے عالم میں ہسپتال پہنچا تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلقیس کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے ..... میں دل تھام کر بیٹھ گیا۔ بلقیس کے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں' انجانے خدشات کا پتہ دے رہی تھیں۔

ہمیشہ خوش فہمی رہی کہ بلقیس' میری شریک سفر بن کر یوں ہی ساتھ دیتی رہے گی ..... اس کے کھو جانے کا خیال کبھی نہ آیا تھا۔ ادارے کی کامیابیاں' اسی کی محنتوں کی مرہون منت تھیں۔ تفکرات میں غلطاں' اس کے بستر کے قریب بیٹھا' خدا سے اس کی زندگی کے لئے دعائیں مانگتا رہا..... اس کے بغیر میری زندگی کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔

آکسیجن سیلنڈر اور سانسیں بحال کرنے والے دیگر آلات کے درمیان بلقیس بے سدھ پڑی تھی اور میں خوف اور مایوسی سے دوچار ..... اس دوران جب بھی اس کی آنکھ کھلی' مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ وہ بارہ دن تک' انتہائی نگہداشت ..... اور مزید بارہ دن' کارڈیک وارڈ میں رہی۔

رابعہ ماں' خالہ اور لڑکیاں' باری باری بلقیس کی تیمارداری کرتیں۔ میں ایک گھنٹہ' نماز فجر کے بعد اور دوبارہ رات کو ہسپتال جاتا۔ یہ وقت ہم ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے گزارتے۔ بلقیس مجھے صبر کی تلقین کرتی رہتی اور کبھی نیم بے ہوشی کے عالم میں ..... مسکراتے ہوئے کہتی ..... "ہمارا رب' فاؤنڈیشن کو محفوظ رکھے گا۔ اگر میری زندگی کسی کام کی ہے تو خدا مجھے ضرور زندہ رکھے گا۔"

میٹھادر اداس تھا۔ دور دراز اندیشوں میں گھرا' ایک مرکز سے دوسرے تک رواں دواں رہنے کے باوجود' ذہن پریشان رہا۔ موت کا خوف' بلقیس کی ہسپتال سے رہائی کے بعد بھی مجھ پر طاری رہا..... اس روز ہر ایک سے دعا کے لئے درخواست کی۔ ہر ایک سے کہتا ..... "آج وہ گھر آ رہی ہے۔ پھر وہی باتیں' وہی جھگڑے ہوں گے"۔ یہ گویا اپنے دل کو تسلی دینے کا ایک بہانہ تھا۔ دل میں چھپا غم اور خوف' ایک لمحے کے لئے بھی رفع نہ ہوسکا۔

بلقیس کو اللہ تعالیٰ نے وافر ہمت عطا کی تھی۔ چارپائی پر سنبھلتے ہی اس نے فاؤنڈیشن

کے بیشتر معاملات اپنے ہاتھ لے لئے۔ میں نے روکا تو کہنے لگی ..... "گھبرائیں نہیں' مرنے کے سوا سارے کام کروں گی"۔ جلد ہی اس نے باور کرا دیا جیسے وہ کبھی بیمار نہ ہوئی ہو۔

ایدھی فاؤنڈیشن کوئی موروثی کمپنی نہ تھی ..... تاہم بیوی کی علالت کے بعد توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور ادارے کا باقاعدہ دستور عمل اور بورڈ آف ڈائریکٹر تشکیل دینے کے مرحلے طے کر لئے گئے۔

موت' ہر انسان کے تعاقب میں رہتے ہوئے اہم معاملات کی جانب توجہ دلاتی رہتی ہے ..... بلقیس کے بھائی محمود کے سینے میں اچانک ایک روز درد اٹھا۔ فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔ بلقیس بھی سب کچھ چھوڑ کر ایمبولینس میں ہسپتال جا پہنچی۔ جاتے ہی نوٹس بورڈ پر ..... محمود کی موت کے الفاظ لکھے دیکھے تو بے تحاشا دوڑتی' سڑک پر جاکر بذریعہ رکشا میٹھادر ..... رابعہ ماں سے آملی۔ وہ دیر تک روتی رہی۔ اسے مضمحل اور شدت غم سے دوچار دیکھ کر میں پریشان ہوگیا..... صبر و تحمل کی تلقین کرتا رہا کہ ..... موت' زندگی سے بھی بڑی حقیقت ہے جس سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ بلقیس کے ساتھ' خود بھی دکھ کی کیفیت میں رہا ..... آخرکار ہم دونوں' زندگی کے معمولات میں دوبارہ شامل ہوگئے۔ خدا ہی اپنے ناتواں بندوں کو حوصلہ عطا فرماتا ہے۔

ادارے میں اصلاحات اور کارکردگی بہتر بنانے کے لئے مرکزی بورڈ کی نگرانی میں' فاؤنڈیشن کو سولہ سیکشن میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ ہر سیکشن' مختلف منصوبوں پر الاٹ شدہ رقوم مناسب طریقے سے استعمال کرسکے۔ لوگوں کو عام طور پر پانچ مرغیاں' دو بکریاں یا دوچار گائے بھینس خریدنے کے لئے قرضے درکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح حیوانات پناہ گھر' خصوصی علاج' ایمبولینس گاڑیاں خریدنے اور قومی آفات میں ریلیف کے لئے متعلقہ محکموں کو درخواستیں دینا پڑتی ہیں ..... لیکن فاؤنڈیشن کے اخراجات اپنے وضع کردہ طریقوں سے پورے کرنے کا ایک نظام تھا' اس لئے حکومتی یا بیرون ملکی امداد کی ضرورت نہ تھی۔

ملک میں تاحال' عمررسیدہ افراد کی بہبود کے لئے کوئی سسٹم نہیں تھا۔ اس خیال سے ایک وسیع پروگرام مرتب کیا گیا۔ ہمارے ہاں ایک مشکل تو یہ ہے کہ لوگ اپنے بوڑھے والدین یا رشتے داروں کی علیحدگی کو توہین آمیز سمجھتے ہیں۔ بہت سے خاندان' انہیں زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے ہیں ..... لیکن بڑھاپے کی فطری اور نفسیاتی

مجبوری کے باعث ضعیف لوگ' زیادہ باتونی اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ پورے خاندان کو مجبوراً ان سے نباہ بھی کرنا پڑتا ہے اور ان کے اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

بزرگ افراد کے لئے علیحدہ گھر' بہت سے لوگوں کو پسند نہیں ..... ایسی صورت میں جاپان کی طرز پر الاؤنس سسٹم متعارف کیا جانا چاہیے۔ اس میں آزادانہ ماحول بھی میسر آتا ہے۔ جاپان ایدھی سینٹر نے اس بارے میں جو معلومات فراہم کیں' ان کی روشنی میں سوچا کہ کوشش کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات تنہا رہنے والے بوڑھوں کی لاشیں کئی روز تک پڑی رہتیں اور انہیں کوئی نہ دیکھ پاتا۔ اس صورتحال کا تدارک' ایدھی فاؤنڈیشن میں باقاعدہ ریکارڈ درج کرتے ہوئے کیا گیا' جس کے مطابق رضاکار ایسے عمر رسیدہ لوگوں کی خبرگیری' ان کی رہائش گاہ پر آواز لگا کر کرتے ..... جواب نہ ملتا تو باقاعدہ جاکر دیکھا جاتا۔ اس طرح یہ مسئلہ کافی حد تک حل کرلیا گیا۔

دوسری آپشن یہ تھی کہ یورپی طرز پر کیون گھر قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی جائے۔ 1991ء تک ملک میں بنائے گئے ایسے تمام پناہ گھر' بزرگ افراد سے بھر گئے۔ ایسے لوگوں کو کراچی لاکر ٹھہرایا جاتا اور گھریلو ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی ..... روزانہ اخبارات اور یوٹیلٹی سٹور کی سہولتیں بھی فراہم کی گئیں۔

دنیا کے مشہور و معروف سماجی اداروں ..... اور فعال تنظیموں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کسی حد تک ایدھی فاؤنڈیشن سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان میں ابتدائی وظائف کے لئے گرانٹس دی جاتی ہیں۔ نمایاں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے طور پر انعامات دیئے جاتے ہیں اور ثقافتی سرگرمیوں کی سرپرستی کی جاتی ہے۔ یہ تنظیمیں اس لحاظ سے' ایدھی فاؤنڈیشن سے مختلف تھیں کہ ان کا آغاز' بنیاد رکھنے والوں کی طرف سے زبردست مالی تعاون کا مرہون منت تھا ..... جبکہ ہمارا انحصار چھوٹے چھوٹے عطیات پر تھا۔

بتایا گیا کہ نوبل پرائز کے بانی نے ڈائنامائٹ کی ایجاد کے بعد' اپنا سارا سرمایہ وقف کر دینے کی ٹھانی۔ شاید اتنی ہی مدت بعد ایدھی فاؤنڈیشن بھی قومی بجٹ میں شامل ہوجائے۔ بعض تقریبات میں اس موضوع پر سچی باتیں میری زبان سے بے ساختہ ادا ہو جاتیں۔ ان کی زد میں آنے والے' خاموش رہنے کو کہتے لیکن میں بولے چلا جاتا۔ شاید یہ سب کچھ ان کی خواہشات کے منافی ہو ..... پر سچائی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک مرتبہ ..... گھر آیا تو بلقیس نے خبردار کرتے ہوئے کہا ..... "ایک روز یہی لوگ' آپ کو تالا بند کر دیں گے"۔ میں ہنس پڑا اور کہا ..... "ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔ بعض اوقات سوچتا ہوں کہ بھکاریوں سے خطاب کر رہا ہوں ..... لیکن کیا حکمرانوں کو اپنی طاقت کے سرچشموں یعنی عوام کے پاس نہیں جانا چاہیے؟" ...... موجودہ نظام کی خرابیوں سے بغاوت کا احساس شاید مجھے ترقی پسندانہ نظریات کی طرف لے گیا ... لیکن میمن برادری کے مخالف لوگوں نے خواہ مخواہ مجھ پر "کمیونسٹ" کی چھاپ لگا دی۔ دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہی کہا کہ ..... کسی انقلاب کی تباہی کو دیکھ کر مایوسی سے سر جھکا لینا مناسب نہیں۔ زمانے کی گردش' ہر سو سال بعد اپنا راستہ بدل رہی ہے ..... پرانے نظریات' صرف باتوں تک محدود رہ جاتے ہیں۔ پلاسٹک کے وہ تھیلے جن کی مانگ آج سے چالیس سال پہلے انتہا پر تھی' آج انہیں انسانی زندگی کے لئے خطرناک قرار دے کر ان کا استعمال یکسر ترک کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ہر صدی اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور لاتی ہے۔

اگر اشتراکیت ناکام ہوگئی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام ابھی تک چل رہا ہے تو ... اس سے ہمیں کیا مطلب' لیکن حقوق العباد کا نظریہ ناکام نہیں ہوا۔ انبیائے کرامؑ کے عہد میں سماجی بہبود کا نظام اپنے عروج پر تھا اور معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔

اشتراکی نظام نے انفرادی ترقی کے راستے بند کر رکھے تھے جبکہ اسلام' ذاتی اور اجتماعی طور پر انسانی قوت و صلاحیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسی کی پیروی کرتے ہوئے سماجی بہبود کا کام شروع کیا تھا۔ اس کا تعلق کسی فرقہ پرست تحریک یا طبقاتی کشمکش سے نہیں۔ یہ نظام کسی شخصی امداد یا خیرات تک محدود نہیں بلکہ اجتماعی کام ہے جس میں پاکستان کے لوگ ہی نہیں' پوری دنیا کے انسان شامل ہوکر اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

روانڈا اور یمن میں اقتدار کے بھوکے مٹھی بھر افراد نے ہولناک صورت پیدا کر دی تھی۔ ہر چند سال بعد ظالموں کا ایک گروہ ایسے ملکوں پر چڑھ دوڑتا ہے اور انسان کو قحط اور بھوک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پاکستان میں بھی بعض سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے یہی کچھ کیا ہے۔ تاہم ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس غلاظت سے بچے رہتے ہیں۔

ایک سٹاف میٹنگ میں اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ... "سماجی بہبود کے کام کو الگ رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا عدلیہ اور انتظامیہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ

کرنا۔ ملکی آبادی کا صرف ایک فیصد طبقہ خیرات کا مستحق ہے۔ اگرچہ گذشتہ پینتالیس برس میں لسانی' طبقاتی اور فرقہ وارانہ تعصبات کو ختم کرانے میں کامیاب نہیں ہوسکا ..... پھر بھی ایدھی فاؤنڈیشن اس فلاحی منزل کے قریب ہے جس کے متعلق سوچ کر کام شروع کیا گیا تھا"۔ میرے رفقائے کار بھی اس بارے میں پر اعتماد تھے۔

اکتوبر 1992ء میں' مصر میں تباہ کن زلزلے سے متاثر ہونے والے انسانوں کی خدمت کے لئے قاہرہ پہنچے۔ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جانے والی ایک بیس منزلہ عمارت کو دیکھ کر احساس ہوا کہ ــــ حکام' شاید ابھی تک یہ کھوج لگانے میں کامیاب نہیں ہوئے کہ ملبہ ہٹانے کے بعد اگر معجزانہ طور پر کچھ لوگ زندہ نکلے تو انہیں مزید نقصان سے کیسے محفوظ رکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر ملبے کے اردگرد چکر لگایا۔ بڑے بڑے شہتیر' بجلی کی الجھی تاریں اور گھریلو ساز و سامان ہر طرف بکھرا پڑا تھا۔ امدادی ٹیم کو کھدائی شروع کرنے کو کہا ..... ملبے سے ایک کے بعد دوسری لاش نکلنے لگی۔ مصری لوگ حیرت زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے ..... مسخ شدہ لاشوں کی بو میرے نتھنوں تک چلی آئی۔ لوگ حیران تھے کہ امدادی کاموں کے لئے بڑی بڑی مشینیں ناکام رہیں۔اشرف المخلوقات کی عزت کو ایک انسانی فریضہ سمجھ کر قبول کیا تھا ..... شاید یہی وجہ ہے کہ خدا نے مجھے انسانی لاشوں کی سڑانڈ کا شکار ہونے سے بچائے رکھا۔

1993ء میں صدر غلام اسحاق خان نے ایک بار پھر ..... اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے' میاں محمد نواز شریف کی حکومت برطرف کر دی اور ایک عبوری حکومت تشکیل پائی۔ عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ اس تبدیلی پر حیرت سے سوچنے لگا کہ ــــ کسی حکومت کی آئینی مدت پوری کیوں نہیں ہونے دی جاتی اور ہر بار عوام کے دیئے گئے مینڈیٹ کی توہین کیوں کی جاتی ہے؟ ..... شاید انتخابی نتائج کا اعلان ہوتے ہی کسی اور تبدیلی کے لئے سرگوشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر وہی بے رحمانہ گردش' پردۂ اقتدار پر بار بار دکھائی جانے والی ــــ موروثی جاگیرداروں کی فلم' قوم کو ایک بار پھر دیکھنا پڑتی ہے۔ مغرب نے تو آج سے سو سال پہلے' سماجی بہبود کے ذریعے اس استحصالی نظام سے جان چھڑالی تھی۔ ..... لیکن ہم تباہ کن رفتار سے پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔

1993ء میں بے نظیر بھٹو اقتدار میں دوبارہ واپس آئیں تو توقع تھی کہ انہوں نے اپنے

سابقہ دور کی غلطیوں سے ضرور کچھ سیکھا ہوگا لیکن ..... خوشامدی ٹولہ' حکمرانوں کو تاریخ سے سبق سیکھنے کا کب موقع دیتا ہے۔ غلطیوں کا احساس نہ ہو تو مصیبت کا وقت بھی بے نتیجہ گزر جاتا ہے لہٰذا کسی مثبت تبدیلی کا امکان بھی نہیں ہوتا۔

..... بلقیس کو ہمارے ایک ساتھی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہی تھی پر میرے دل پر بوجھ سا تھا۔ رابعہ ماں نے اسے پہننے کے لئے ایک ہار دیا ــــ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ..... "میرا موڈ ٹھیک نہیں"۔ شاید وہ میرے دل کا بوجھ بھی خود اٹھا لینا چاہتی تھی۔ تقریب سے واپس میٹھادر آئی اور میرے سامنے بیٹھ کر جیسے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا ..... "میں وہاں بہت بے چین رہی۔ کچھ کھا بھی نہ سکی۔ بچوں کے شور ہنگامے نے ناک میں دم کر دیا"۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں۔ پوچھنے پر اس نے مجھے تسلی دی اور آرام کرنے چلی گئی ..... تاہم میری پریشانی دور نہ ہو سکی۔

رابعہ ماں' کھارادر میں آکسیجن ماسک کے ذریعے سانسیں لے رہی تھیں اور بلقیس کا بھائی اقبال ان کے پائنتی کی طرف کھڑا تھا ..... ڈاکٹر ان کے ضعیف جسم میں کسی زندہ رگ کی تلاش میں تھے۔ آخرکار انہیں ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ بلقیس بھی ساتھ گئی۔ واپسی پر اس سے پوچھا ..... "تم مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئیں؟" اس نے جواب دیا ــــ "آپ کیا کر لیتے ..... اب وہ پہلے سے بہتر ہیں اور انہیں صبح تک گھر واپس بھیج دیا جائے گا"۔ کھارادر تک پیدل چلتے ہوئے محسوس ہوا کہ بلقیس کے چہرے پر پہلے جیسا اطمینان بخش تاثر نہیں ..... پھر ہم نے کھانا کھایا اور وہ الماس کے ننھے بیٹے احمد کے ساتھ کھیلتی رہی۔ کبھی اسے دوہرا کرتی' کبھی اپنی پیٹھ پر لاد کر گراتی ــــ دکھ سے فرار کا یہ کھیل اس وقت اچانک ختم ہوگیا جب الماس اور زینت دھاڑیں مارتی آئیں اور ہمیں رابعہ ماں کے انتقال کی خبر سنائی۔

بلقیس کی طرف دیکھے بغیر' میں باہر جاکر سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا ــــ اپنی بیوی کو پرسہ بھی نہ دے سکا ..... رابعہ ماں کی موت کا غم' الفاظ کے رسمی دلاسوں سے کہیں زیادہ ــــ ناقابل تلافی تھا۔ چند لمحوں میں یہ خبر گھر گھر پھیل گئی۔ کھارادر' میٹھادر' چھاپہ گلی اور بازاروں' گلیوں' محلوں میں رابعہ ماں کی دردمند صدا گونجتی تھی ..... آج اس نیک دل خاتون

کو ابدی نیند سوتے دیکھنے٭ اور خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔۔۔ رابعہ ماں کی میت پر لوگ' اللہ کی رضا پر راضی' سر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ تمام نرسیں اور دایائیں' جنہیں رابعہ ماں نے تربیت دی تھی' تعزیت کے لئے رات تک آتی رہیں۔ صبح سویرے' رابعہ ماں کی شاگرد لڑکیوں نے انہیں غسل دیا۔ سب نے مل کر جنازہ پڑھا اور میت کاندھے پر اٹھائے ان کی آخری آرام گاہ کو چل دیئے۔ میں ایک پایہ تھامے چل رہا تھا کہ کسی نے میرے ہاتھ سے تابوت تھام لیا ۔۔ ایک طرف کھڑا دیکھنے لگا۔ انہی لوگوں میں عزیز بھائی بھی شامل تھے۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب مجھے اپنی ماں کا آخری سفر یاد آگیا۔ رابعہ ماں کو قبر میں اتارتے ہوئے یاد آیا کہ ۔۔۔ رابعہ ماں' جسے میری ماں کی طرح بلقیس سے ایک دن کی جدائی بھی گوارا نہ تھی' آج کیسے اسے ہمیشہ کے لئے تنہا چھوڑ گئی ہے ۔۔ میں تیزی سے واپس گھر لوٹ آیا' جیسے اپنی ماں کو دفن کرنے کے بعد آیا تھا۔

رابعہ ماں نے اپنی بیٹی بلقیس کو جینے کے ایسے ڈھنگ سکھائے تھے جنہوں نے سماجی بہبود جیسے مشکل کام کو آسان بنانے میں بڑی مدد دی تھی ۔۔ انہوں نے ہماری عدم موجودگی میں' ہمارے بچوں کو اس محبت سے پالا کہ انہیں کسی کی کمی کا احساس تک نہ ہوا اور انسانی خدمت کے سلسلے میں ان کا کردار یہ ہے کہ ہزاروں خواتین اور نوجوان لڑکیاں' کسی معاوضے کے بغیر ان سے تربیت پا چکی ہیں ۔۔ رابعہ ماں' اپنے پیچھے عزت و توقیر اور امید چھوڑ کر گئیں۔

اس سانحہ کے بعد' بلقیس اور میں اپنی عظیم معاون کو آنسوؤں کا خراج پیش کرتے رہے اور رات بھر ان کی باتیں کرتے رہے۔

زندگی کے طویل سفر کا انجام' موت ہی تو ہے۔ ساتھیوں سے ایک تقریب میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ۔۔۔ "انسان نے دنیا سے جانا ہے۔ میرے بعد' کسی دوسرے ایدھی کی نہیں' ایک ایسے نظام کی ضرورت ہوگی جو خوب سے خوب تر افراد کو سامنے لاتا رہے گا"۔

جب کبھی کام میں' کہیں گڑ بڑ سامنے آتی' بلقیس سے ہی شکوے کرتا لیکن وہ میری شکایات کو نظرانداز کرتے ہوئے گھریلو کام کاج میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو جاتی۔ اسے کہتا ۔۔۔ "مشورہ تم نے ہی دیا تھا' تسلیم کرلو کہ خرابی کی ذمہ داری بھی تمہاری ہے"۔ اس

پر بھی وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتی' کبھی سٹور روم میں چلی جاتی' کبھی سیڑھیاں چڑھتے کسی دوسرے کمرے کی طرف چل دیتی۔ اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک اطاعت شعار بیوی کے لئے یہی مناسب ہے کہ شوہر کی باتوں میں مداخلت نہ کرے۔ میں بولے چلا جاتا ۔۔ "بعض عورتیں مسائل کو مزید الجھا کر انہیں پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔ کم از کم میری اس بات سے تو اتفاق کرلو"۔ لیکن وہ میری تکرار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کپڑوں کی الماری کھول لیتی۔ آخرکار' تھک ہار کر چلا جاتا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔

ہر شوہر کی طرح' اپنی بیوی کو ذمہ دار ٹھہرانے کی انسانی کمزوری پر قابو پانے کی بہت کوشش کرتا ۔۔۔ پر ناکام رہتا اور اسے دیکھتے ہی دوبارہ شکوہ کرتا ۔۔۔ "عورتیں ہی مردوں کو الٹے سیدھے مشورے دے کر ان سے غلطیاں کراتی ہیں ۔۔۔ آئندہ تم کسی معاملے میں دخل نہ دینا"۔ اس کے جواب میں بلقیس کہتی ۔۔ "آپ میرا مشورہ مانتے ہی کیوں ہیں۔ پوری تنظیم کے سربراہ آپ ہیں یا میں؟" یہ بات سن کر سوچتا' واقعی بلقیس ٹھیک کہتی ہے۔ سارا بوجھ تو مجھے ہی اٹھانا ہے اور غلطیوں کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد ہونی چاہیے۔

ایدھی فاؤنڈیشن کی املاک کی قیمت' اب کروڑوں روپے تک ہو چکی تھی۔ تعمیر و ترقی کے باقی کام مکمل کرنے کے لئے روپیہ' منافع میں سے آتا تھا تاکہ اصل سرمایہ محفوظ رہے۔ بقیہ پچیس فیصد کام کی تکمیل کے بعد' خرچ اور بچت کے درمیان خسارہ کم ہو جائے گا ۔۔ یوں دس سال کے اندر بنیادی سرمایہ بڑھ کر کئی گنا ہو جائے گا۔ قیمتیں بڑھنے کے باعث' کام کی رفتار سست ہوگئی تھی' اس لئے فاؤنڈیشن کو بچت کرنا پڑ رہی تھی۔

مفاد پرست عناصر نے کئی مرحلوں پر خبردار کیا کہ سماجی بہبود کے شعبے میں' ہم پاکستان میں سرمایہ کاری نہ کریں لیکن ان کی پرواہ نہیں کی۔ شاید وہ ایدھی فاؤنڈیشن کی وسعت سے خوفزدہ تھے اور اس پر قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ فاؤنڈیشن تو قوم کی امانت ہے کیونکہ ساری سرمایہ کاری' مملکت پاکستان کے ساتھ کی گئی ہے تاکہ سماجی بہبود کی مد میں مشکلات کم کی جا سکیں۔ مغرب میں فلاحی کام' باقاعدہ ایک نافذشدہ ٹیکس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایسے ہی نظام کے بارے میں سوچا ہے جسے سات سال میں اکٹھے کئے جانے والے سرمائے سے چلایا جائے گا۔ ٹوکنوں کے ذریعے حاصل ہونے والا سرمایہ' سال بھر کے اضافی اخراجات کے لئے کافی ہوگا۔ اس طرح مزید صدقات و خیرات کی بھی ضرورت نہیں رہے

گی۔ اس پلان کے بارے میں ایک ماہر اقتصادیات سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ..... ممکن ہے کہ سات سال بعد فاؤنڈیشن کو ایک نفع بخش ادارے کی حیثیت حاصل ہو جائے اور جمع پونجی کی بنیاد پر قرضے حاصل کرکے بڑے منصوبے مکمل کئے جاسکیں۔ اس مدت کے دوران' چھوٹے بڑے منصوبوں کو وسعت دینے کا کام بھی جاری رہے گا۔ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران' پاکستان سنگین حالات سے گزرا ہے' اس کے باوجود لوگوں نے خود ہی' اپنی مدد آپ کے تحت' ایک سسٹم بنا لیا ہے جس کی حفاظت بھی لوگ خود ہی کریں گے۔ فاؤنڈیشن نے بھی لوگوں کے تعاون سے ایک ایسا پروگرام مرتب کرلیا ہے جس میں صحت و تعلیم کی سہولتیں یقینی بنائی جائیں گی۔ کسی سے قرضہ یا حکومتی امداد تسلیم نہیں کی جائے گی"۔

پوری دنیا میں' اگرچہ کرپشن اور ذاتی مفاد کے حصول کی دوڑ جاری ہے اور مغربی ممالک میں بھی سماجی بہبود کے نظام کو اس سے نقصان پہنچا ہے تاہم وہاں سماجی بہبود کا ڈھانچہ برقرار ہے۔ سوشلسٹ نظام بھی فلاحی تصور کو گڈمڈ کرنے کے باعث ہی درہم برہم ہوا ..... اس لئے ہر جگہ' سماجی بہبود کے نظام کو بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جبکہ ہم بھی' اپنی بساط کے مطابق رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ایک تقریب میں کہا کہ ــــ ایدھی فاؤنڈیشن کے ذریعے اپنے مشن کا ساٹھ فیصد حاصل کرلیا گیا ہے۔ بقیہ چالیس فیصد کا تعلق ترقیاتی کاموں اور مالی امور سے ہے۔ ادارے کا یہ بنیادی اصول کہ حکومت یا بین الاقوامی اداروں سے امداد نہیں لی جائے گی' اسے اپنی مدد آپ کے تحت ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔

ایک نیم سرکاری ادارے کے سربراہ نے ہمارے عزائم پر اپنے ردعمل کا یوں اظہار کیا ..... "حیران ہوں کہ اس ملک کی نوکرشاہی' ماہرین اقتصادیات اور فلسفی حضرات نے سماجی بہبود کے متعلق کیوں نہیں سوچا"۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ــــ "شاید خدا نے مجھ ناچیز کو ہی اس کام کے لئے موزوں جانا ہو۔ میرا تعلق ایک تاجر برادری سے تھا' میں اچھا صنعت کار یا بینکار بھی بن سکتا تھا لیکن میں نے سماجی کام کا راستہ خود اختیار کرلیا۔ اس کے لئے کوئی باقاعدہ پلاننگ نہیں کی تھی۔ مشن کے آغاز میں' میری سوچ صحت' تعلیم اور عام اصلاح احوال تک محدود تھی ــــ قدرت نے نئے راستے کھول دیئے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ

اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے"۔

ہمیشہ عوام سے براہ راست مانگنے پر بھروسہ کیا اور یہی کہا کہ ــــ پورا سال فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر' اس کام کا پھر سے آغاز کرسکتا ہوں۔ قوم سے یہی کہوں گا کہ لوگ اپنی زندگی میں صرف ایک بار جو دے سکتے ہیں' عطیہ کر دیں ــــ اب انہیں یہ کہا ہے کہ ــــ ایک کروڑ افراد' دس روپے فی کس کے حساب سے چندہ دیں تو اگلے چھ سال بعد' ایدھی ایمبولینس سروس کو فری کر دیا جائے گا ــــ بعدازاں' تیس سال میں ہی پاکستان کی نوے فیصد آبادی کو' ان کی دہلیز تک خدمات فراہم کی جاسکیں گی۔ اس طرح جعلی مفادات کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

سات سال کے دوران جاری ہونے والے تمام ٹوکن' میرے یا بلقیس کے دستخطوں سے جاری ہوئے تھے۔ ایدھی فاؤنڈیشن کی عطیات سے حاصل ہونے والی آمدنی' ہمارے طرز زندگی سے ظاہر ہے۔ عوام سے ہمیشہ اعتماد کی آرزو کی اور جب کبھی کسی نے خوردبرد کا الزام لگایا تو یہی جواب دیا کہ ــــ "آج تک کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ ایمبولینس گاڑیوں کی یہ فلیٹ اور ہوائی جہاز کہاں سے حاصل کئے ہیں"۔

وہ لوگ جنہوں نے ہم پر اعتماد کیا اور صلے کی پرواہ کئے بغیر اپنی زندگیاں سماجی کاموں کے لئے وقف کر دیں' انہیں ہمیشہ یہی باور کراتا رہا کہ ــــ "آؤ' کسی حجت اور حربے کے بغیر کام کرتے چلے جائیں"۔

فاؤنڈیشن کے تحت جو کام کئے جا رہے ہیں' یہ کوئی بزنس نہیں اور نہ ہی اسے ذاتی مفادات کے لئے شروع کیا گیا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی نے یہی سوچا تھا کہ ــــ اپنی زندگی میں ہی ایدھی فاؤنڈیشن کو اس کے اصل وارثوں کے سپرد کر دیں گے۔ ہم ریٹائر بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر بلقیس ہنستے ہوئے کہنے لگی ــــ "میں نہیں مانتی کہ تم ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی' فاؤنڈیشن کے معاملات میں دخل نہیں دو گے"۔ میرا جواب تھا کہ ــــ "یقین ہے کہ فاؤنڈیشن کا کام سسٹم کے مطابق چلتا رہے گا۔ مداخلت کیسی؟"

بے نظیر بھٹو پہلی وزیراعظم تھیں جنہوں نے ایدھی فاؤنڈیشن کا دورہ کیا۔ جس صبح انہوں نے آنا تھا' گٹروں کی پوری صفائی مزدوری دے کر کرائی گئی۔ ایک صحافی نے پوچھا ــــ "اگر وزیراعظم آپ کو طلب کرتیں تو آپ جاتے؟" میں نے جواب دیا ــــ "ہاں' ضرور جاتا

کیونکہ جھوٹی ضد' غرور سے کم نہیں ہوتی اور یہ کام کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اگر وقت ضائع ہونے کا خدشہ نہ ہو تو کہیں بھی جاسکتا ہوں ۔۔۔ کوئی اور بھی بلائے گا تو حاضر ہوں"۔

کلفٹن سینٹر میں' بے نظیر بھٹو سے سماجی بہبود کے موضوعات پر بہت سی باتیں ہوئیں کہ ۔۔۔ اگر ملک میں سماجی نظام قائم کر دیا جائے تو بیس فیصد آبادی کا استحصال نہیں رہے گا۔ باقی لوگ بھی کم از کم دلدل سے تو نکل آئیں گے۔ ظالم و مظلوم میں توازن کی ضمانت' سماجی بہبود کا نظام ہی دے سکتا ہے' ورنہ عالمی سطح پر بدنظمی اور اسلحہ کے ڈھیر ہمیں نیست و نابود کر دیں گے"۔ بے نظیر بھٹو نے ایدھی سینٹر پر ہی سماجی بہبود کی حمایت میں ایک بیان جاری کر دیا لیکن اسے نافذ کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا ۔۔۔ جب تک مختلف شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں نہ لائی جائیں' سماجی اصلاحات کا فروغ ممکن نہیں۔

محترمہ سے گفتگو کے دوران' شرح خواندگی سے متعلق سوال اٹھایا ۔۔۔ "کیا وجہ ہے کہ میٹرک پاس شرح' ابھی تک بیس فیصد سے آگے نہیں بڑھ سکی اور بیشتر خواتین ان پڑھ رہتی ہیں۔ ایدھی فاؤنڈیشن نے نرسنگ پروگرام کے ذریعے چالیس ہزار خواتین کو خودکفیل بنایا ہے"۔ بے نظیر بھٹو نے سرکاری خرچ پر پچاس ہزار خواتین کی آبادکاری کا وعدہ کیا۔ ان سے افراط زر پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ۔۔۔ بعض لوگوں نے عادت بنا لی ہے کہ دوسرے ان کے لئے محنت کریں اور وہ خود مزے سے بیٹھ کر کھائیں۔ اس رجحان کے باعث کئی شعبوں میں کام رک گیا ہے لہٰذا ایسی سکیموں کی ضرورت ہے جو اس خرابی کو دور کرتے ہوئے ایسے افراد سامنے لائیں جو ذاتی اور قومی سطح پر رونما ہونے والے نقصانات کا ازالہ کرسکیں۔ ہم سب کو سادگی کی مشعل اٹھا کر آگے بڑھنا ہوگا۔

بے نظیر بھٹو چاہتی تھیں کہ سندھ میں' بلدیاتی انتخابات سے قبل' کوئی سیاسی حل نکل آئے۔ کراچی بلدیہ کی خستہ حال انتظامیہ کو سہارا دینے کے لئے اصرار کیا گیا لیکن سماجی مصروفیات کی بناء پر میں نے معذرت کرلی۔ انہوں نے متبادل تجویز کی درخواست کی تو چند ماہ کے لئے اپنے دو کارکنوں کے نام دے دیئے۔

واپسی سے قبل' وزیراعظم بے نظیر نے بلقیس کو سینٹ رکنیت کی پیشکش کی جسے بلقیس نے ہنستے ہوئے ٹال دیا۔ ساتھیوں کا ردعمل یہ تھا کہ دنیا بھر کے ناداروں کی فلاح و بہبود کے

لئے کام کرنے والوں کو صرف کراچی اور ملکی سطح تک محدود رکھنے کی پیشکش کیوں کی جاتی ہے۔ انہوں نے تو ایک غیرملکی نامہ نگار کے اس خطاب کو بھی مسترد کر دیا جس میں مجھے "فادر ٹریسا" کہا گیا تھا۔ یہ شکوہ بھی کرتے کہ ۔۔۔ مدر ٹریسا' تین مرتبہ پاکستان آچکی ہیں اور ان کا تعارف' ایدھی سے نہیں کرایا گیا ۔۔۔ دوستوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ہم حکومت سے الگ' آزاد رہ کر کام کر رہے ہیں' اس لئے حکومت ہمیں بین الاقوامی شخصیات کے ساتھ شامل نہیں کرنا چاہتی"۔ کئی لوگوں نے کہا ۔۔۔ "شاید مغرب والے' آپ کے کام کی پذیرائی اس لئے نہ کرتے ہوں کہ آپ مسلمان ہیں"۔ پر میں نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا اور ازراہ مذاق کہا ۔۔۔ "اگر وہ لوگ ہمارے کام پر' ہمیں انعامات دینے لگے تو دنیا ایک دھماکے سے اڑ جائے گی"۔

کراچی انتظامیہ کے حالات انتہائی خراب ہوچکے تھے۔ بعض لوگ لٹیروں کا کردار ادا کر رہے تھے۔ چھانٹی ضروری ہوگئی تھی۔ رنگ و نسل کی تفریق' لسانی برتری' فرقہ واریت اور سیاسی دھڑے بندی ۔۔۔ ہر معاشرتی وباء پھیل چکی تھی۔ کارپوریشن کے سینئر اہلکار' بظاہر عزت و احترام سے ملنے آئے لیکن اپنے چہروں کی منافقت نہ چھپا سکے۔ ان کے احمقانہ مطالبات ماننے سے انکار کیا تو واپس جاکر انہوں نے مجھے خط کے ذریعے خبردار کیا کہ ۔۔۔ "ہمارے کام میں مداخلت کی گئی تو انتقام لیں گے" ۔۔۔ ان کے ایلچی کو جواب دیا کہ ۔۔۔ "جاکر انہیں کہہ دو' جو چاہیں کریں ۔۔۔ شکایات لے کر میرے پاس نہ آئیں۔ کراچی انتظامیہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ وزیراعظم سے جاکر مل لیں۔ کراچی انتظامیہ' اگر دردسر ہے تو حکومتوں کا ہے۔ بہت ہوا تو میں اس بندے کو ہٹا لوں گا ۔۔۔ نہیں مانا تو نکال دیا جائے گا"۔

اپوزیشن سے وابستہ صحافیوں نے نئے ایڈمنسٹریٹر کی ممکنہ کرپشن کے بارے میں' شکوک و شبہات پر مبنی قیاس آرائیاں کیں تو حیران رہ گیا کہ یہ لوگ کس طرح حقائق کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ انہیں کہا کہ ۔۔۔ "ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ ہماری تنظیم کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں"۔

پیپلزپارٹی سے ہمارے تعلق کی جھوٹی کہانی ۔۔۔ محض ایک واقعہ کے سبب مشہور ہوئی۔ ملک سے میری عدم موجودگی کے دوران' فاؤنڈیشن کے پائلٹ نے ایک ہیلی کاپٹر' بے نظیر بھٹو کی انتخابی مہم کے لئے دے دیا۔ واپس آیا تو سٹاف پر بہت برسا کیونکہ یہ کارروائی

ہمارے اصولوں کے خلاف تھی۔ بعدازاں بتایا گیا کہ ان دنوں محترمہ بیمار تھیں اور خشکی کے راستے سفر نہ کرسکتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے والد نے میرے زخمی ہونے پر ہوائی جہاز فراہم کیا تھا حالانکہ جہاز کا کرایہ ادا کیا تھا ــــ اسی طرح ہم نے بے نظیر بھٹو کو بھی ہیلی کاپٹر کا' بل پیش کر دیا۔

بھارتی وزیراعظم نرسما راؤ کا یہ بیان پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ــــ سماجی بہبود کا نظام ہی ہندوستان کے مسائل حل کرسکتا ہے۔ اس دوران ایک مہمان سے دوران گفتگو کہا کہ ــــ "صرف ایک گٹر صاف کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا' مکمل صفائی ضروری ہے۔ ممالک کے سربراہوں اور سیاستدانوں کو زمانے گزرنے کے بعد ہی سہی' آخرکار اتنا احساس تو ہو ہی گیا کہ سماجی بہبود سے زیادہ کوئی موثر سیاسی نعرہ نہیں ہوسکتا"۔

کئی لوگوں نے مشورہ دیا کہ ــــ "جب تک آپ سیاست میں نہیں آئیں گے' ویلفیئر سسٹم کو نافذ ہوتے نہ دیکھ سکیں گے"۔ اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ سوچتا تھا کہ تیسری دنیا کے لوگوں نے مظالم سے سمجھوتہ کرلیا ہے اور پاکستان کے لوگ سینتالیس برسوں سے کسی سسٹم کے بغیر جی رہے ہیں۔ ایک خصوصی ٹولہ حکومت کے گرد مسلسل طواف کرتا رہتا ہے۔ ایک گروپ آتا ہے اور سیاسی نیلام گھر میں بڑی سے بڑی بولی دے کر' بکاؤ مال خرید لیتا ہے ــــ ایوان اقتدار میں آویزاں بورڈ سے پہلے نام مٹا دیئے جاتے ہیں۔ ان حالات میں' وہاں جاکر دوسروں کے لئے وبال جان کیوں بنوں؟

وہ لوگ جو پاکستان پر جبری سیاسی قبضہ جمانے والوں کے خلاف' اپنی کمزور آواز اٹھانے کے قابل نہ تھے اور وہ جنہیں دو وقت کی روٹی کمانے سے فرصت نہ تھی ــــ اور وہ بھی جو اپنے راستے میں پڑی رکاوٹیں دیکھ کر گھروں کو واپس جاچکے تھے ــــ ان سب سے کہا کہ کیا اپنی بے سرو سامانی کے ساتھ' دو سو ساٹھ جابر خاندانوں سے لڑ سکتا ہوں؟ کیا معاشرے میں ہر طرف ان کی پھیلائی عداوتوں اور نفرتوں کا مقابلہ کرسکتا ہوں؟ وہ بھی اس صورت میں' جب ہر طرف کرپشن اور استحصال کا دور دورہ ہو۔

سیاستدان ہروقت اپنے مشاغل میں الجھے رہنے کے باعث' زندگی کے باقی معاملات سے غفلت برتنے لگے ہیں۔ یہ لوگ اقتدار کے لئے لڑ مرسکتے ہیں ــــ اس مار دھاڑ میں' اپنے آپ کو شہید اور دوسروں کو غدار قرار دینے میں انہیں کوئی باک نہیں ــــ لیکن میری

جدوجہد' مختلف نوعیت کی ہے۔ لوگ میری ناچیز کوششوں کو کچھ بھی کہیں' کم از کم میرا تعلق ناداروں' اپاہجوں اور دنیا بھر کے دکھی انسانوں سے تو ہے۔ لوگوں کی فلاح کے لئے ایمبولینس چلانے کی بجائے' میں بھی اسلحہ خرید کر ہر پچیس کلومیٹر بعد ایک سیاسی سیل بنا سکتا تھا۔ سارے پاکستان سے یونیورسٹی طلباء آتے جنہیں ورکروں کے روپ میں ظاہر کرتا ــــ لیکن آج تک پھوٹی کوڑی بھی اس طرح ضائع نہ کی' نہ تنظیم کے کسی کارکن کو عملی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت دی ــــ بلکہ اس کا متبادل' اجتماعی بہبود کی شکل میں پیش کر دیا جو نقصان برداشت کرنے کے ساتھ اپنی جیت بھی برقرار رکھ سکتا ہے۔

جلاوطنی' الزامات اور ہمارے گھر یا دفاتر میں دھماکہ خیز مواد رکھنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی قطب اور فیصل کو ملک سے دور رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ وقت آئے گا تو وہ بھی آکر فاؤنڈیشن کی خدمت کریں گے۔ فی الحال ان کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ دونوں کو کہہ دیا تھا کہ ــــ "اگر امریکہ آپ کے لئے تنگ کر دیا جاتا ہے تو دوسرے ملکوں میں چلے جائیں۔ مزدوریاں کریں' ماچسیں اور اخبارات فروخت کریں لیکن کبھی اس ملک کو دھوکا نہ دینا جس نے تمہیں سر آنکھوں پر بٹھایا ہو"۔

نیویارک میں چندہ جمع کرنے کی ایک تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ــــ "اگر تمہارے پڑوسی یا رشتہ دار' غریب اور محتاج ہوں تو خدا کا یہی حکم ہے کہ حج کرنے سے پہلے' ان کے دکھ دور کرو ــــ خلق خدا سے پیار' خدا سے پیار ہے۔ آپ لوگوں نے ایک مسجد کی تعمیر کے لئے پچاس لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے جبکہ ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر پہلے ہی ایک مسجد موجود ہے۔ انسان دوستی اور حقوق العباد کی ادائیگی' خدا پر ایمان کو زیادہ مضبوط کرتی ہیں۔ میں وہی باتیں دوہرا رہا ہوں جن کی تبلیغ' صوفیائے کرام کرچکے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا تعلق' معاشرتی زندگی کے دکھوں سے تھا۔ صوفی ازام کے طفیل ہی برصغیر میں اسلام پھیلا۔ ان کا نظریہ تھا کہ خدا کے نزدیک ہندو' سکھ' مسلمان اور عیسائی' کم از کم حقوق و فرائض کے حوالے سے سب برابر ہیں۔ قوت برداشت' اسلام کا ایک مہذب تصور ہے"۔

1994ء میں پاکستان سول ایوی ایشن حکام نے بیرون ملک کی ایوی ایشنوں کو کراچی ایئرپورٹ پر' جمبوجیٹ کی ہنگامی لینڈنگ کا مظاہرہ دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ ایدھی ایمبولینس

گاڑیاں بھی اس موقع پر منتظر و تیار کھڑی تھیں۔ مشق کے آغاز میں' آدھ گھنٹے کے اندر ہی ڈرگ روڈ' ملیر' لانڈھی اور سہراب گوٹھ سے پینتالیس ایمبولینس گاڑیاں' مصنوعی زخمیوں کو جناح ہسپتال پہنچا کر واپس اپنے مراکز پہنچ گئیں۔ ایوی ایشن کا مظاہرہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ فاؤنڈیشن کی کارکردگی سے متاثر ایک غیر ملکی کے پوچھنے پر اسے بتایا کہ ــــ ہمارے کام کی بنیاد یہ ہے کہ الجھے ہوئے کام کو آسان تر بنا دیا جائے۔ اگر نیک نیتی اور سچائی پیش نظر رہے تو نتائج ہمیشہ خوشگوار نکلتے ہیں۔

جاپان میں ایک پاگل شخص نے جاپانی امیگریشن حکام کو 'گذشتہ ایک سال سے تنگ کر رکھا تھا۔ وہ صرف اپنا نام بتاتا اور یہ کہ وہ اٹک کا رہنے والا ہے۔ وہاں کسی کو معلوم نہ تھا کہ اٹک کہاں واقع ہے۔ آخر جب انہیں پتہ چلا کہ اٹک' پاکستان میں ہے تو انہوں نے پاکستان کے قونصل خانے سے رجوع کیا۔ ان کے لئے بھی ایک بڑے ضلع میں' ایک شخص کا گاؤں اور گھر تلاش کرنا مشکل تھا۔ دو ماہ بعد جاپان میں قائم ایدھی سینٹر سے رابطہ کیا گیا۔ جو بھی معلومات حاصل تھیں' بذریعہ فیکس' پاکستان روانہ کی گئیں جنہیں ہم نے اسلام آباد اور اٹک مراکز بھیج دیا۔ لاؤڈ سپیکر پر مطلوبہ شخص کے بارے میں اعلانات نشر ہونے پر ایک آدی اٹک سینٹر میں آیا اور اس ذہنی مریض کے والد کا پتہ بتایا جو ایک قریبی گاؤں میں دکاندار تھا۔ یہ اطلاع جاپان فیکس کر دی گئی اور یوں ایدھی فاؤنڈیشن کے تعاون سے جاپانی حکام کو درپیش مسئلہ حل ہوگیا۔

نیویارک میں' پنجاب کا رہنے والا ایک پاکستانی' ٹریفک حادثے میں زخمی ہونے کے بعد تین سال سے ہسپتال میں پڑا تھا۔ اس کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہ تھا۔ امریکی حکام نے ایدھی انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے نیویارک دفتر سے رابطہ کیا۔ وہاں سے اطلاع موصول ہونے کے بعد تین دن کے اندر ہی معلوم کر لیا گیا کہ وہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔

نیوجرسی میں ایک شخص قتل ہوگیا۔ اس کے بھائی نے یہ معاملہ فاؤنڈیشن کے سپرد کیا تو امریکی حکام سے رابطہ کرکے مقتول کی لاش' مردہ خانے سے نکلوا کر پاکستان بھجوا دی گئی۔ بیرون ملک پاکستانی' بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ہی ملتے لیکن امریکہ' برطانیہ' کینیڈا' جاپان اور دیگر ممالک کے پولیس حکام کے ساتھ ہمارے باقاعدہ رابطوں کے باعث تلاش و جستجو کے کام آسان ہونے لگے۔ اس قسم کے متعدد واقعات رونما ہوئے تو امریکی حکام نے نیویارک

ایدھی سینٹر سے میرے اور تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یوں اپنی خدمات کے وسیلے سے' فاؤنڈیشن متعارف ہوتی چلی گئی۔

کبریٰ' کلفٹن سینٹر میں بچوں کے ساتھ مکمل طور پر مصروف عمل ہوچکی تھی۔ اب اسے بننے سنورنے سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ اکثر اپنے سر پر گرہ باندھ کر دوپٹہ اوڑھنے لگی تھی اور عام طور پر خاموش ہی رہتی تھی۔ الماس نے ایک روز مجھے بتایا کہ ــــ "کبریٰ کو شدید غم کی کیفیت میں اس دن دیکھا' جب وہ بلال کی تصویریں بڑی کرا کے ان سے اپنا کمرہ سجا رہی تھی"۔ شادی کے بارے میں بھی اس نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ بلقیس اور میں' کبریٰ کے لئے ہر وقت دعائیں کرتے رہتے تھے لیکن اس کی جذباتی کیفیت میں کبھی مداخلت نہیں کی۔

اس دوران ایک اور سانحہ رونما ہوا۔ بلقیس' زینت سے ملنے جا رہی تھی۔ الماس اپنا ڈیڑھ سالہ بچہ علی ان کے پاس چھوڑ کر' جاوید کے عزیزوں کو پوچھنے ہسپتال چلی گئی۔ بلقیس اور زینت پہلے تو علی کو کھلاتی رہیں' پھر اپنی باتوں میں مشغول ہوگئیں۔ اسی اثناء میں علی رینگتا ہوا غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ زینت کا شوہر آصف گھر آیا تو غسل خانے جا کر اس نے المناک منظر دیکھا ــــ اس کی چیخ سن کر دونوں علی کی طرف دوڑ پڑیں ــــ دیکھا کہ علی' صابن کے جھاگ والے پانی کی بالٹی میں اوندھے منہ بے ہوش پڑا ہے۔

آصف نے اسے باہر نکالا تو وہ بری طرح نڈھال تھا اور اس کا چہرہ زرد ہوچکا تھا۔ تینوں مل کر اسے پمپ کرتے رہے لیکن بے سود ــــ آصف کسی ٹرانسپورٹ کے لئے باہر گیا تو بلقیس' علی کو لے کر ہسپتال کی طرف بھاگ پڑی۔ باہر ایک سکوٹر سوار نے ازراہ ہمدردی انہیں بٹھا لیا۔ اس دوران بلقیس' علی کی سانسیں بحال کرنے کے لئے اسے مسلسل جھنجھوڑتی رہی کہ وہ روئے ــــ بظاہر اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ آگے ٹریفک جام تھی۔ بلقیس نے سکوٹر سے اتر کر' گھبراہٹ کے عالم میں فٹ پاتھ پر' بولٹن مارکیٹ کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ خوف سے دوچار گرتے پڑتے وہ مسلسل بھاگتی رہی ــــ ساتھ ہی بچے کے منہ سے زندگی کی صدا سننے کے لئے وہ اسے مار بھی رہی تھی اور چیخ بھی رہی تھی کہ ــــ جاگو علی' اٹھو علی' کچھ تو بولو ــــ آخر وہ میٹھادر پہنچ گئی۔ میں نے بلقیس کی پھولتی سانسیں اور علی کی ڈوبتی نبضیں دیکھیں تو محسوس کیا کہ شاید وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ ہارن بجاتا

اور ایمبولینس کو برق رفتاری سے بھگاتا' سول ہسپتال پہنچا۔

الماس' ہسپتال میں کسی انجانے خوف سے بے قرار ہو کر اٹھی اور زینت کے گھر پہنچی۔ باہر ایک پڑوسی نے اسے علی کے حادثے کے بارے میں بتایا۔ الماس اپنے حواس کھو بیٹھی۔ رکشا لیا اور دیوانہ وار' ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں آئی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک نرس بیڈشیٹ لینے باہر نکلی تو چادر دیکھ کر الماس سمجھی کہ ۔۔۔ شاید یہ چادر علی کی میت لپیٹنے کے لئے تھی۔ وہ ایک ماں تھی۔ بیتابی سے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر' علی کو پمپ کر رہے ہیں تو بے ہوش ہو کر گر پڑی ۔۔۔۔ اتنے میں زندگی نے آواز دی اور علی رو پڑا۔

یہ ایک معجزہ تھا ۔۔۔۔ ورنہ جب میں نے نبض دیکھی تھی تو مجھے کوئی آس نہ تھی۔ حالات ذرا معمول پر آئے تو بلقیس اور زینت کو خوب ڈانٹا ۔۔۔۔ "بلقیس' عورتیں اسی لئے لاپرواہی برتتی ہیں کہ گھر پر مصائب آتے رہیں اور مرد کبھی چین سے نہ بیٹھ سکیں"۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ۔۔۔ بلال کے سوا کوئی دوسرا بچہ' مجھ سے اتنا پیار نہ لے سکا۔ بلال کی موت کے بعد' کسی دوسرے بچے کی محبت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ بعدازاں بلقیس سے کہا ۔۔۔ "وہ انسان جو گنتی کی زندگی لے کر آتے ہیں' ان میں کشش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ جلد ہی منزل کی جانب چل پڑتے ہیں پر ۔۔۔۔ ان کے قدموں کی چاپ' پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں میں مدتوں دھڑکتی رہتی ہے ۔۔۔" علی کے حادثے نے ایک بار پھر' اس موقف کی تائید کر دی تھی۔

آج میں پھر اپنی والدہ کی اسی چارپائی پر بیٹھا تھا...... بلقیس فرش کی صفائی کر رہی تھی۔ تھک کر وہ ننگے فرش پر ۔۔۔ دروازے کی دراڑ سے سانس لینے لگی۔ شاید وہاں سے تازہ ہوا آ رہی ہو گی ۔۔۔ میں نے بے ساختہ کہا ۔۔۔ "بلقیس' ہم نے اپنے لئے "دو گز زمین" کا انتخاب کر لیا ہے۔ بلقیس کہنے لگی ۔۔۔ "آپ تو میرے اگلے جہان کے سفر کی تیاری اور انتظار کئے بیٹھے ہیں ۔۔۔ آپ موت کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتے"۔ میں نے کہا ۔۔۔ "موت کے برحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔۔۔ لیکن تمہارے بغیر زندگی کسی طرح قابل قبول نہیں ۔۔۔۔ یہی تمنا ہے کہ مریں تو ایک ساتھ اور ۔۔۔۔ دفن ہوں تو ساتھ ساتھ"۔

کراچی سے ستر کلومیٹر دور' شاہراہ اعظم پر واقع "ایدھی ولیج" کی دیوار کے سامنے بورڈ

پر تحریر کرانے کا سوچا کہ ۔۔۔ یہ مقام' ہماری آخری آرام گاہ ہو گا۔ بلقیس نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ ۔۔۔ چپ چاپ کسی ویران جگہ دفن ہو جائیں ۔۔۔ کسی شاہراہ پر' جہاں تیز رفتاری کے باعث حادثات روزانہ کا معمول ہیں ۔۔۔ شاید سڑک کے کنارے ہماری قبریں دیکھ کر ڈرائیور ہمارا پیغام یاد کر لیں اور اپنی گاڑیوں کی رفتار آہستہ رکھیں ۔۔۔ کاش' ہماری سرِراہ قبریں' کچھ انسانی جانیں بچانے کا وسیلہ بن جائیں!

اختتام



دبئی میں ایدھی صاحب "شیخ حمدان بن راشد" ایوارڈ وصول کر رہے ہیں

"سڑک پر رونمائی"



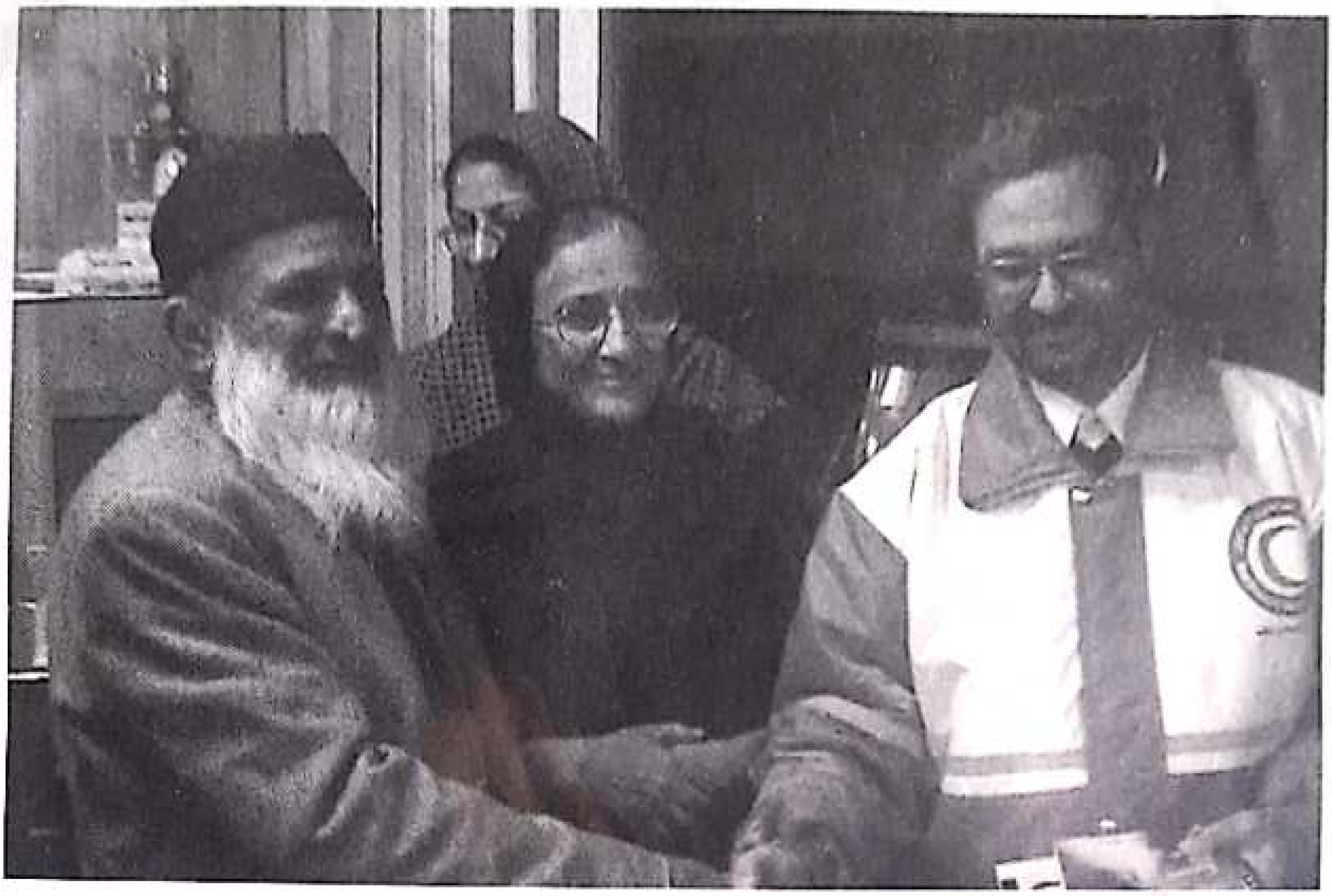
روایتی ڈگر سے دور، سوانح حیات پر مبنی انگریزی کتاب کی تعارفی تقریب کا سڑک پر انعقاد، ڈاکٹر ارشد قاضی اور تہمینہ درانی نمایاں ہیں



اسلام آباد میں بلقیس ایدھی صاحبہ وزیراعظم شوکت عزیز سے "مادرِ ملت کا ایوارڈ" وصول کررہی ہیں



عبدالستار ایدھی صاحب پریزیڈنٹ بش کو اسلام آباد آمد پر اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے



عبدالستار ایدھی صاحب ایران کے شہر بام میں زلزلہ زدگان کی امداد کے لئے "ایک لاکھ پونڈ کا امدادی چیک" پیش کر رہے ہیں



صدر جنرل پرویز مشرف فیصل ایدھی کو اسلام آباد میں زلزلہ والے علاقوں میں خدمات انجام دینے پر ان کو "ستارہ ایثار" کا ایوارڈ دیتے ہوئے



ایدھی کی امدادی ٹیم سیلاب سے متاثرہ افراد کو محفوظ مقام تک پہنچاتے ہوئے

ایمبولینس

مریضوں اور تمام شکایات کیلئے
پورے پاکستان بھر میں

⇐ ایدھی ایمرجنسی نمبر **115**

⇐ تمام شکایات کیلئے **021-2424148**
2201261 - 62

